

مصحف علی

نسیم چاری

مُعَظَّم عَلٰی

نسیم حجازی



فرحین پبلشنگ کمپنی F3 کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

## پہلا باب

معظم علی مُرشد آباد کے قید خانے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ماہی کی داستان اُن اُمیدوں، آرزوؤں، حوصلوں اور دلولوں کی داستان تھی جو پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔ زندگی کے دامن میں اب اُس کے لیے ہمیشہ تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پہلے بھی مُرشد آباد سے کوسوں دور ایک قید خانے میں رہ چکا تھا۔ لیکن وہاں اپنی تاریک کوٹھری میں وہ اس مُرشد آباد کا تصور کر سکتا تھا جس کا ہر گوشہ قوس قزح کی انگلیوں سے بریز رہا تھا۔ حال کی تمنیاں اُسے مستقبل کی مسرتوں کا پیغام دے سکتی تھیں۔ اسیری کی رات کے تاریک پرفے اٹھا کر صبح آزادی کے آفتاب کی سنہری کرنیں دیکھ سکتا تھا۔ اڑلیہ کی سرحد کے پار وہ قید خانہ اہل کے راستے کی ایک منزل تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی دن وہ اس منزل سے گزر کر وہ پھر اس دنیا میں پہنچ جائے گا، جہاں زندگی کی مسکراہٹیں اس کے استقبال کے لیے موجود ہیں لیکن مُرشد آباد میں اس کی اسیری کا زمانہ ان ساتروں کی جھلماہٹ سے محروم تھا جو تاریک رات کے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں۔

کوٹھری کی دیوار میں چھت کے قریب ایک تھوڑا سا روزن تھا اور قید کے ابتدائی ایام میں اس روزن سے سورج کی شعاعیں اسے دنیا کا پیغام دیا کرتی تھیں جہاں ابھی تک اُمید کا ایک چراغ نہیں رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنے ماحول کی بھیانک تاریکیوں سے نکل کر اس مکان

مظلم علی اس قوم کا فرد تھا جو صدیوں تک اس ملک میں اپنی سطوت و اقبال کے چمک رہے تھے۔ بعد زوال کے آخری مہل میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب مغلوں کی عظیم الشان سلطنت لامرکزیت اور انتشار کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان کا وہ دفاعی حصار پیوند زمین جو کچا تھا جسے تیمور کے جانشینوں نے تعمیر کیا تھا۔ دلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے حلیہ قسمت اکباد کے لشکر موجود تھے۔ ملک کی سیاست ہر ضابطہ اخلاق سے آزاد تھی۔ نام نہاد بادشاہ اپنے دزدوں، اہلکادوں اور بعض اوقات خواہ مرادوں کے ہاتھ میں شطرنج کے مڑے تھے۔ طالع اکباد کی تلواریں کبھی تاج پہننے والوں کے سر پر کرتی تھیں اور کبھی تاج پہننے والوں کے خون میں نہاتی تھیں۔ اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لیے ایک قسمت آزمائی لاش دوسرے قسمت آزمائے کے لیے زینے کا کام دیتی تھی، عید لکھنی، میاوی، فریب، سازش اور قتل لال قلعے کی دیواروں میں جہنم لینے والی داستانوں کے مستقل عنوان بن چکے تھے۔ لال قلعہ سے باہر ہر صوبیدار اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فخر میں تھا۔

مرکز اور صوبوں میں علاقائی سیاست کا یہ دور المناک بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ بادشاہ سلطنت کبھی کسی امیر کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور کبھی اس کی خوشامد سے خوش ہو کر اسے کسی علاقے کی صوبیداری کی سند عطا فرماتے۔ وہ صوبائی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوتا تو اسے رستے میں یہ خبر ملتی کہ شہنشاہ والا تیار نے اپنا پہلا حکم نامہ منسوخ فرما کر کسی اور کو صوبیداری کی سند عطا کر دی ہے اور وہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت صوبائی دارالحکومت کا رخ کر رہا ہے۔

پھر صوبے کے امراء کا ایک گروہ پہلے امیر دار کے ساتھ اور ایک دوسرا گروہ دوسرے امیر دار کے ساتھ مل جاتا۔ دونوں میں جگمگ ہوتی۔ اپنے والا امیر دار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور اس کا خون جھپٹنے والے کی سند پر قمر تصدیق ثبت کر دیتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ صوبیدار کا ایک امیر دار شاہی فرمان کے عوض ایک معقول رقم پیش کرنا اور دوسرا امیر دار اس سے لینا وہ

کی چار دیواری میں جا پہنچتا جو اس کی موجودہ امیدوں کی آخری جلتے پناہ تھا۔ وہ ان کردوں کا طواف کرتا جہاں کبھی مسرت کے قہقہے گونجتے تھے۔ اچانک فرحت مکان کے کسی گوشے سے نودار ہوتی اور وہ کہتا "فرحت! فرحت! میں آگیا ہوں۔ میں زلفہ ہوں، میں تھارے لیے زلفہ رہنا چاہتا تھا۔ قید خانے کی تنہائیوں میں تم ہر وقت میرے ساتھ تھیں۔ میرے پسے اور آرزوئی سب تھارے لیے تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں جا چکی ہو اور میں تمام مہر تھیں تلاش کرتا رہوں گا۔ کاش اقدار خانے میں مجھے تھارا کوئی پیغام مل سکتا۔" فرحت! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم مرشد آباد سے کہیں دور نکل جائیں گے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔ تھارے ساتھ رہ کر میں کبھی یہ محسوس نہیں کروں گا کہ میں کاروان حیات کا ایک لٹا ہوا مسافر ہوں۔" پھر اس کی کوٹھڑی میں اور قیدی آئے اور انھوں نے بنایا کہ فرحت اور اس کے والدین تھاری گرفتاری کے اگلے دن مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے۔

اس کے بعد مظلم علی کو مستقبل کے متعلق موجودہ امیدیں مایوسیوں سے زیادہ کرب انگیز محسوس ہوتی تھیں۔ وہ فرحت کو ان دیکھے صعدوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کسی دور افتادہ بستی کی جھوپڑی میں دیکھتا اور کبھی وہ اسے کسی پربل شہر کے محل میں نظر آتی تھی۔ پھر اس شباب ناقب کی طرح جو ایک ثانیہ کے لیے تاریک فضا میں ڈر کے خزلے کبھیرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے۔ فرحت کی دلکش تصویریں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور وہ حال اور مستقبل کے بمیانک خلا سے نکل کر ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ کبھی تصور اسے اس مکان میں لے جاتا جہاں اس نے زندگی کی ابتدائی مسکرائیں دیکھی تھیں۔ کبھی وہ اس محلے کی گلیوں میں گھومتا جہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ سن شعور سے لے کر قید خانے میں پہنچنے تک کی زندگی اسے ایک خواب معلوم ہوتی تھی۔ ایک ایسا خواب جو دلکش بھی تھا اور بھیانک بھی :-



رقم دے کر اپنے لیے ایک اور فرمان حاصل کر لیتا۔

۱۷۱۵ء میں سلطنتِ دہلی کے ایک ہوشیار وزیر نظام الملک آصف جاہ نے اپنی شاہی چالوں کی بدولت دکن میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ وہ بظاہر دلی کے نام نہاد بادشاہ کا صوبیدار تھا لیکن علاؤ دکن کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ ۱۷۱۷ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول کے اسلاف، سلطنتِ خوارزم پر تاتاریوں کے حملوں کے زمانہ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اسی طرح ایک اور خاندان ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اسی خاندان کا ایک فرد محمد جان جہاں اللہ الدین حکومت کا ادنیٰ ملازم تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی موت کے بعد جب ہر قسمتِ آدما کے لیے ترقی کے راستے کھلے تھے۔ یہی جان جہاں، خان جہاں بن گیا اور کرناٹک کی نظامت پر فائز ہوا۔ ۱۷۱۹ء میں اللہ الدین خان جہاں نے وفات پائی اور کرناٹک کی حکومت اُس کے بیٹے محمد علی والا جاہ کے ہاتھ میں آئی۔

یہ زمانہ تھا جب بنگال اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر فرنگی تاجروں کی بستیوں کو گھاٹوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انگریز اور فرانسیسی تاجر اپنے پرگالی اور دلنیزی طریقوں کو مات دے چکے تھے اور اب وہ ہندوستان کی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کا بجائے اس ملک کے سیاسی انتشار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے اندرونی فتنہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کسی صوبہ میں حکومت کے دعوے واردوں کے درمیان جگہ چھڑ جاتی تو ایک فرنگی انگریزوں کی حمایت حاصل کرتا اور دوسرا فرنگی اپنا مستقبل فرانسیسیوں کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

دکن میں نظام الملک آصف جاہ اول کے جانشین کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں پھنسے رہے۔ کرناٹک میں محمد علی والا جاہ انگریزوں کی بساط سیاست کا ایک مرہ تھا

اور فرانسیسی کرناٹک کی حکومت کے ایک اور دعوے دار چندا صاحب کے طرفدار بن گئے تھے۔ چندا صاحب نے کرناٹک کے بیشتر حقوق پر قبضہ کر کے محمد علی کو ترجیحی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چند سال تک محمد علی ایک ایسا حکمران تھا جس کے قبضے میں کوئی ملک نہ تھا اور جس کی رعایا زیادہ تر اپنے خاندان کے افراد، چند نوکروں، جی حنفیوں اور غوثانیوں تک محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ عزیزوں کی سنگینوں کے پہرے میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور اسے نواب والا جاہ، امیر المند، عمدة الملک، آصف الدولہ محمد علی خاں، بہادر غفر جگ، سپہ سالار، صاحب السیف، واقف، مدبر امرائے عالم، فرزند عزیزِ ارباب کے انقاب و خطابات سے پکارا جاتا تھا۔ جب انگریز، فرانسیسیوں سے کرناٹک کا کوئی علاقہ فتح کرنے تو یہ سپہ سالار اپنی حرم سرا میں جشن مناتا اور جب انھیں اپنی افواج کو تھکا دینے کے لیے روکے کی ضرورت ہوتی تو اس مدبر امراء عالم کو مفقود الحال عوام سے ٹیکس وصول کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا۔

پہلے چندا صاحب نے فرانسیسیوں کی خدمات کے صلے میں کرناٹک کے بعض علاقے ان کے حوالے کر دیے۔ پھر جب محمد علی کی باری آئی تو اس نے انگریزوں کو کرناٹک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ بظاہر کرناٹک محمد علی کی شکار گاہ تھا لیکن شکار کھیلنے والے انگریز تھے۔

دلی کے تخت کے ساتھ زبانِ اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا۔ ۱۷۵۸ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر ملی دروی خاں نے قبضہ جمایا۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کی طرح بنگال میں بھی انگریز تاجر اپنے قدم جما چکے تھے۔ لیکن ملی دروی خاں ایک بیلر، مغز اور دروازہ کش حکمران تھا اور اس نے فرنگی تاجروں کو جو مراعات دیں ان کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنی تجارتی بستیوں میں قلعے یا دفاعی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے جو مغلیہ سلطنت کے کٹنڈوں پر اپنی سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے کی فکریں تھیں۔

زیادہ گھل جی گئے تو آصف اور افضل اصرار کر کے معظم اور اس کے بھائی کو اپنی جگہ پر بٹھالیتے۔ گھر پر حسین بیگ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معقول تنخواہ پانے والا تالیق مقرر تھا اور معظم اور یوسف کا باپ فرصت کے اوقات میں خود ہی انھیں پڑھا دیا کرتا تھا۔ امرار کے بچوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب آصف اور افضل ذرا بڑے ہوئے تو حسین بیگ نے ان کی فوجی تربیت کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ انھیں شہنشاہی، تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھایا کرتا تھا۔ لیکن محمد علی نے اس کام کے لیے کسی اور کی خدمات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مرشد آباد میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو گھوڑے کی سواری اور توار، نیزہ اور بندوق کے کھیلوں میں اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

اس کے گھر میں ایرانی قالین نہ تھے لیکن اس کے اصطل میں عربی نسل کے تین چار گھوڑے ضرور موجود رہتے تھے۔ سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے وہ اپنے ذاتی اسلحہ خانے کی بہترین تواروں اور بندوقوں پر فخر کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی مصروف زندگی سے بچوں کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتا اور انھیں گھوڑوں پر سوار کر کے شہر سے باہر کسی کھلے میدان میں لے جاتا۔



مرزا حسین بیگ کے کتب خانہ میں سینکڑوں کتابیں تھیں اور یہ کتابیں اس نے پڑھنے کا شوق پورا کرنے سے زیادہ اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔ معظم کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ کبھی کبھی افضل بیگ سے کتابیں مانگ لایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اُس کے گھر گیا اور افضل اور آصف دیوان خانے کے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنے عمر رسیدہ آتالیق سے سبق لے رہے تھے۔ ان کی وجہ کتابوں کی طرف تھی۔ معظم علی کچھ دیر تذبذب کی حالت میں چند قدم دور کھڑا۔ اچانک آتالیق نے اس کی طرف دیکھا اور کہا: ”بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ کھیلنے کا وقت نہیں یہ پڑھ رہے ہیں۔ بھاگ جاؤ!“

معظم علی نے اس وقت اُنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لیڈوں کے لیے ایک وسیع لشکار گاہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ محمود علی، علی دہدی خان کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد کے شہر سے باہر ایک نئے محلے میں محمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیدار مرزا حسین بیگ کا قلعہ نمائش تھا۔ جس کی چار دیواری کے اندر رہائشی مکان کے علاوہ گھوڑوں کے اصطل اور دو کون اور پہرے داروں کے کمرے تھے۔ معظم علی کا باپ ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود مرزا حسین بیگ کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابتداء میں ان کے تعلقات محض رسمی تھے لیکن ان کے بیٹوں کی دوستی آہستہ آہستہ انھیں بھی ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ حسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ، معظم علی سے دو سال بڑا تھا۔ اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا، معظم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا بہن بھائی۔ بچپن میں یوسف اور معظم علی کے دوسرے بچوں کی طرح حویلی میں پلے جلتے اور دن بھر آصف بیگ اور افضل کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

حویلی میں ایک سنہری بالوں والی کم سن لڑکی بھی اپنی سسیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، اور معظم علی کو اس کے معصوم قہقہے بہت پسند تھے۔ یہ لڑکی افضل کی چھوٹی بہن تھی اور اس کا نام فرحت تھا۔

محمد علی اور اس کی بیوی کو حسین بیگ کے خاندان کے مقابلے میں اپنی کمتری کا احساس قلعہ تاہم انھیں یہ گوارہ تھا کہ ان کے بچے کسی کے مقابلے میں حقیر سمجھے جائیں۔ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ گوشش ہوتی کہ ان کے بچوں کا لباس اگر حسین بیگ کے بچوں کی طرح قیمتی نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا ضرور ہو۔ پھر جب آصف اور افضل مرشد آباد کے بہترین مکتب میں داخل ہوئے تو محمد علی نے یوسف اور معظم کو بھی اسی مکتب میں داخل کر دیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ افضل اور آصف بھی پر سوار ہو کر جلتے تھے اور یوسف اور معظم کو پیدل جانا پڑتا تھا۔ پھر جب یہ بچے آٹھ برس بہت

یہ بات معظم علی کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ چند ثانیے کے لیے فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔  
افضل بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے آتاقین سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ کتابیں لینے آیا ہے  
مجھے اجازت دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

آتاقین جس قدر کیلنے والے لڑکوں کو ناپسند کرتا تھا اسی قدر اسے پڑھنے والوں سے دلچسپی  
تھی۔ اُس نے دوبارہ معظم علی کی طرف دیکھا اور افضل سے کہا: "اچھا جاؤ لیکن جلدی آنا!"  
افضل بیگ اٹھ کر معظم علی کے ساتھ چل دیا۔ دیوان خانے کے چند کمرلوں کے طویل  
برآمدے سے گزرنے کے بعد وہ کونے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کا ایک  
دروازہ رہائشی مکان کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں ساگوان کی خوبصورت الماریاں  
کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ افضل بیگ نے کہا: "تم اطمینان سے اپنے لیے کتابیں نکالو  
میں استاد کے پاس جاتا ہوں۔"

افضل بیگ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ معظم علی اس کمرے میں کئی بار پہلے بھی آچکا  
تھا۔ اسے اپنے مطلب کی کتابیں نکالنے میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دو  
عربی اور تین فارسی کی کتابیں لے کر باہر چل دیا۔ واپسی پر وہ افضل اور آصف کے قریب سے  
گزرا تو آتاقین نے اسے دیکھتے ہی آواز دی: "میاں صاحب زادے ذرا ادھر آؤ!" معظم جھکتا ہوا  
عمر سیرہ آتاقین کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آتاقین نے کہا: "دکھاؤ کون سی کتابیں پڑھتے ہو تم؟"  
معلم نے کتابیں آگے بڑھادیں۔ آتاقین نے یکے بعد دیگرے تمام کتابیں کھول کر دیکھیں اور  
قدر سے حیران ہو کر کہا: "تم یہ کتابیں پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم انہیں سمجھ بھی سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا تم تمہارا امتحان لیتے ہیں۔ یہ کہہ کر آتاقین نے عربی کی ایک کتاب اٹھا کر کھولی اور

معلم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اچھا یہ پڑھ کر سناؤ!"

معلم نے اطمینان سے چند سطریں پڑھ کر سنا دیں تو آتاقین نے ترجمہ کرنے کے لیے کہا: "معلم  
نے کسی جھجک کے بغیر ترجمہ سنا دیا تو آتاقین نے سوال کیا: "تم مکمل تعلیم پاتے ہو؟"  
"جی میں افضل کے ساتھ پڑھتا ہوں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"جی اسی محلہ میں اس مکان کے بالکل سامنے۔"

"تم.... تم محمود علی خان کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔"

آتاقین کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی: "یہ کون ہے؟"

"آتاقین نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔"

"آپ تشریف رکھیے؟ مرزا حسین بیگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا: "اور یہ شاہزادہ محمد علی کا  
لڑکا ہے۔"

"جی ہاں میں ابھی اس سے متعارف ہوا ہوں بہت ہنسنا رہا ہے۔ دیکھیے یہ آپ

کے کتب خانہ سے صبح فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہ کتابیں اس عمر کے بچوں کے لیے بہت مشکل ہیں۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں صاحبزادوں کے ساتھ اسے بھی پڑھا دیا کروں؟"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے عزیز لڑکے محنتی ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آصف لڑکے

افضل کے لیے ایسے لڑکے کی رفاقت اچھی رہے گی۔ یہ کہہ کر حسین بیگ معظم علی کی طرف متوجہ

ہوا: "برخوردار تم محنت سے چھٹی کے بعد میاں آجایا کرد۔ میں محمود علی سے بھی کہہ دوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔" معظم علی نے تشکر کے ساتھ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"آصف نے کہا: "ابا جان معظم کا بڑا بھائی یوسف علی میرا ہم جماعت ہے اگر آپ کی اجازت

ہو تو وہ بھی میاں آجایا کرے؟"

میں گھوڑا بھاگتے اور نشانہ بازی کرتے دیکھا ہے۔

تھوڑی دیر بعد نوکروں اور پرہیزگاروں کی کونٹھوں کے قریب چم کر کے باہر کی فضا کے قریب ایک درخت کے نیچے چند سپاہی جمع تھے۔ ایک ایک میز پر چار پستول رکھے ہوئے تھے۔ سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ کے ساتھ ایک تختی تک رہی تھی جس کے درمیان پان کی شکل کا ایک سرخ نشان بنا ہوا تھا۔ سپاہی حسین بیگ کو دیکھ کر ادب سے ادھر ادھر مٹ گئے اور شیر علی کے اشارے پر آصف نے پستول چلا دیا۔ نشانہ سرخ نشان کے پچھلے کنارے پر لگا اس کے بعد افضل کو باری آئی اور اس کی گولی سرخ نشان سے کوئی دو انچ باہر لگی۔ تاہم اس کی عمر کے لحاظ سے یہ بھی ایک کارنامہ تھا اور پورھا استاد مرزا حسین بیگ کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا اب دوبارہ کوشش کرو! اس نے کہا۔

بچوں نے خالی پستول میز پر رکھ دیئے اور ہرے ہوئے پستول اٹھالیے۔ افضل کی دھڑکیاں تھوڑے بہتر تھیں لیکن آصف کا ہاتھ بل گیا اور اس کی گولی تختی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ دو سپاہی میز کے قریب کھڑے پستول بھرنے میں مصروف تھے۔ آصف نے اپنی کھسیا ہٹ چیلنے کے لیے جلدی سے خالی پستول میز پر رکھا اور پھر ہوا پستول اٹھا لیا اب اس کی گولی نشانہ پر لگی۔ افضل کی باری آئی تو وہ بھرا ہوا پستول اٹھا کر خود نشانہ لگانے کی بجائے مغفم علی کی طرف بڑھا اور بولا: اب تمہاری باری ہے۔

مغفم نے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی کتابیں ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیں اور افضل کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

حسین بیگ نے کہا: میاں صاحبزادے دیکھنا کسی آدمی کو زخمی نہ کر دینا!

افضل نے کہا: جی آپ فکر نہ کریں اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔

مغفم آگے بڑھا۔ اس نے نشان کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور

حسین بیگ نے جواب دیا: اگر تمہارے استاد کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔

اتاق نے کہا: جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

اندرونی چار دیواری کے پھاٹک سے ایک نوکر نمودار ہوا اور اس نے حسین بیگ کو سلام کرنے کے بعد اتاق کی طرف متوجہ ہو کر کہا: جناب شیر علی خاں صاحب پوچھتے ہیں کہ صاحبزادہ کب فارغ ہوں گے؟

اتاق نے جواب دیا: بس میں آج کا کام ختم کر چکا ہوں یہ جا سکتے ہیں۔

آصف اور افضل اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

افضل نے کہا: مغفم آؤ تم بھی، ہم آج کل پستول چلانے کی مشق کر رہے ہیں۔ مغفم علی

بھاگتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

حسین بیگ نے اتاق سے کہا: چلیے آج آپ بھی اپنے شاگردوں کا نشانہ دیکھیے۔



اتاق کا نام بابا القدوس تھا اور اس کا شمار مرشد آباد کے چند چہرہ علمائے ہوتا تھا وہ حسین بیگ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا علی کی اندرونی چار دیواری سے نکل کر بیرونی احاطے میں داخل ہوا تو وہاں پھاٹک سے چند قدم دور دیوار کے ساتھ ایک بلکہ سے میں بچوں کا فوجی استاد دکھائی دیا۔ وہ ابیں دیکھتے ہی آگے بڑھا حسین بیگ نے کہا: ہم آپ کے شاگردوں کا نشانہ دیکھنے آئے ہیں۔ شیر علی نے کہا: یہ میری خوش قسمتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرے شاگرد آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ چلیے!

حسین بیگ نے کہا: شیر علی! یہ معمولی کا بیٹا ہے۔ مولوی صاحب نے آج زبردستی اسے

اپنا شاگرد بنا لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کا امتحان لیں۔

شیر علی نے جواب دیا: جناب اس کا امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے باہر لیں

آگھ جیسے کی دیر میں بلبلی ببادی۔ دیکھنے والے سرخ نشان کے مین وسط میں ایک سوراخ دیکھ رہے تھے۔

مستم علی نے خالی پستول میز پر رکھ دیا اور سپاہی کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حسین بیگ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر پتھکی دیتے ہوئے کہا: شاباش! تھارا نشان بہت اچھا ہے۔

جی میرے بھائی کا نشان مجھ سے بہتر ہے۔

حسین بیگ نے میز سے ایک پستول اٹھایا اور مستم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ کر تم انعام کے حقدار ہو۔ یہ لوادر دیکھو۔ جب تم بڑے ہو کر جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر آؤ گے تو میں تمہیں اپنے اسلحہ خانے کی بہترین بندوق اور اپنے اہلکے کے بہترین گھوڑے کا تحفہ رکھوں گا۔



اس واقعہ کے تین دن بعد حسین بیگ کے اہل مرشد کیاؤ کے چند اہل مرشد کی دعوت تھی اور محمود علی کو پہلی بار اس کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا ایک ہفتہ بعد حسین بیگ کی بہی نے شہر کی چند معزز خواتین کو دعوت دی اور اس نے مستم علی کی ماں آئمز کو بھی مدعو کیا۔ حسین بیگ کی بیوی بظاہر آئمز کے ساتھ تھپک سے پیش آئی لیکن اپنے جیسے جیسے کی اکثر خواتین نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند کیا اور اپنی میزبان کے ظاہری خلوص کے باوجود آئمز بے بات محسوس کیے بغیر نہ مکی کرکسں بچوں کی دوستی اور ان کے دعوتیں اور ملاقاتیں اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتیں جو ان کے درمیان حائل ہے۔ فرحت کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ اہل مرشد کی چند لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھیں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں اس کی شکل و صورت اور اس کے لباس سے متاثر تھیں اور وہ کسی کو "خالہ جان سلام" اور کسی کو "چچی جان سلام" کہہ کر باری باری سب سے دعائیں لے رہی تھی۔ آئمز کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اس کی

طرف بار بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی لیکن فرحت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ایک براس کو ماں نے کھد فرحت! جی تم نے اپنی خالہ کو سلام نہیں کیا اور فرحت نے بے توجہی سے آئمز کی طرف دیکھا اور مستم علی موسم کہہ کر ایک خوش پوش لڑکی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔ آہم آئمز کے دل سے اس کے لیے ہزاروں دعائیں نکل رہی تھیں لیکن کاش یہ شوخ آدمین وہی جسے آئمز نے اپنی نظریں ہی اپنی بیٹی بھولتا تھا اس کی دعائیں سن سکتی۔ کاش وہ ادبچے جیسے کی دوسری خواتین کی طرح اسے اپنے پاس بٹھا سکتی اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی۔ اس کے سنہری بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوار سکتی وہ دوسری دور سے ان شوخ آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن میں ہمالیہ کے دھن کی جھیلوں کی دکھائی اور گرانی نظر نظر آتی تھی تو وہ اس کے خصوصیت و دانت دیکھ رہی تھی جو ہنسنے وقت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ دعوت کے اختتام پر وہ اپنے دل میں یہ احساس لے کر نکلی کہ حسین بیگ کی بیوی اور اس کے درمیان محبت کی دیوار بہت ستر کھڑی ہے۔

لیکن یہ دیوار زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ یوسف اور مستم کے ساتھ افضل اور اصناف کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ پہلے جب وہ مدرسے جانے کے لیے گھمبی پر مول ہو کر گھر سے نکلتے تھے تو مستم اور یوسف ڈیوڑھی کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ اب اگر انہیں کسی دیر ہو جاتی تو افضل اور افضل اپنی گھمبی ان کے دوڑانے کے سامنے کھڑی کر کے انہیں بلا لیتے۔ گھر میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی باتیں ایک دوسرے کے متعلق ہوتیں۔ ہم آج فلاں جگہ میرے لیے گئے تھے۔ آج ہماری فلاں محلے کے لوگوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ ہم صرف چار تھے اور ہم نے اتنے لوگوں کو مار بھجا یا تھا۔ آج پیر کی میں ہمارا مقابلہ ہوا تھا اور فلاں سب سے آگے نکل گیا تھا۔ آج فلاں نشانہ بازی اور فلاں نیرہ بازی میں اول آیا تھا۔ حسین بیگ کے گھر میں افضل ہمیشہ مستم علی کی اور افضل ہمیشہ یوسف کی کسی نہ کسی فوجی کی تعریف کرتا۔ اسی طرح جب مستم اور یوسف سوئے سے پہلے اپنے والدین کو ان کے واقعات سناتے تو مستم کی زبان پر بار بار افضل کا نام آتا اور یوسف کی زیادہ باتیں عام طور پر افضل کے متعلق تھیں چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب آئمز دوسری باتیں بیگ کے اہل گئی تو افضل کی ماں اس کے ساتھ اتھرائی بے تکلفی سے پیش آئی۔

معظم علی اپنا زیادہ وقت عبدالقدوس کے پاس گزارا کرتا تھا۔ ایک دن محمود علی نے جا کر اس سے شکایت کی۔ دیکھیے قبلہ معظم کے مستقبل کے متعلق بہت بڑی توقعات تھیں اور میرزا خلیل تھا کہ آپ کی شاکردی سے اس کی خدا داد صلاحیتیں اور چمک اٹھیں گی۔ لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد مایوسی ہو رہی ہے۔ میرزا خلیل تھا کہ وہ ایک سپر سالار بنے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سوا اسے کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں۔ اگر میں کسی بڑی جائیداد کا مالک ہوتا تو مجھے تمام عمر اس کے گھر بیٹھنے پر اصرار نہ ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں میری جائیداد صرف تو اسے خدا کے لیے آپ اسے سمجھاتیں!

عبدالقدوس نے اطمینان سے جواب دیا: آپ کو معظم علی کے متعلق مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ ایک سلطنت کو سپاہی کی تلوار کے علاوہ عالم کے قلم کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ معظم علی کسی شہر کا قاضی یا صوبے کا حاکم بننے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ آپ اسے پڑھنے کا شوق پورا کرنے دیں، مجھے اس کی خدا داد صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق خود فیصلہ کر سکے۔ اگر آپ نے اپنا کوئی فیصلہ اس پر تھوپنے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں مضر ہوگا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے دیں۔ اگر اس نے اپنی مرضی سے سپاہی بننے کا فیصلہ کیا تو اس میلان میں بھی عزت اور شہرت کی کوئی منزل اس سے دور نہیں ہوگی۔

محمود علی نے مطمئن ہو کر کہا: قبلہ میں معظم سے مایوس نہیں ہوں، لیکن اس کے تمام ساتھی فوج میں شامل ہو چکے ہیں اور لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں:

"لوگوں کی پردانہ کیجیے، جو نوجوان اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ انھیں اپنی عمر کے ایک حصے میں لوگوں کے طعنے سننے ہی پڑتے ہیں۔"

عبدالقدوس کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد محمود علی کی پریشانی کسی حد تک دور ہو چکی تھی اور اس کے بعد اگر اس کا کوئی دوست یہ سوال کرتا کہ معظم علی فوج میں کیوں شامل نہیں ہوا؟

وہ ایک دوسری کولپٹے پہنے بیٹوں کے بچپن کے واقعات سن رہی تھیں اور خست گری دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی آئینہ معظم یا یوسف کی کسی شرارت کا ذکر کرتی تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں:



وقت گزرتا گیا۔ بچپن سے جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھے۔ ہی معظم علی کا بھائی یوسف اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یوسف ایک سال کی ملازمت کے بعد پچاس سواروں کا انفرن بن گیا۔ آصف اور فضل مبارک اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے باعث ترقی کی منازل نسبتاً زیادہ تیز رفتار سے طے کر رہے تھے۔ آصف ایک سال کی ملازمت کے بعد دو سو اور افضل ایک سو سو سواروں کا کمان دار بن چکا تھا۔ معظم علی کا باپ محمود علی اس عرصے میں ترقی کر کے محافظ فوج کے ایک ہزار سواروں کا انفرن بن چکا تھا۔ اس کے لیے یوسف کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش تھی۔ لیکن معظم علی کے مستقبل کے متعلق وہ پہلے جس قدر پُر امید تھا۔ اب اسی قدر پریشان ہو رہا تھا۔ معظم علی نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں سپاہیانہ اوصاف کی کمی تھی۔ محمود علی جانتا تھا کہ اس میں ایک سپاہی کی تمام خوبیاں موجود ہیں جرات، ہمت، عزم اور استعقل کے علاوہ وہ ایک غیر معمولی قوت فیصلہ اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کتابوں سے دلچسپی کے باوجود اسے سپاہیانہ زندگی پسند تھی وہ ہر روز علی الصبح سواری نیزہ بازی اور نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ تیر کر دیا مہرور کرنا اس کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا اور اب تک وہ تین شیر اور پانچ چیتے مار چکا تھا۔ لیکن محمود علی جب کبھی اس کے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ چھڑاتا۔ وہ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتا: "ابا جان آپ مجھے مہرور نہ کریں۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔" اور آئینہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی، وہ کہتی: آپ معظم علی کے متعلق اس قدر پریشان کیوں ہیں ابھی اس کی عمر یہ کیا ہے!



سیاہ تھا بالکل کوسے کی طرح۔ اور اس کی ایک آنکھ بھی ذرا چھوٹی تھی؟  
 "شرم کرو؟" ماں نے مجھ کو کہا اور منظم اپنے کمرہ پر ہنسنا ہوا باہر نکل گیا۔ دو سال پہلے کی ایک ایسی صورت کے دھندلے سے نقوش اس کے ذہن پر ابھر رہے تھے جو شوخ بھی تھی اور معصوم بھی۔  
 چند دن بعد ایک خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ منظم علی صبح سویرے کوئی کتاب لینے افضل کے گھر گیا۔ وہ پہلی ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد اندرونی چادر دیواری کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو آصف اور افضل فوجی لباس پہنے باہر نکل رہے تھے۔ دو نوکر صحن میں ان کے گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

منظم نے انہیں دیکھتے ہی کہا "بھائی یوسف کتے تھے کہ آج چھٹی ہے اور میں کتاب لینے آیا تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"  
 افضل نے کہا: "آج چھٹی ہے لیکن ہم چوگان کھیلنے جا رہے ہیں۔ آؤ تم کتاب لے لو۔"  
 "لیکن جلدی آنا؟" آصف نے کہا: "وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"  
 "ابھی آتا ہوں۔"

افضل منظم علی کو ساتھ لے کر کتب خانے کے سامنے پہنچا تو باہر کے برآمدے کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔  
 افضل نے کہا: "آج آبا جان باہر گئے ہوئے ہیں اور شاید نوکر نے اندر سے یہ دروازہ بند کر دیا ہے۔ آؤ اس طرف پلٹے ہیں۔"  
 وہ واپس مڑے اور دیوان خانے کے ایک دیسٹ کمرے سے گزر کر اندرونی صحن کے قریب پہنچے تو منظم کچھ سوچ کر کہہ گیا۔

افضل نے مڑ کر کہا: "آج کل گھر والے سب اوپر ہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔"  
 منظم علی افضل کے پیچھے صحن سے گزر کر کتب خانے میں داخل ہوا۔ افضل نے کہا: "اب تم اطمینان سے کتابیں تلاش کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جلتا ہوں۔"

تو وہ جواب دیتا:  
 "منظم علی ایک عالم ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم سے بنگال کی زیادہ خدمت کر سکے گا۔"

○  
 فرحت گیارہ سال کی عمر سے پردہ کیا کرتی تھی اور منظم نے اسے گزشتہ دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ منظم کی ماں کبھی کسی اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو اس نے منظم علی سے کہا: "بیٹا آج فرحت تمہارے متعلق پوچھتی تھی؟"

منظم علی کے گال اور کان حیا سے سرخ ہو گئے اور اس نے سوال کیا: "متعلق کیا پوچھتی تھی؟"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا یہ پوچھتی تھی کہ تم فرج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے؟"  
 منظم نے مسکرا کر کہا: "امی جان مجھے انوس ہے کہ اب آپ کو میری وجہ سے چھوٹی چھوٹی روکیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا اس نے مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ وہ تو اپنی طرف سے ہمدردی کر رہی تھی۔ اور اب وہ چھوٹی بڑکی نہیں۔ ماشاء اللہ اب وہ جوان معلوم ہوتی ہے اس کی ماں اس کی پیدائش کے دن سے اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مرنے والے کے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آتے ہیں۔ ایک۔ ایک کو مناظر یہ نہیں ملتا اور فرحت ہے جس کی اس قابل کہ کسی خواب کے ٹھکر جائے۔ مرزا صاحب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ کھنڈو سے مرزا صاحب کے کسی عزیز نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ اور حسین بیگ بھی خضائنہ ہو گئے تھے۔ لیکن فرحت کی ماں نہیں مانتی۔"

منظم جانتا تھا کہ اس کی ماں فرحت سے بہت پیار کرتی ہے اور فرحت کا ذکر آجائے تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس نے اپنے ہوتوں پر شرارت آمیز سنبھلاتے ہوئے کہا: "امی جان! فرحت وہی بڑکی تو نہیں جس کی ناک چھٹی اور دمک

افضل باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ معظم نے ایک الماری کھولی اور کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تین الماریوں کو دیکھنے کے بعد وہ کونے کی ایک الماری کے پاس کھڑا ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ اور معاً بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی۔ بھائی جان آپ ابھی تک ....؟

معظم علی نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیہ کے لیے متحیر سا ہو کر رہ گیا۔ ایک نو عمر لڑکی جب بے خیالی میں کمرے کے درمیان پرچ پیچتی تھی اس کی نسبت کمین زیادہ بدحواسی کے ساتھ ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہی تھی معظم علی ایک نظر سے زیادہ اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا:

معاف کیجئے میں ....؟

معظم علی اپنا فاقہ پورا نہ کر سکا۔ لڑکی فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ روشنی کی کرن کی طرح جو آئینے کو چھونے کے بعد اپنا رخ بدل لیتی ہے یا سمنڈ کی لہر کی طرح جو ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ لڑکی زحمت تھی معظم علی نے اسے دو سال کے بعد دیکھا تھا اور وہ بھی ایک لمحہ کے لیے۔ اس کے ذہن میں اس کے کوئی داغخ نقوش نہ تھے۔ تاہم اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ اگر وہ اسے تمام عمر دیکھتا رہتا تو بھی اس کی نگاہوں کی تنگی دور نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل میں ایک خوشگوار دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ دھڑکن چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی۔ معظم علی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ الماری سے ایک اور کتاب نکال کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا یہ خوشگوار تصادم اس کے نزدیک محض ایک حادثہ تھا۔ ماضی کا حادثہ جس کا اس کے حال اور مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ان کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور اگر وہ جھٹک کر تھوڑی دیر کے لیے کسی چارہاے پر ایک دوسرے سے اکٹیں تو بھی ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ نہ حق مرزا حسین بیگ

کی بیٹی تھی اور وہ اتنا شاعر نہ تھا کہ زمین پر کھڑا ہو کر ستاروں سے باتیں کرتا۔

کوئی آدھ گھنٹہ کی تلاش کے بعد معظم ایک کتاب لے کر باہر نکلا تو برآمدے کے آخری سر پر پہنچ کر اسے حسین بیگ دکھائی دیا۔ معظم نے بڑھ کر اسے سلام کیا اور حسین بیگ نے حکیم السلام کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معظم علی نے کہا: میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔

برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں حسین بیگ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: معظم بیٹھ جاؤ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

معظم علی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قد سے وقت کے بعد کہا: برغور دار تمہارے تعلق مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ کتابوں سے دلچسپی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے باقی ذرائع سے آنکھیں بند کر لو۔ ابھی شاہی محل کے باہر تمہارے باجان لے تھے۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک سپاہی بن کر اپنے خازن کا نام روشن کرو گے۔ شیر علی تمہارے تعلق کہا کرتا تھا کہ تم کسی دن سپہ سالار بنو گے۔ لیکن تم کتابوں کے شوق میں خدا داد صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ آخر تم فوج میں شامل ہونے سے کیوں ڈرتے ہو؟ جسمانی لحاظ سے تم بنگال کے ہزاروں فوجیوں کے لیے قابل رشک ہو۔ نیزہ بازی، شہسواری اور نشانہ بازی میں بہت کم نوجوان تمہارا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمہیں خدا نے ذہانت بھی دی ہے، اگر تم اپنے بھائی کی طرح دو سال قبل فوج میں شامل ہو گئے ہوتے تو اب تک شاید دو سو سوار تمہاری کمان میں ہوتے۔ لیکن اگر تمہیں ایک معمولی افسر کی حیثیت سے فوج میں شامل ہونا پسند نہیں تو میں تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ علی مددی خاں کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میرا مدد میرا دوست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے چلتا ہوں: معظم نے کچھ دیر سوچا کہ کچھ چنے کے بعد کہا: چچا جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کریں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ابتدا نہیں

کرنا چاہتا۔ جس فوج کا ادنیٰ سپاہی بننا پسند نہیں کرتا اس کا سپہ سالار تباہی پسند نہیں کروں گا۔ جس دن مجھے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ میں ایک سپاہی بن کر قوم اور وطن کی کئی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔ اس دن میرے سامنے یہ سوال نہیں ہوگا کہ میں ایک سپاہی ہوں یا سپہ سالار میرے سامنے صرف یہ سوال ہوگا کہ میں نے جس مقصد کے لیے تواراٹھانے ہے وہ کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔ اپنے ضمیر کا اطمینان میرے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا۔

حسین بیگ نے کہا۔ اور وہ دن کب آئے گا جب تم قوم اور وطن کے لیے تواراٹھانے کی ضرورت محسوس کرو گے؟

منظم ملی نے جواب دیا۔ جب ہماری قسمت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اجتماعی حیات کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ہماری سب سے بڑی بیماری ہماری لامرکزیت ہے اور اس لامرکزیت کا باعث ان بیشمار طالع آزمائوں کی ہوس اقتدار ہے جو ہندوستان کو اپنی چھوٹی چھوٹی شکار گاہوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک سپاہی کی توار چند امرار کی مسندوں کی حفاظت کر کے ان کے اقتدار کی مدت میں چند مہینوں یا چند برسوں کا اضافہ کر سکتی ہے لیکن قوم کی اجتماعی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔

حسین بیگ اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے قد سے تلخ ہو کر کہا۔ ہماری گفتگو بنگال کی فوج کے متعلق تھی جو ایک طرف مرٹھوں کی لوٹ مار اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے جاہلانہ عزائم کے خلاف ہمارا واحد سہارا ہے۔

منظم ملی نے جواب دیا۔ جی ہاں، لیکن جتنی سے ملی دردی خاں کی فوج کے سپاہیوں اور مرٹھوں کا وہی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگال کے دوست کون ہیں اور دشمن کون ہیں؟

حسین بیگ فطرتاً حکومت پسند تھا اور ملی دردی خاں اسے اُسے غایت درجہ کی عقیدت تھی۔ وہ بنگال کے مکران کی ذات کو تنقیداً تبصرے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس نے انسانی گوشش کے ساتھ اپنا مفروضہ کیا کہ جوئے کہا۔ برخوار مجھے امید ہے کہ ملی دردی خاں کے متعلق بات کرتے وقت

تم سنجیدگی کا ثبوت دو گے اور اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ وہ ہمارا مکران ہے۔

منظم ملی نے کہا۔ بیچا جان معاف یہ کیجئے، میں نے ملی دردی خاں کی ذات کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا، بیشک وہ ہمارا مکران ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت اپنے اعمال پر نکتہ بینی کا حق مجھے نہیں دیتی تو وہ مجھ سے اپنی حفاظت کے لیے تواراٹھانے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے ملی دردی خاں کی بہت سی غریبوں کا اعتراف ہے۔ ملک کے کئی دوسرے مکرانوں سے وہ یقیناً بہتر ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس سلطنت کی مرکزی قوت نہ ہونے کے برابر ہو وہ زیادہ دیر کی قوم کی آزادی اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ دہلی میں مسلمانوں کی سطوت کے پرچم مرگٹوں ہو چکے ہیں اور عالمگیر کی عظیم سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے گھروندے تیر کرنے والے چھوٹے چھوٹے مکرانوں کی جہد کسی اجتماعی نصب العین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہے۔ مسلمان صدیوں کی حکومت کے بعد من حیث القوم اب بتدریج اس تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جو اقتدار اور لامرکزیت میں مبتلا ہونے والی اقوام کی آخری سزا ہوتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا۔ مامیج کے جانشین نااہل ہیں اور اب اگر تم دہلی کے دیوار کی حالت دیکھو تو ملی دردی خاں جیسے لوگوں کا دم غنیمت سمجھو گے۔ اگر ایسے لوگ دہلی کے نااہل اور منہوج مکڑوں سے مایوس ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے تو اب تک سارا ملک ہمارے دشمنوں کے قبضے میں چلا جاتا۔ آج مرٹھ آباد، مکھن اور حیدر آباد کے حالات یقیناً دہلی کے حالات سے بہتر ہیں۔ آپ درست کہتے ہیں لیکن آپ آج کی بجائے کل کے متعلق سوچیں۔ درخت سے کئی کوئی شائیں زیادہ دیر سبز نہیں رہتیں۔ میں اور نگ زیب مامیج کے نااہل جانشینوں سے کہیں زیادہ ان قسمت آزمائوں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جن میں کسی اچھے مکران کو منہوج حکومت پر بھٹانے کی جرات دہمت یا دیانت نہ تھی۔ دلی کے نااہل، منہوج اور بے بس مکران ان کی گردہی سیاست کی پیروی کرتے۔ لال قلعہ ان کے لیے ذرا آسانی کا اکھاڑ تھا۔ بادشاہوں

کے تاج و ان کے ہاتھوں کے کھلونے تھے۔ ہر گروہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ ہلی کے حکمران کی حیثیت ایک بے بس دعا گو سے زیادہ نہ ہو۔ اور وہ اس کی سرپرستی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ ایک گروہ کسی نااہل حکمران کو اپنی بے بس سیاست کا مہر سمجھ کر تخت پر بٹھاتا تھا اور دوسرا گروہ اسے تخت سے اتار کر اس سے زیادہ نااہل امیدوار کے سر پر تاج رکھنے کی جدوجہد شروع کر دیتا تھا۔ اگر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر وہ ہلی سے باہر چھپے صوبہ داروں نے اپنے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج رکھ لیے ہیں تو ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔

اگر وہ ہلی کے امراء نیک نیت ہوتے اور ان کی سیاست قوم کے اجتماعی مفاد کے تابع ہوتی تو وہ یقیناً اپنی ذاتی سودا بازوں کی خاطر نااہل حکمران تلاش نہ کرتے۔ انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ چند فائز افضل مکاروں کو تخت پر بٹھانے کی جدوجہد کی تھی۔ اگر اسی مستعدی کے ساتھ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول یا کسی ضابطہ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشوں اور انگلیں کی بہترین حکمران تلاش کر سکتے تھے تو وہ کسی مول یا ضابطہ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشوں اور انگلیں کی شکست سمجھتے تھے۔ وہ کسی مول یا مقصد کے لیے قربانی دینے کی بجائے ہر مول اور مقصد کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کرنا سیکھ چکے تھے۔ وہ ہلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکمران بڑے تھے بلکہ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ بے ضابطہ سلطنت کے ستون کہلاتے تھے ہر ہالی میں اپنی بھلائی تلاش کرتے تھے۔

حسین بیگ کے لیے معظم علی کی گنگو کا صرف وہ حصہ قابل توجہ تھا جو بنگال اور ہلی دردی خاں کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ وہ ہلی کے امراء سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معظم علی اگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا تو بھی اسے اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے کہا: ہر خرد دار مجھے دہلی کے امراء یا حکمرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر انھوں نے ہالی کا بیج بویا تھا تو انھیں کئی ہالیوں کی سزا ملی چکی ہے۔ دہلی کئی بار مرہٹوں اور جاتوں کے ہاتھ لٹ چکا ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے ایسے حالات میں بھی بنگال۔ اودھ اور دکن کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ بنگال میں علی دردی خاں ہماری عزت اور آزادی کا آخری محافظ ہے۔ خدا

کرسے اس کا سایہ چند برس اور ہمارے سر پر ہے اور تم جیسے نوجوان بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساں کریں!"

حسین بیگ ان الفاظ پر اس ناخوشگوار بحث کو جو اس کے لیے کافی حد تک ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن معظم علی نے کہا،

بچا جان آپ بڑا زانیں مستقبل کے مورخ ان صوبہ داروں کو موجودہ صورت حالات کی خرابی سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جنھوں نے وہلی کے دیوار کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ ان میں سے کوئی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیتا اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ قوم کو تباہی سے بچایا جائے تو کم از کم میں اس سے اس کا حسب و نسب نہ پوچھتا۔ اگر وہ اپنے کردار سے قوم کا سبب دہشتناک ہوتا تو میں ایک رضا کار کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا۔ اس کی فوج کا معمولی سپاہی بن کر مجھے یہ اعتماد ہوتا کہ جب وہ کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو میں اسے روک سکوں گا۔ اس کی انگلیں میری انگلیں ہوتیں، اس کے دل کی دھڑکیں، میرے دل کی دھڑکیں اور اس کے منیر کی آواز میرے منیر کی آواز ہوتی۔ اور اس کی شکست کو میں اپنی شکست سمجھتا۔ پھر ایسے شخص کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طالع آزمائی کے کسی گروہ کی حمایت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ ایک مقصد کے لیے ایثار اور قربانی کا دلولے کر میدان میں نکلتا اور عوام کی اجتماعی قوت اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ عوام کے لیے جھوپڑ سے تعمیر کرتا اور اس کے اقتدار کی سند مرہٹوں اور ان کی بجائے ان کے دلوں میں ہوتی۔ لیکن یہ لوگ جنھیں آپ قوم کا سبب دہشتناک خیال کرتے ہیں۔ مجھے کسی ایسے اجتماعی اصول کے ملبوراء نظر نہیں آتے جس کی فتح کو قوم کی فتح سمجھ سکوں۔ یہ لوگ ہمارے احساس اور شعور کی بجائے ہماری بے حس کی بیلہ وار ہیں۔ ان کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر چھیل بھٹکی ہیں اور جڑے گرنے کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں مرہٹوں کی لوٹ مار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جوس ملک گیری سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت

نہیں کردہ ایک دن مرہٹوں کے غلات جگ کتے ہیں اور دوسرے دن ان کے دست بن جاتے ہیں اور اگر مرہٹے انہیں سرد دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو وہ اپنے سلمان ہمسایہ پر حملہ کرنے سے بھی بدیلغ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ انگریز ہماری آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ لیکن ان میں سے کون ہے جس نے اپنی کسی نہ کسی ذاتی مصیبت کے پیش نظر انگریزوں کو اس ملک میں پاؤں جمانے کے لیے مدد نہیں دی؟ ان کا منہائے نظر صرف ذاتی اعتبار ہے اور بھجے ڈرہے کہ ذاتی اعتبار کے تحفظ کے لیے یہ لوگ کسی دن قوم کی ہٹا کو بھی دادوں پر لگا دیں گے۔

حسین بیگ نے صبیحہ کر کہا: تم ملی دردی خاں کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز کر سکتا ہے یا قوم کی آزادی کو دادوں پر لگا سکتا ہے۔

حسین بیگ کے تہجد دیکھ کر منظم چند نانیے خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا: چچا جان میں نے یہ سب اس لیے کہا ہے کہ میں آپ کی بے عزت کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ملی دردی خاں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات سے آپ میری نسبت کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جس چیز کو خطرناک سمجھتا ہوں وہ ان کی مصیبتیں ہیں۔ ایک ایسے حکمران کی مصیبتیں، جس کا اعتبار کسی مقصد کے لیے جہد جہد کا اثر نہیں بلکہ اپنی ذاتی ذنانت اور حکمت عملی کا نتیجہ ہے جو لوگ کسی مقصد کیلئے جہد جہد کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی پوئجی وہ تربیت یافتہ رائے عام ہوتی ہے جسے وہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے بیلہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اعتبار اگر لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو تو عوام کا اجتماعی شعور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ مگر ان کے لیے کوئی خلہ پھیرا ہو تو رائے عام ان کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے اعتبار کے ختم کے لیے قسمت آزمائش کے لوگوں سے جوڑ توڑ یا سودے بازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ساری قوم اپنے دوست سمجھتی ہے۔ ان کے دشمن سب کی نگاہوں میں دشمن جوتے ہیں۔ لیکن بدھتی سے اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود ملی دردی

خاں کا شمار ایسے لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے صرف اپنی ذاتی قابلیت یا ہوشیاری کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی ہے۔ اور اس حکومت کے تحفظ کے لیے بھی وہ چند ہوشیار آدمیوں کی حمایت یا دوستی کافی سمجھتے ہیں۔ بنگال کو جب کوئی امدادی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ انگریزوں یا مرہٹوں کی معاذ سڑکریوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بیرونی خطرہ درپیش ہو تو وہ اپنے بدترین غداروں کو بھی معاف کر کے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک وہ ایک ہوشیار سیاست دان اور تجربہ کار جرنیل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بنگال کے سپاہی کا بھی حکم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا حال عاذا کماں ہے؟

حسین بیگ کا چہرہ غصے سے متما رہا تھا۔ اس نے انتہائی مضبوط سے کام لیتے ہوئے کہا:

”م تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملی دردی خاں انتہائی ناقابل اعتماد آدمی ہے جو حسب ضرورت اپنے دست اور دشمن بدلتا رہتا ہے؟“

مسلم علی نے جواب دیا: میں نے ملی دردی خاں کو ناقابل اعتماد نہیں کہا لیکن اگر آپ بڑا نہ مانیں تو یہ ضرور کون گاناں کے گرد ایسے آدمی جمع ہیں جنہیں میں قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور اگر ان کے سامنے ایک حکمران کی ذاتی مصیبتیں نہ ہوتیں تو ان کے بدلہ میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔“

حسین بیگ نے کہا: ادرم یہ بھی کہتے ہو کہ ملی دردی خاں کے سپاہیوں کو یہ علم نہیں کہ ان کا عاذا کماں ہے؟

”ہی ملی اور میں غلط نہیں کہتا!“

”شاید ملی دردی خاں کو بھی یہ علم نہ ہو کہ ان کا عاذا کماں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے بتاؤ ادرم اس کے کانوں تک تمہاری یہ آواز پہنچاؤں؟“

مغفم علی نے حسین بیگ کی طہر سے بھری ہوئی مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے جواب دیا: ”جی انھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے جیسے لوگ کسی کے فائدہ نہیں ہو سکتے۔“

سین بیگ کو میرے جعفر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی تاہم وہ علی دردی خاں کی فوج کے ایک افسر کے بیٹے کی زبان سے اس کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: ”دیکھو برادر اگر تم فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا لیکن علی دردی خاں کے ساتھیوں کے متعلق زبان کھولتے وقت تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ سلطنت کے ستون ہیں اور تمہارا والد فوج کا ملازم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے خیالات اس قدر بغیانہ ہیں۔ میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر تمہاری باتیں سنی ہیں۔ لیکن اس مکان کی چار دیواری سے باہر اگر تم کسی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کہیں تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ تم فضل اور اصفت کے دوست ہو اور میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم ان کے سامنے ایسے خیالات کی تبلیغ کرو۔ تم ابھی بچے ہو۔ لیکن وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ علی دردی خاں بنگال کے مسلمانوں کا آخری سہارا ہے۔“

مغفم علی نے کرسی سے اٹھ کر کہا: ”چچا جان اگر میں نے کوئی تیغ بات کہہ دی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ یقین رکھیں وقت آنے پر میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل مجھے کسی سے کم عزیز نہیں ہے۔“



اگلے روز مغفم اور یوسف اپنے باپ کے ساتھ منار کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ حسین بیگ کے نوکر نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ رک گئے اور نوکر نے قریب آکر غموہل سے مرزا صاحب نے آپ کو بلا دیا ہے۔“

مغفم علی نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم جاؤ میں ان سے مل آؤں۔“

مغفم علی نوکر کے ساتھ چلا گیا تو یوسف نے مغفم علی سے کہا: ”مغفم مرزا صاحب نے پہچان لی کہ میں دست بلایا ہے۔ خیر تو ہے؟“

مغفم نے جواب دیا: ”بھائی جان معلوم ہوتا ہے آج میری شامت آئے گی۔ کیوں کیا ہوا؟“

”کل میری باتوں سے مرزا صاحب خفا ہو گئے تھے۔“

”کیوں تم نے ان سے کیا کہا تھا؟“

”وہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کے متعلق پریشان تھے۔ اور میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اور اب وہ زیادہ پریشان ہوں گے۔ تم نے علی دردی خاں کے متعلق ضرور کوئی ایسی دہی بات کہی ہوگی؟“

”میں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا تھا اور انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں علی دردی خاں کی حکومت کا باقی ہوں۔“

”تمہیں مرزا صاحب کے ساتھ نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ پرانی وضع کے آدمی ہیں۔ اور علی دردی خاں کے ساتھ ان کے مراسم بہت گہرے ہیں۔“

یوسف اور مغفم نے نماز کے بعد کچھ دیر غموہل کا انتظار کیا اور پھر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر وہ صحن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد غموہل بھی آگیا اور اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کہا: ”مغفم! تم نے کل مرزا صاحب سے کیا باتیں کی تھیں؟“

”ابا جان میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ خوف یا کاہلی ہے۔ مرزا صاحب بہت زیادہ خفا تو نہیں تھے؟“

”نہیں بلکہ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئے تاہم



وہ تاکید کرتے تھے کہ تمہیں سی دودی خاں اور ان کے اسرار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

مستظم علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ابا جان انھوں نے یہ تو حضور درگاہ پر لگا کر میں بہت تلافی ہوں؟"

نہیں، وہ یہ کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا میرے لیے ایک ممتا ہے، کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایک سادہ دل نوجوان ہے اور کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ کہتے تھے ایسے نوجوان یا تو دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔

مستظم علی نے کہا۔ "ابا جان میں جہانی جان سے ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری شگایت کریں گے اور آپ عمر اگر میری خوب مرقت کریں گے۔ مجھے یہ بھی ڈرتا تھا کہ وہ آٹھو مجھے اپنے عمر کی چلو دیاری کے قریب نہیں پہنچنے دیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی پچھے آدمی ہیں۔ تم نے ان سے میرے جھڑکے خلاف کچھ کہا تھا؟"

جی ہاں۔

وہ ہر اس آدمی کو اچھا سمجھتے ہیں؟ میرے جھڑکے کو بڑا خیال کرتا ہے؟

لیکن انھوں نے مجھے تو ڈانٹ دیا تھا۔

یہ ان کی ظاہر وادی تھی لیکن تمہیں ایسے خیالات کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔

ابا جان میں محتاط رہیں گا۔

مرزا صاحب ایک ادب بات کہتے تھے۔

وہ کیا؟

وہ کہتے تھے کہ مستظم علی کے لیے میرے کتب خانے کا دوروز ہر وقت کھلا رہے گا۔

لیکن مجھے اس دن خوشی ہوئی جب میرے بھائی نے میرے بھائی کے گھر چلے آئے۔

## دوسرا باب

ایک دن مرشد آباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں رانگھو جی بھونسلہ کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج برفہان کی طرف بڑھ رہی ہے علی دودی خاں مرشد آباد سے باہر شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر پڑنے ہی پر روانہ کا درج کیا اور مرشد آباد اور دوسرے شہروں کی افواج کو یہ حکم بھیجا کہ وہ راستے میں اس کے ساتھ آئیں۔ دونوں کے انڈر اندر مرشد آباد کی چھاؤنی خالی ہو گئی اور سپاہیوں کے صرف چند دستے شہر اور شاہی محل کی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ چند دن بعد یہ خبر پائی کہ علی دودی خاں کا ایک کمان دار میر محبوب اور فوج کے چند اور افسر بنگال سے غزالی کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور پنڈت بھاسکر نے یہ اعلان کیا ہے کہ بنگال کی فوج سے غزالی کرنے والوں کو مرہٹہ فوج میں اپنے سابقہ عہدوں پر لے لیا جائے گا۔ مرشد آباد میں سراپا کی پھیلی ہوئی تھی۔

محمد علی، یوسف علی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف بیگ اور افضل مرشد آباد کی فوج کے ساتھ ماز جنگ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

مستظم علی کو پہلی بار نہایت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ غلے کے وہ لوگ جن کے بیچ جنگ کے لیے جا چکے ہیں۔ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

شاہی محل کا دوروز مستظم علی کے باپ کا دوست تھا اور وہ ہر روز علی الصباح اس کے پاس جنگ کے تازہ حالات معلوم کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ دوروز سے

مل کر واپس آیا تو اسے اپنی ماں کا چہرہ بے حد مغموم دکھائی دیا۔

”کیا ہوا امی جان؟“ اس نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں بیٹا! کوئی اچھی خبر آئی ہے؟“

”ہاں امی جان آج کی خبریں کچھ اچھی ہیں۔ مرہٹے چند چٹروں کے بعد پیچھے ہٹ گئے

ہیں لیکن ابھی کوئی فیصلہ کن سرکہ نہیں ہوا۔ آپ اس قدر لگن کون ہیں؟“

”بیٹا! ماں نے مغموم لمحے میں جواب دیا: ”مجھے فرحت سے یہ توقع نہ تھی!“

”کیا ہوا امی جان؟“ معظم نے براہ رسا ہر سوال کیا۔ ”فرحت نے کیا کہا؟“

”اس میں فرحت کا تصور نہیں بیٹا۔ اصل میں وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئی تھیں بہت

برتیز تھیں۔“

”فرحت یہاں آئی تھی؟“

”ہاں وہ ابھی گئی ہے۔“

”آخر کیا کیا اس نے؟“

”ماں نے اُسے ایک الماری سے کپڑے کی چند چڑیاں نکالیں اور معظم علی کو دکھاتے ہوئے

کہتے دیکھو! فرحت آج اپنی چند سیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ سلطان خاں کی

لڑکی بھی تھی۔ مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ لیکن آج اس نے بہت زیادتی کی۔ پچھلے اس نے یہ

ملکہ تم بزدلی کی وجہ سے فوج میں شامل نہیں ہوئے۔ پھر اس نے اپنی چڑیاں تار کر میرے سنے

رکھ دیں اور کہنے لگی ”مظلم بھائی کو ہماری طرف سے یہ تحفہ دے دیجیے۔“

”تھوڑی دیر کے لیے معظم علی کی رگوں کا خون صحت کر اس کے چہرے میں آگیا۔ اس نے

کہا: ”اور فرحت نے کیا کہا؟“

”فرحت نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سیلیوں کا منہ بند کرے گی۔ لیکن وہ

خاموشی سے ہنستی رہی۔“

”امی جان اگر آپ کو ایسی باتوں سے صدمہ ہوتا ہے تو میں اکیلا مرہٹوں کے لشکر کے سامنے

کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت آنے پر کوئی آپ کے بیٹے کو بزدل نہیں کہے گا اور

وہ سلطان خاں جس کی صاحبزادی نے آپ کو میرے لیے چڑیاں دی ہیں خود مرہٹوں کے

حملے کی خبر سننے ہی شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے اسے بڑی شکل سے دکا

تھا۔ امی جان میں فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا کہ موجودہ حالات میں میرا مُرتد بادیوں رہنا

زیادہ ضروری ہے۔ شہر سپاہیوں سے قریباً خالی ہو چکا ہے۔ اگر دشمن نے اس صورت حال سے

فائدہ اٹھا کر چند تیز رفتار دتے اس طرف بھیج دیئے تو یہ عقدہ دور کا شاہی محل بھی محفوظ نہیں

رہے گا اور شہر سے باہر ہمارا عمل تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں مرزا صاحب کے پاس جا رہوں۔“

”لیکن بیٹا خدا کے لیے فرحت کی شکایت نہ کرنا۔ اس کی نیت بری نہ تھی۔“

”مظلم علی نے کہا: ”نہیں امی جان میں آصفت اور افضل کی بہن کی شکایت نہیں کر سکتا

لیکن یہ چڑیاں سنبھال کر رکھیے۔“



”مظلم علی، حسین بیگ کے محل میں داخل ہوا تو وہ بیرونی احاطے میں بندوق سے نشاندہ بازی

کر رہا تھا اور اُسے دس سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب

حسین بیگ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا:۔

”چچا جان آج میں کتب خانہ کی بجائے آپ کا اسلحہ خانہ دیکھنے آیا ہوں۔“

”حسین بیگ مسکرایا۔ ”تمہیں تواری کی ضرورت ہے یا بندوق کی؟“

”ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کے کتب خانے میں ڈیڑھ ہزار کتابیں ہیں۔ میں یہ

جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے اسلحہ خانے میں کتنا سامان ہے؟“

”اگر استعمال کرنے والے ہوں تو سامان بہت ہے۔ لیکن میں تمہاری اس لچا پنک

موسیٰ کی وجہ نہیں سمجھ سکتا۔“

مظلم علی نے جواب دیا: شہر فوج سے خالی ہو چکا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن نے ہوشیار می سے کام لیا تو مرشد آباد پر اچانک قبضہ کر لیتا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اور یہ محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو آپ کا مکان اس محلے کے لیے قلعہ کا کام دے سکتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مجھے کسی فوجی عہدہ کی ضرورت ہو تو آپ میری سفارش کر سکتے ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس قلعہ کا محافظ مقرر کر دیا جائے۔

حسین بیگ نے کہا: لیکن میرے پاس صرف چندہ تربیت یافتہ سپاہی اور پانچ چھ بیکار ذکرہ رکھے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو تم اتنے آدمیوں کے ساتھ کیا کر سکو گے؟ آدمیوں کی فوج نہ کیجیے۔ خطرے کے وقت محلے کا ہر آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انھیں تربیت دینے کا موقع مل جائے۔ انھیں اسلحہ اور بارود کی ضرورت ہوگی اور یہ فراہم کرنا آپ کا کام ہوگا۔

”برخوردار تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا۔ میرے پاس کوئی اڑھائی سو ہندو تیل اور قریباً اتنے ہی ہسٹول اور تھواریں ہیں۔ بارود اتنا ہے کہ اگر استعمال کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہفتے میں بھی ختم نہیں ہوگا۔ دو تو بیج جو میں نے پانچ سال قبل خریدی تھیں اندر پڑی ہوئی ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ انھیں کہاں نصب کیا جائے۔ اب اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ فیصلہ اس قلعہ کا محافظ کرے گا۔“

”تو آپ کو میری خدمات منظور ہیں؟“

حسین بیگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ”مظلم علی میں تمہیں اپنے قلعہ کا محافظ اور پانی ان افواج کا سپہ سالار مقرر کرنا ہوئی جن کی تعداد سرورست پندرہ تربیت یافتہ اور چھ غیر تربیت یافتہ سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔“

مظلم علی نے کہا: ”آپ کا سپہ سالار آپ کو واپس نہیں کرے گا۔“

حسین بیگ نے مظلم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا: ”بیشا میں تم سے کبھی واپس نہ تھا۔“

مظلم نے کہا: ”میں آج ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ آج شام آپ محلے کے باہر لوگوں کو یہاں جمع ہونے کی دعوت دیں!“

”بہت اچھا، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اچانک یہ خیال کیسے آیا ہے کہ مرشد آباد کو واقعی کوئی خطرہ ہے؟“

”چچا جان اگر خطرہ نہ ہو تو بھی ہمیں تیار رہنا پڑیے۔ ابھی آپ نشاد بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ آپ سبگامی حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہیں۔“

حسین بیگ نے جواب دیا: ”یہ درست ہے کہ محاذ پر اپنے سپاہی بھیج دینے کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر کوئی سرپرست اس طرف آنکھ تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہمارے گھر میں فحش ایسی باتیں سوچا کرتی ہے جس دن سے آصف اور افضل گئے ہیں۔ وہ صبح شام باقاعدہ نشاد بازی کی مشق کیا کرتی ہے۔ ایک دن اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔ احتیاط کرنا اچھی بات ہے تاہم میں یہ نہیں سمجھتا کہ مرہٹے محاذ پر جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکھیں گے۔ لیکن تم اس مسئلہ میں بہت سنجیدہ ہو اور تمہاری باتوں سے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا لشکر واقعی مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔“

مظلم علی نے کہا: ”چچا جان میرے خدشات بلا وجہ نہیں۔ مرہٹے فتح کی بجائے لوٹار کے لیے آئے ہیں۔ اب تک انھوں نے اپنے راستے کی بستیوں اور شہروں کو برباد کیا ہے لیکن بہت کم مقامات ایسے ہیں جن پر انھوں نے قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ بنگال کی زیادہ دولت مرشد آباد میں ہے اور ہمارے غدار

جوان کے ساتھ جلتے ہیں۔ انہیں یہ بھی بتا چکے ہوں گے کہ مرشد آباد پر حملہ کرنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ محاذ جنگ سے ہماری فوج کی توجہ ہٹانے کے لیے چند دستے اس طرف بھیج سکتے ہیں۔ آپ میرے مصیب کو جانتے ہیں وہ ایک ہوشیار آدمی ہے۔ اور مرشد آباد کے چہرچہ سے واقف ہے۔ اگر میں اس کی جگہ جاتا تو اب تک مرشد آباد پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جگت سیٹھ نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ سو آدمی بھرتی کیے ہیں اور ہمارے لشکر شیر علی کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ آج صبح جب میں محاذ جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کے داروغہ کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں شیر علی خاں ملے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی جگت سیٹھ کی ملازمت کر لوں۔ لیکن نے جواب دیا کہ میں ایک کرڈ بیتی مہاجن کے خزانوں کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنے محل کے کسی غریب آدمی کے دروازے پر پیرہ دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ چچا جان ہو سکتا ہے کہ میرے خدشات محض وہم ثابت ہوں۔ لیکن جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی اور ہماری فوج واپس نہیں آتی میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کی دفاعی حالت کیسی ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

”بہت اچھا تم اپنا کام کرو، میں محل کے آدمیوں کو دعوت بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر حسین بیگ اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہوا۔“ تم سب ابھی طرح سن لو کہ آج سے معظم علی تھا را حاکم ہوگا اور اسے کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“



شام کے وقت حسین بیگ کے دسترخوان پر محلے کے تیس چہرہ آدمی جمع تھے۔ پہلے حسین بیگ نے انھیں جمع کرنے کی غرض و نیت بیان کی اور اس کے بعد معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہاجن کی اکثریت یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ غرض استیلا کے طور پر اپنے اپنے زیر اثر لوگوں کو منظم کرنے کے لیے تیار تھے۔

صرف دس آدمی ایسے تھے جنہیں حسین بیگ اور معظم علی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق تھا اور جنہوں نے ان کے ساتھ صدق دل سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اگلے دن صرف بیس نو عمر لڑکے اور تیس بڑی عمر کے آدمی جن میں سے اکثر محلے کے غریب دکاندار، مزدور اور چند امیر گھروں کے نوکر تھے۔ حسین بیگ کے مکان پر حاضر ہوئے حسین بیگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن معظم علی کے نزدیک یہ ابتداء بڑی نہ تھی۔ اس نے اسلحہ داروں سے بندوقیں نکال کر ان میں تقسیم کیں اور انھیں محلے سے باہر ایک کھلے میدان میں نشانہ بازی کے لیے لے گیا۔ دوسرے دن پندرہ اور آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بعد معظم علی سے فوجی تربیت حاصل کرنے والے رضا کاروں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔

اس کے اپنے دو نوکر صابر اور جمال خاں بھی رضا کاروں میں شامل ہو چکے تھے جمال خاں چند برس جنگال کی فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔ لیکن صابر کو قوار اور بندوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف جمال خاں کی رقابت کی وجہ سے رضا کاروں کی پریڈ میں شامل ہوتا تھا۔ تین دن اپنے ساتھیوں کے قہقہے سننے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کا پہلا نشانہ زہد پر لگا اور وہ بندوق وہیں پھینک کر بھاگتا ہوا معظم کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں چلایا:

”سرکار میرا نشانہ ٹھیک ہو گیا ہے اب مجھے بھی ڈیکھے، گھر میں بہت کام ہے۔“ معظم علی کی یہ مہم اب آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے اور کچھ مجبوراً اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہر روز تین چار گھنٹے رضا کاروں کو تربیت دینے کے بعد حسین بیگ کے محل میں چلا جاتا۔ جہاں حسین بیگ نے اس کی ہدایات کے مطابق چالیس مزدور پرانی دیواریں مرمت کرنے اور مختلف مقامات پر مورچے بنانے کے کام پر لگانے تھے۔ معظم علی ان کام دیکھتا۔ محل کے مختلف گوشوں میں بچہ لگاتا اور اگر کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو انھیں ہدایات دے کر چلا آتا۔ پھر وہ محلے کی گلیوں میں پھرتا اور خاص خاص مقامات

میں ان انتظامات کو کافی نہیں سمجھتا۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اندرونی احاطے کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ اور ان کی بلندی بھی زیادہ نہیں۔ دشمن بیرونی احاطے میں داخل ہونے کے بعد انھیں آسانی سے چھاند کر اندر آ سکتا ہے ان کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ انھیں اونچا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اس کے آگے ایک خندق کھود دی جائے اور اسے پانی سے بھر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر وقت ملا اور مرزا صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو خندق کے ساتھ بانس گاڑ دیئے جائیں گے، جو قریباً ایک گز زمین کے اندر اور کوئی اٹھالی گز زمین کے باہر ہوں گے۔ بانس کی یہ بانٹ زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ دشمن دیوار بھانسنے اور خندق عبور کرنے کے بعد براہ راست رہائشی مکان میں مہارے آخری مورچوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ مکان کے مورچوں سے ہماری گولیاں خندق میں گرنے والوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گی۔ مرزا صاحب کے پاس دو توپیں ہیں اور انھیں تھوڑا سا کے سامنے نصب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس طرف صحن میں ایک کھائی کھودی جائے گی جس میں پچاس ساٹھ سپاہی چھپ کر بیٹھ سکیں گے۔ اگر دشمن نے دروازہ توڑ کر اندر آنے کی کوشش کی تو اسے سب سے پہلے ہماری توپوں کی آتش بازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ تمام انتظامات عارضی ہیں اور ایک غیر متوقع حملے کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مرتبے بیرونی تفصیل توڑنے یا پھانسنے کے بعد کسی منظم فوج کی بجائے ایک بیسے کی بھیڑ کی شکل میں اندرونی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور ان کا نصب ایمن صرف ٹوٹ مار ہوگا۔ اگر ہم نے ایک بار ان کے دانت کھٹے کر دیئے تو وہ دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

شیر علی نے کہا: لیکن برخوردار! اتنے بڑے کام کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیے تھا۔ خیال میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنا وقت لگے گا؟  
اگر پچاس ساٹھ آدمی روز کا کم پور لگا دیتے جائیں تو یہ کام چند دن میں ختم ہو سکتا ہے لیکن

پر مورچے تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا چند دنوں میں مخفی کی مرگی کے ناکے پر پھانک لگ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس کام میں دلچسپی لینے لگے جو چند دن پہلے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا مذاق اڑا کر تے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد قریباً ہر روز اس کے چند چہ چہ ساتھی حسین بیگ کے مکان پر جمع ہو کر دن بھر کی کارگزاری کا جائزہ دیتے اور اگلے دن کے لیے پروگرام بناتے۔



ایک دن مرزا حسین بیگ کی دعوت پر شیر علی نے اس کی حویلی کے دفائی انتظامات کا معائنہ کیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بیرونی تفصیل کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا فاصلے پر اینٹوں کے ستون تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کے استفسار پر معظم علی نے بتایا کہ تفصیل زیادہ چوڑی نہیں۔ جب ان ستونوں پر لکھوی کے تختے ڈال دیئے جائیں گے تو سپاہیوں کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ تفصیل کا کنارہ ڈالا اونچا ہوگا۔ اور یہ سپاہیوں کے لیے ڈھال کا کام دے گا۔ باقی تین طرف یہ کام ختم ہو چکا ہے۔ چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔

شیر علی نے بیرونی احاطے میں تفصیل کا چکر لگانے کے بعد حسین بیگ سے کہا: مرزا صاحب آپ نے تو اس مکان کو قلعہ بنا دیا ہے۔

معظم علی نے کہا: ڈیوڑھی کی چھت پر بھی مہار مورچہ کافی مضبوط ہے لیکن یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو میں مرزا صاحب کو یہ چار دیواریں گرا کر تکی تفصیل تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چلیے آپ کو اندرونی حصہ دکھاتا ہوں!

شیر علی ان کے ساتھ اندرونی احاطے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اسے رہائشی مکان کی منجلی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ریت کی بوریوں کے مورچے دکھانے کے بعد کہا: آپ اسی قسم کے انتظامات بالائی منزل میں بھی دیکھیں گے۔ میں نے جھپٹوں پر بھی مورچے بنوا دیئے ہیں اگر دشمن اندرونی احاطے تک پہنچ گیا تو اسے ہر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ چھتوں اور باموں کے مورچوں سے گولیوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم

برستی سے مرزا صاحب کو میری بہت سی تنہا دیر سے اتفاق نہیں :-

حسین بیگ نے شیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :- مجھے مسئلہ کسی تجویز سے اختلاف نہیں لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ اور پھر اگر ہمارے وہ غلط ثابت ہوا کہ مرہٹوں کی فوج حماد جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکے گی تو شہر کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔ اور وہ تو چھوڑے میرے اپنے بیٹے واپس آکر یہ کہیں گے کہ باباجان آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ اب یہی یہ حالت ہے کہ مرشد آباد میں میرے بعض دوست میری دماغی حالت پر شہرہ کرتے ہیں :-

شیر علی نے کہا :- مرزا صاحب ! لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہ کیجیے۔ خدا کرے کہ مرشد آباد کے متعلق ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹے اگر مرہٹوں جنگ سے شکست کھا کر واپس بھی چلے گئے تو ہمیں مستقبل میں کوئی اور خطرہ پیش نہیں آسکتا، موجودہ دور میں میں بردت غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے تیار رہنا چاہیے۔ عقل مند لوگ ہمیشہ بارش سے پہلے اپنے مکانوں کی چھتیں مرمت کرتے ہیں اور موجودہ زمانے میں بارش سے زیادہ دشمن کے حملے کے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ بعض گھٹائیں برسات کے موسم میں بھی برے بغیر گزر جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ جو لوگ بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی چھتوں اور پرانوں کی مرمت کا کام شروع کر دیتے ہیں وہ جیتے ہیں :-

حسین بیگ نے کہا :- مجھے میں میرے متعلق یہ بات بھی مشہور ہو چکی ہے کہ میرے پاس براخراہ ہے اور میں یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں :-

شیر علی نے کہا :- مرزا صاحب آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ اگر آپ کے پاس خزانہ نہیں تو شاید کسی دن فراٹوں والے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔ بگت سیٹھ اپنے قرآن کی حفاظت کے لیے بہت فخر مند ہے۔ اب تک وہ اپنے محل کو دفاعی لحاظ مضبوط بنانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہے۔ مجھے اس نے اپنے محل کا محافظ مقرر کیا ہے لیکن اب

میں نے جو کچھ کیا ہے وہ معظم علی کی اس کارگزاری کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ معظم علی نے اس محلے کے لوگوں میں جو مدافعتی جذبہ بیدار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ لیکن بگت سیٹھ نے جو کر کے کے سپاہی بھرتی کیے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ خطرے کے وقت وہ شاید اپنی بندوقوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں :-

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رہائی مکان کی دوسری طرف بندوق چلنے کی آواز سنانی دی۔ شیر علی نے چونک کر کہا :- یہ بندوق کی آواز شاید اندر سے آئی ہے :-

حسین بیگ مسکرایا :- یہ افضل کی بہن ہوگی۔ وہ بلائی منزل کے درپچے سے بندوق چلانے کی مشق کیا کرتی ہے :-

مٹھوڑی دیوار دریا تیں کرنے کے بعد شیر علی نے حسین بیگ سے رخصت چاہی۔ معظم علی اسے ڈیڑھ سیٹھ چھوڑنے کے لیے آیا۔ دروازے پر پہنچ کر شیر علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا :- معظم آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد مجھے اس بات کا احترام کرنا پڑتا ہے کہ کئی سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد بھی تمہارے مقابلہ میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی دن مٹھوڑی دیر کے لیے بگت سیٹھ کے محل میں اگر میرے انتظامات کا جائزہ لو۔ یقیناً تم مجھے کوئی کارآمد مشورے دے سکو گے :-

”آپ جس وقت دیکھ دیں، میں حاضر ہوں۔“

”اگر فرصت ملے تو آج ہی کسی وقت آجاؤ !“

”بہت اچھا، میں آج ظہر کی نماز کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔“

چند دن بعد حسین بیگ کے محل کے بڑی احاطے اور فیصل کے دفاعی انتظامات مکمل ہو گئے تو معظم علی نے اندرونی پار دیواری کے ساتھ خندق کھودنے کو کہا۔

حسین بیگ نے جواب دیا :- جو کچھ ہم کر چکے ہیں کافی ہے۔ ہمیں اس گھر کا حلیہ اس قدر



میں دیہات سے آدمی بلانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ شہر کے لوگ بیکار ہیں۔ یہ کام کمنے کی بجائے میرا مذاق اڑائیں گے۔ دوپہر تک میرے علاقے کے ڈیڑھ دو سوکان یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی تو دیا پار کی جاگیر کے کسانوں کو بھی بلواؤں گا لیکن یہ کام چار دن کے اندر اندر ختم ہو جانا چاہیے۔“ حسین بیگ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تیسرے پہر حسین بیگ کے مکان میں خندق کی کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کے منگوانے میں کوئی دو سو آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔

اگلے دن حسین بیگ کا ایک دوست اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: مرزا صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟

مرزا صاحب سے پہلے بھی کئی آدمی یہ سوال کر چکے تھے۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا: ”دیکھیے صاحب یہ میرا اپنا مکان ہے۔ اگر میں اسے کھود کر ایک تالاب بنوادوں تو بھی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔“

دوست نے دوبارہ اس موضوع پر زبان کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کی جب وہ چلا گیا تو حسین بیگ نے ایک نوکر سے کہا:

”دیکھو آئندہ جو لوگ مجھ سے ملنے آئیں انہیں لانے کی بجائے باہر کی بیٹھک میں روک لیا کرو!“

چند دن بعد خندق تیار ہو گئی اور حسین بیگ نے حویلی سے بڑی کاپانی خارج کرنے والی نالیوں کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ اس کے بعد اگلے دن نئے کے لوگوں نے دیکھا کہ حسین بیگ کی حویلی میں بالنسوں سے لدے پھکرے پٹے آ رہے ہیں وہ حیران تھے۔ لیکن کسی کو حسین بیگ کے سسٹنے اپنی حیرانی کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔

اس دوران میں معظم علی بلاناغہ محلے کے رضا کاروں کو تربیت دیتا رہا۔

نہیں بگاڑنا چاہیے کہ سارا مکان گرا کر از سر نو تعمیر کرنا پڑے۔

”بہت اچھا بچا جان! جیسے آپ کی مرضی! اتنی تیاری سے کم از کم یہ ناغہ ضرور ہوگا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم دشمن کو چند گھنٹوں کے لیے روک سکیں گے۔“

معظم علی یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا لیکن حسین بیگ کے کانوں میں اس کے الفاظ دیر تک گونجتے رہے۔ وہ سارا دن بے چین رہا اور رات کے وقت بھی اسے اچھی طرح نیند نہ آئی۔

اگلے دن علی الصباح معظم علی اپنے گھر میں گری نیند سو رہا تھا کہ صابر نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا: ”سرکار! مرزا صاحب باہر کھڑے ہیں۔“

”مرزا حسین بیگ؟“ معظم علی نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں سرکار۔ شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔“

معظم علی جلدی سے اٹھا اور بھاگا ہوا باہر نکلا۔

”آپ! اس وقت؟“ اس نے حسین بیگ کو دیکھتے ہی کہا۔

”دیکھو بیٹا! حسین بیگ نے کسی تسمید کے بغیر کیا۔ کل تم سے باتیں کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ جب اتنا کچھ کیا ہے تو خندق بھی کھود دی جائے۔ لیکن وہ پس اتنی گری ہو کر دشمن اندرونی دلوں پر چاندنہ کے بعد آسانی سے مکان پر حملہ نہ کر سکے۔ لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد خندق کے آگے بالنس گاڑنے کی تجویز پوزور نہیں دو گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مرزا بابر کے لوگ مجھے سچ پچ پانچ سمجھنے لگ جائیں۔“

معظم علی جانتا تھا کہ ایک کام ختم ہونے کے بعد وہ خود بخود دوسرا کام شروع کر دے گا۔ تاہم اس نے کہا: ”چچا جان میں تو خندق کے لیے بھی آپ کو مجبور نہیں کرتا۔“

”نہیں نہیں خندق ضرور کھودی جائے گی۔ میں اس کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ لوگ بھونکتے رہیں مجھے ان کی پروا نہیں۔“

”بہت اچھا بچا جان۔ لیکن آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟“

جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور رضا کا دل کی تعداد بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہو رہی تھی تاہم اسے اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ محلے کے اکثر لوگوں کو بندھن چلانا سکھا چکا ہے۔ اب وہ لوگ بھی جو نظائر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ درپردہ اپنے اپنے گھروں کی حفاظت کے انتظام کر رہے تھے معظم علی کی تحریک کے اثرات مرشد آباد کے دوسرے محلوں میں بھی پہنچ چکے تھے اور جو اہل کی ایک اچھی خاصی تعداد شہریوں میں مافعاہ شعور بیدار کرنے کے لیے میدان میں آچکی تھی :



ایک دن معظم علی نے محلے کے تمام رضا کا دل کو حسین بیگ کے مکان میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ بھائیو! اور بزرگو! چند ہفتے قبل مرشد آباد سے فوج کی روانگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر خدا خواستہ مرشد آباد کو کون ظفر پیش آیا تو شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہمارا اتحاد انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاہی محل کے بعد ہمارا عمل سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اب اگر کسی نے ہم پر حملہ کیا تو وہ ہمیں بیڑوں کی طرح نہیں لٹک سکے گا۔ پہلے تو ہم دشمن کو گلیوں کے دروازوں سے باہر روکیں گے۔ پھر اگر وہ ہمارے ابتدائی مورچے توڑ کر اندر گھس آیا تو ہم اپنے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے گولیاں برسائیں گے۔ اس کے بعد اگر ہمیں اور پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ جوبی ہمارے لیے آخری حصہ ثابت ہوگی۔ خطرے کے وقت محلے کی عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پناہ مل سکے گی اور ہم اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کر ان کی حفاظت کر سکیں گے۔ آپ اس جوبی کے اندر اور باہر اپنا مورچہ دیکھ چکے ہیں۔ اب وہ لاکھ عمل سن لیں جس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہوگا۔ خطرے کے وقت سب سے پہلے محلے کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر پہرہ دینے والے رضا کا دقتارے بجائیں گے۔ اس وقت آپ کو چاہیے کہ آپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اچھی سے سمجھا دیں کہ وہ کسی جزا کی مظاہرہ نہ کریں اور دقتارے کی

آواز سنتے ہی اس جوبی کے رہائشی مکان میں جمع ہو جائیں۔ یہاں اتنی جگہ ہے کہ محلے کی تمام عورتیں اور بچے سما سکیں۔ دقتارے کی آواز کے سنوڑی ویر بعد جوبی کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آج دوسرے بعد ہم اس کی مشق بھی کریں گے۔

شام سے قبل کسی دقت دقتارے بجائے جائیں گے اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی غیر متوقع صورت حالات کا سامنا کرنے کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں۔ دن کے وقت عورتیں اور بچے اپنی اپنی جگہ پناہ دیکھ لیں گے۔ اور اس کے بعد رات کو کسی وقت یہ مشق دوبارہ کی جائے گی۔ ایک مرمیہ آدمی نے اٹھ کر سوال کیا۔ آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت بھی ہمارے بال بچوں کو اٹھ کر اس طرف بھاگنا پڑے گا؟

معظم علی نے جواب دیا۔ ہاں لیکن رات کے اندھیرے میں وہ بھاگ نہیں سکیں گے انہیں تاریک گلیوں سے گزر کر یہاں پہنچنا ہوگا۔ جوبی کے اندر صرف چند منٹ کے لیے مشطیں جلائی جائیں گی تاکہ وہ اپنی اپنی جگہ پناہ دیکھ سکیں :

ایک اور آدمی نے اٹھ کر کہا: لیکن یہ تو عجیب بات ہوگی۔ عورتیں اور بچے رات کے وقت یہاں کیسے پہنچیں گے؟

تیسرا بولا: ہم آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن رات کے وقت عورتوں اور بچوں کا یہ قاشا ٹھیک نہیں ہوگا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دشمن صرف دن کے وقت حملہ کرے گا تو میں اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ تکلیف دینا ناگوار کرتا۔ لیکن موجودہ حالات میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ رات کے وقت اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو بھی ہمیں یہ مشق ضرور کرنی چاہیئے میں جانتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیش لوگ روز آؤں سے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ چند برس میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہر کئی بار لٹ چکے ہیں اور مافیت پسند لوگ نے وہ مصائب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

تیرہ بٹے بھاگ گئے۔ "کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اس نے ایک رضا کار کو گردن سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "تفصیل سے اترنے کی اجازت کس نے دی۔ جاؤ پلٹے مورچے میں؟"

نوجوان مرعوب سا ہو کر دوبارہ لڑائی کی میزبانی سے تفصیل پر چڑھ گیا۔ دوسرے رضا کار تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے۔ معظم علی غضب ناک ہو کر چلایا: "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اپنے مورچوں میں؟"

وہ بادل ناخواستہ دوبارہ اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ لیکن ان کے آگے باقی ساری تفصیل کے مورچے خالی ہو چکے تھے اور دروازے کی سمت لوگوں کے نعرے برآں بلند ہو رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے لوگوں کا جھوم تھا۔ معظم علی کو دیکھ کر ایک رضا کار نے بلند آواز میں کہا: "ہماری فوج کو فتح ہوئی ہے۔ مرے اب اس طرف نہیں آئیں گے۔ اب آپ کو اس محلے کی ضرورت نہیں رہنی چاہیے۔"

معظم علی نے کہا: "اگر فتح کی خبر سننے کے بعد تمہاری افواہی کی یہ حالت ہے تو مجھے اب زیادہ فخر مند ہونا چاہیے۔ فتح کی خبر کون لایا ہے؟"

رضا کار نے جواب دیا: "اشرف خاں شاہی محل سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا۔ ہم گلی کا دروازہ بند کر چکے تھے۔"

اور نہ تو دروازہ کھول دیا؟

ہاں۔

لیکن میری ہدایت تھی کہ جب تک دوسرا نقارہ نہ بجایا جائے۔ گلیوں کے دروازے نہ کھولے جائیں۔

لیکن وہ فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔

معظم علی نے کہا: "تو جیسے اہم کبھی کبھی بڑی سے بڑی فتح کو شکست میں بدل دیتے

ہیں۔ اگر مجھے وہ اختیارات ہوتے جو فوج کے ایک انٹر کوپسے ماتحت سپاہی پر ہوتے تو میں تمہیں بدترین سزا دیتا۔"

دوسرے رضا کار نے کہا: "لیکن جناب اب تو کوئی بھی اپنے مورچے پر نہیں بگیوں کے تمام پہ پیار ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہیں۔"

معظم علی لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند بچے اور عورتیں جن کے لیے اندر یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ڈیوڑھی کی دیواروں کے ساتھ مٹتی ہوئی تھیں۔ باہر اشرف خاں کے گرد لوگوں کا جھوم تھا اور وہ ان کے سامنے جنگ کی ایسی تفصیلات بیان کر رہا تھا جن کا واقعات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاہی محل کے ایک سپاہی نے صرخت مارتا تھا کہ مرے پسا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ بنگال کی افواج میدان میں دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگنے کے بعد سرحد کے پار ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔

چند عورتیں یہاں بھی جھوم کے درمیان پھنسی ہوئی تھیں اور بچے بلبل رہے تھے۔ معظم علی نے لوگوں کو ماتحت کی اور وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

اشرف خاں، معظم علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے کہا: "جناب آپ فتح کی خبر سن چکے ہیں؟"

"میں سن چکا ہوں۔ اور اب میں آپ لوگوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ہٹ جائیے چند خواتین ڈیوڑھی کے اندر پھنسی ہوئی ہیں۔"

معظم علی یہ کہہ کر واپس مڑا اور اس نے حسین بیگ کے ایک نوکر کو اجی بنگ ڈیوڑھی کی چھت پر اپنے مورچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نقارہ بجانے کے لیے کہا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا: "اب نقارہ بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو یوں بھی سب لوگ چھٹی کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندر مٹی صحن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا جھوم تھا۔ معظم علی

کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا جھوم تھا۔ معظم علی

جمال خاں بھاگ کر باہر نکلا۔ لیکن چند منٹ تک وہ واپس نہ آیا تو معظم علی نیچے اتر آیا جب وہ باہر نکلا تو جمال خاں اور صابر واپس آتے دکھائی دیے۔

معظم علی نے کہا: "بہت دیر لگائی تم نے کیا بات تھی؟"

جمال خاں نے جواب دیا: "جی کچھ نہیں ملے کے چند لڑکے صابر کے ساتھ لڑ رہے تھے،

میں پسپا تو وہ بھاگ گئے۔"

کیا بات تھی صابر؟"

صابر نے جواب دیا: "جی وہ آپ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہوں نے مرزا صاحب کے

متعلق بھی بہت دہشت باتیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نے لوگوں کو یوقف بنایا تھا اور مرزا

صاحب کے ساتھ کسی بخوی نے مذاق کیا تھا۔ ان باتوں پر مجھے غصہ آگیا۔"

"میں جانتا ہوں جو کچھ انہوں نے کہا ہوگا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"جی نہیں ذرا گھیر پھوٹ گئی ہے۔ لیکن میں نے درد کوں کو خوب پیشا ہے۔"

"بہت برا کیا تم نے۔ بڑوں کو کچھ کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیے؟"

"جناب وہ بچے کہاں تھے، ایک تو مجھ سے بھی آدھرا ہشت اونچا تھا۔"

"اچھا اب آرام کرو اور آئندہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو تمہیں مرنے کی ضرورت نہیں۔"

انہیں دیکھ کر لوٹ آیا اور دروازے کے پاس ہی چھپرے کے نیچے پڑی ہوئی ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسین بیگ کا ایک نوکر باہر نکلا اور معظم علی نے اس سے پوچھا: "مرزا صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت کتب خانے میں ہیں۔"

"اچھا اب تم خواتین سے کہو کہ ان کے لیے راستہ خالی ہو رہا ہے۔"

"بہت اچھا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو بندوقیں اسلحہ خانے سے تقسیم کی گئی تھیں

ان کے متعلق کیا ہدایت ہے؟"

معظم علی نے کہا: "ابھی انہیں رضا کاروں کے پاس رہنے دو؟"



تھوڑی دیر بعد محلے کے ہر گھر میں مرزا حسین بیگ کے متعلق اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"مرزا حسین بیگ کو کسی بخوی نے بنایا تھا۔ مرنے سے پہلے تمہارے محل پر حمل کریں گے۔"

"اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو اس کے گھر میں گھس گئے ہیں۔ حسین بیگ ایک سیہ سارہ

آدمی ہے اور محمود علی کے لڑکے نے اسے یوقف بنایا ہے۔"

رات کے وقت فتح کی خوشی میں محل کی ہر گلی میں چراغ جلانے جا رہے تھے۔ جلک سیڑ

کے محل میں آتش بازی چلائی جا رہی تھی۔ حسین بیگ کے محل میں بھی چراغاں ہو رہا تھا۔ بازار

اور گلیوں میں جل جل رہی تھی۔ معظم علی عشا کی نماز کے بعد اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا گذشتہ چند

دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ جمال خاں نیچے صحن میں اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک

معظم علی کو گلی میں شور مچا دیا اور اس نے اوپر سے آواز دیا:

"صابر! صابر!"

جمال خاں نے جواب دیا: "جی صابر ابھی باہر گیا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "اچھا تم جا کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے؟"

## تیسرا باب

اگلے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ معظم علی صبح کا ناشتہ کھا کر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے قریب حسین بیگ کا نوکر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ مرزا صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

معظم علی عمل میں بیٹھا، حسین بیگ دیوان خانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی کہا: "آؤ بیٹا میں ابھی شاہی محل کے ناظم اور مرشد آباد کے ذمہ دار سے مل کر آیا ہوں۔ فوج کی خبر درست ہے۔ ہماری افواج نے کوٹے پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ مرہٹوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے کوٹے اور اس پاس کی بستیوں میں خوراک کے تمام ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور فوج کا سامان رسد بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج مرشد آباد سے اناج بیسیا جا رہا ہے۔ مرتبے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد کوٹے سے چند میل پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ابھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس چلے جائیں گے یا کوئی اور محاذ تلاش کریں گے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ مرشد آباد کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمہیں محلے کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لوگ بچتے رہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ فوج کے واپس آجانے پر بھی اپنی جوی کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کا کام جاری رکھیں گا۔ برسات کے بعد برونی فصیل کی مرمت کی جائے گی اور اندرونی دیوار کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے گا۔ اور یہ سارا کام تمہاری مرضی کے مطابق

ہوگا۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میں لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہوں اور میرے نزدیک مرشد آباد کا خطرہ کم نہیں ہوا۔ کوٹے سے فرار ہونے کے بعد مرہٹے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بنگال کا کوٹن شہر ایسا ہے جس پر وہ آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں اور جہاں سے انھیں زیادہ سے زیادہ مال غنیمت مل سکتا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ان کا ہدف مینڈا پور یا کلک ہوگا یا وہ مرشد آباد کا رخ کریں گے۔ ان کے لیے مرشد آباد پہنچنا نسبتاً مشکل ہوگا۔ لیکن اگر انھوں نے مرشد آباد کی دولت کا دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا تو وہ شکلات کی پروا نہیں کریں گے۔"

حسین بیگ نے کہا: "مرشد آباد کی دفاعی حالت اتنی کمزور نہیں۔ فوج اگرچہ یہاں کافی نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ بیرونی حملہ آور کو ایک دو دن بھی روک نہ سکے۔ پھر علی وردی خاں اتنا نادان نہیں کہ وہ مرشد آباد کو خطرے میں دیکھ کر کوٹے میں بیٹھا رہے۔ اگر مرہٹوں نے اس طرف کا رخ کیا تو علی وردی خاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ جائے گا۔"

معظم علی نے کہا: "اور یہی بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ دشمن کو اگر مرشد آباد کا رخ کرنے میں کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ صرف علی وردی خاں کی توجہ دوسرے محاذ پر منبذول کرنے کے لیے چند دتے مرشد آباد کی طرف روانہ کر سکتا ہے۔ دارالحکومت کو خطرے میں دیکھ کر علی وردی خاں ایک لمحہ کے لیے بھی کوٹے میں ٹھہرنا گوارا نہیں کریں گے۔ بیشک ان کے یہاں پہنچ جانے سے مرہٹوں کا جھگ جانا یقینی ہے۔ لیکن مرہٹوں کی باقی فوج کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر مینڈا پور پر قبضہ کر لے گی اور اس کے بعد بروان کا سارا علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

حسین بیگ نے دل برداشتہ ہو کر کہا: "تو پھر علی وردی خاں کو کیا کرنا چاہیے؟ تمہارا خیال ہے کہ اگر مرہٹوں کا کوئی شہر مرشد آباد پہنچ جائے تو اسے ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے؟"

نہیں چچا جان، میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی وردی خاں کے سالاروں نے اسے صحیح مشورہ

دیا تو اس فتح کے بعد مرہٹوں کو کسی اور محاذ کا رخ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ میرے خیال میں یہی چند دن ایسے ہیں جب مرہٹوں پر ضرب کاری لگائی جاسکتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا: اچھا بتاؤ اگر تم علی وردی خان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟  
منظم علی مسکرایا اور اس نے قدمے وقت کے بعد کہا: میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو اس فتح کے بعد ایک لڑائی کے بغیر ان کا تعاقب جاری رکھتا۔ میں کٹھن میں پڑاؤ ڈال کر مشرکوں اور دوسرے شہروں سے سامان رسد کا انتظار کرنے کی بجائے اپنے بھوکے سپاہیوں سے یہ کہتا کہ ہمارے پاس رسد کی کمی ہے۔ لیکن ہم مرہٹوں سے اناج کے وہ ذخیرے چھین سکتے ہیں جو انھوں نے اس علاقے کو لوٹ کر جمع کیے ہیں۔ اس صورت میں مرہٹوں کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسد ہوتا۔ مرہٹے کسی منظم فوج کے سپاہی نہیں رہتے ہیں۔ ان کی لڑائی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک محاذ سے نقصان اٹھانے کے بعد جانی حملے کے لیے ہمیشہ کوئی نیا محاذ تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا مقابلہ چوکس ہو تو وہ تیاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے صلح کی بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ان پر غیار کا وقت ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کٹھن میں فتح کا جشن منایا جا رہا ہو گا۔ انعامات اور فطرتیں تقسیم ہو رہی ہوں گی۔ اور مرہٹے چند مہینوں میں دوبارہ اپنے پڑاؤ میں کسی نئے محاذ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ پھر رسد کا سامان پہنچے گا۔ سپاہی اور ان کے چند دن خوشیاں منائیں گے۔ پھر جنگ کی تیاری ہوگی اور یہی ہو چکا ہے کہ کچھ ہفتوں بعد صلح کی بات چیت شروع کر دی ہو اور جس دن یہ بات چیت ختم ہو۔

علی وردی خان کو یہ اطلاع ملے کہ مرہٹوں کی فوج کا ایک حصہ کٹھن سے پچاس یا سو کوس دور ہمارے کسی اور علاقے یا شہر میں لوٹ مار شروع کر چکا ہے۔ مجھے علی وردی خان کی سپاہیاد صلاحیتوں کا اعتقاد ہے۔ لیکن میں ایک حکمران کی سیاسی مصیبتوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کی فوج کی ذہنی کٹھن سے کٹھنوں دور مرہٹوں کا تعاقب کر رہی ہوتی۔ ان کے رسد اور بلوڈ کے حوالہ سے ان کی قوتیں ہمارے قبضے میں ہوتیں پھر ہمارے صلح کے لیے اپنی بیعت تو میں

یہ جواب دیتا کہ صلح کی بات چیت صرف بنگال کی سرحدوں سے باہر ہو سکتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا: لیکن میرا دل، علی وردی خان کے ساتھ ہے اور تم ہمیشہ یہ کہتا کرتے ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند سپاہی ہے!

منظم علی نے جواب دیا: وہ لائق ہماری فوج کے تمام جرنیلوں سے زیادہ دوامدائش ہیں لیکن میدان جنگ سے باہر علی وردی کے نزدیک ایسے لوگوں کی اہمیت عام طور پر کم ہو جاتی ہے۔ دیوار میں وہ میر جعفر اور دلہ راجہ جیسے خوشامدوں اور جی حنفیوں کی باتیں زیادہ غور سے سنتے ہیں۔

حسین بیگ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: ہاں منظم آج صبح چند آدمی بندو قیں واپس کرنے آئے تھے۔ لیکن میں نے انہیں یہ کہا کہ جب تک فوج واپس نہیں آتی یہ تمہارے پاس امانت رہیں گی۔ تم بھی یہی چاہتے تھے نا؟

• جی ہاں •

لیکن اب تمہارے رضا کار پریڈ کے لیے آنا تو شاید پسند نہ کریں!

پریڈ کی اب ضرورت نہیں وہ ابتدائی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب صرف رات کے وقت محلے میں پہرہ دینے کی ضرورت ہے۔ فتح کی خبر سننے کے بعد ایسی باتوں سے لوگوں کی دلچسپی ذرا کم ہو گئی ہے۔ لیکن دو چار دنوں کے بعد وہ پھر شہر کے ساتھ میری باتیں سننے لگ جائیں گے۔



شام کے وقت بارش ہو رہی تھی۔ مرشد آباد کے قائم مقام فوجدار کے ہاں شہر کے چند روسا اور سرکاری عہدہ داروں کی دعوت تھی۔ جب مہمان ایک کٹہرہ کمرے میں دسترخوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے فوجدار سے مرزا حسین بیگ کی غیر ماضی کی دہ دریاہفت کی۔  
فوجدار نے جواب دیا: ان کا پیغام آیا ہے کہ ان کی طبیعت خفیک نہیں۔



سے مورچے تعمیر کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا بانس گولی روک سکتے ہیں؟  
فوجدار نے جواب دیا: بانس گولی نہیں روک سکتے لیکن گولی چلانے والوں کو آگے بڑھنے  
سے روک سکتے ہیں۔ میں نے خود مرزا صاحب کی حویلی کے دفاعی انتظامات دیکھے ہیں۔ اور  
وہاں مجھے کوئی بات مفصلہ خیز نظر نہیں آتی۔ ان کا عمدہ شہر سے باہر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ  
خطرے کے وقت اس محلے کے لوگ شہر کے لوگوں کی نسبت کم محفوظ نہیں ہوں گے۔  
ایک نوکری سے قدم اٹھاتا ہوا فوجدار کے قریب پہنچا اور اس نے جب کہ اس  
کے کان میں کچھ کہا۔

فوجدار نے دسترخوان سے اٹھتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا اور کہا:  
"آپ اطمینان سے کھانا کھائیں، میں ابھی آتا ہوں۔"  
فوجدار کمرے سے باہر نکلا تو پتا دے میں ایک فوجی افسر کھڑا تھا۔ اس نے سلام کے  
بعد کہا: "جناب معاف کیجیے میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن خبر بہت تشویشناک  
ہے۔ مرہٹوں کی ایک فوج یلغار کرتی ہوئی مرشدآباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔"  
فوجدار نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کلمہ فرعون لایا ہے؟  
"ابھی راستے کی ایک چوکی کا کمانڈر میاں پہنچا ہے اور وہ یہ کہتا ہے پھیلی چوکیوں کے  
سپاہیوں نے ڈاک گھوڑوں پر زخراں تک پہنچائی تھی۔ میں نے تصدیق کے لیے سپاہیوں  
کا ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔"

"اور خبر لانے والا کہاں ہے؟"  
"جی میں اسے محل کے ناظم کے پاس بھیجواؤں گا۔ وہ تھکاوٹ سے تھکا ہوا تھا۔ اس  
نے صبح سے لے کر شام تک گاڑا سفر کیا ہے اور راستے میں کئی گھوڑے تبدیل کیے ہیں۔ وہ  
کہتا ہے کہ جب میں اپنی چوکی سے روانہ ہوا تھا۔ تو مرہٹے صرف ایک منزل پیچھے تھے۔ اور اب  
یہاں سے شاید دو یا تین منزل دور ہوں گے۔"

ایک شخص نے کہا: "جناب مرزا صاحب آجکل یوں بھی اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے۔  
دوسرا بولا: "بھئی جب گھر میں کام ہو تو باہر نکلتے کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا صاحب  
آجکل بہت مصروف ہیں۔ آپ ان کی حویلی کے اندر جا کر دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔"  
ایک اور آدمی فوجدار سے مخاطب ہو کر بولا: "جناب اگر آپ مرزا صاحب کو یہ یقین دلاتے  
کہ اب مرشدآباد کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ ضرور تشریف لاتے؟"  
فوجدار نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا بیگ  
پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

شہر کے ایک تاجر نے کہا: میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے محلے کے لوگوں کو رات بھر سونے  
نہیں دیتے۔"

مرشدآباد کا کووال بولا: "مرزا صاحب ایک سیدھے سادے بزرگ ہیں۔ لیکن ان کے  
محلے کا ایک فوجوان ان کے ساتھ دل لگی کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ان کے محلے سے گزر رہا تھا۔  
انہوں نے مجھ سے بھرے ہوئے کئی پھکڑے ان کی حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی  
سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اندر مورچے بھرا رہے ہیں۔"

"بانس کے مورچے؟ ایک امیر زادے نے کہا: آپ کے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا؟  
"جی نہیں آپ مرزا صاحب کی حویلی دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد حسین بیگ اس محل کی گفتگو کا واحد موضوع بن چکا تھا۔ اور قریباً ہر شخص اس گفتگو  
میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوجدار ایک سنجیدہ آدمی تھا اور اسے یہ باتیں ناگوار محسوس ہو  
رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا لیکن جب مہمان زیادہ بے تکلف ہو کر حسین بیگ کا مذاق اڑانے  
لگے تو اس نے کہا: "مرزا صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس محل میں انھیں  
موضوع بحث بنایا جائے۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا: "جناب مرزا صاحب کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن ہمارے

”اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ تم جا کر شہر میں منادی کرو دو!“

افسوسہ سلام کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

فوجدار دوبارہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا۔

کسی نے سوال کیا جناب کیا بات تھی؟

فوجدار نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا: کچھ نہیں۔ ایک سرکاری کام تھا۔ آپ اطمینان

سے کھانا کھائیں۔

لیکن جہان کھانے سے زیادہ فوجدار کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر فوجدار دسترخوان سے اٹھا اور اس نے کہا: سحرات مجھے کچھ کام ہے اس

یلے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن آپ آرام سے باتیں کریں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔

ایک امیر زادے نے سوال کیا۔ آپ اس بارش میں کہاں جا رہے ہیں؟

فوجدار نے جواب دیا: ایک سپاہی کو بارش میں چلنے کا عادی بنانا ہے۔ مجھے ابھی خبر

ملی ہے کہ مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔

مجلس پرستانہ چھایا اور حاضریں بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

فوجدار نے کہا: لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی یہاں سے کئی منزل دور

ہیں۔ اگر انھوں نے انتہائی کوشش کی تو بھی کل صبح یا دوپہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔

فوجدار باہر نکل گیا۔

چند ثانیے بعد معزز جہانوں کی افزائش کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے اپنے جوتے پہنانا بھی

مشکل تھا۔ کوئی اپنے جوتوں کی بجائے کسی اور کے جوتے پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بدحواسی کی

حالت میں دائیں پاؤں کے جوتے میں بائیں پاؤں کے جوتے دایاں پاؤں ڈال رہا تھا،

پھر مکان سے نکلنے کے بعد ان میں سے اکثر برسوں کے بعد پہلی بار بھاگنے کی مشق

کر رہے تھے۔



توڑی دیر بعد مرشد آباد کے ہر گلی کوچے میں مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر مشہور ہو چکی

تھی۔ مرزا حسین بیگ کے محلے کی عورتیں بچے ہڑے اور جوان بوسلا و حار بارش میں اس

کی حویلی کا رخ کر رہے تھے۔ ایک ساعت کے اندر اندر ہائشی مکان کی پختی منزل اور پلانچا

کے کردوں اور پاموں میں تو دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بسین لوگ افزائش کے عالم میں

بارش سے بچنے کے لیے چار دیواری سے باہر نکلے اور چار دیواری کے گوشوں کی کونوں

اور گھونروں کے اٹھل میں پناہ لے رہے تھے۔

مظلم علی محلے کی گلیوں کے ناکے دیکھنے اور سپرو وادوں کو ضروری ہدایات دینے کے

بعد پانی اور کپڑے لت پت حویلی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے اندر دو مشعلیں مل رہی تھیں اور

حسین بیگ چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔

مظلم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: فوجدار کی طرف سے کوئی

جواب آیا ہے؟

”ہاں یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی خطرہ

پیش آیا تو اہل شہر کو خبردار کرنے کے لیے توہیں چلا دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے

کہ مرہٹہ دستوں کی قیادت میر صیب کر رہا ہے۔“

مظلم علی نے کہا: آپ اندر جا کر آرام کریں۔ میں گلیوں کے تمام ناکے دیکھ لیتا ہوں۔

ہمارے انتظامات بہت تسلی بخش ہیں۔

حسین بیگ نے کہا: ”اگر آج رات اس گھر کی چار دیواری کے اندر کوئی آرام کر سکے تو

میں یہ کہوں گا کہ وہ عشر کے دن بھی اطمینان کی نیند سو سکے گا۔ ذرا جا کر دیکھو، تمہیں یقین

نہیں آئے گا کہ انسان اتنا شرمچا سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ روئے زمین کے

تمام ہنگامے میرے گھر کی چار دیواری کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے ہوسے خاندان کو

ایک ہی کمرے کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے مردوں کو عورتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ایک دروازے سے نکلے ہیں اور دوسرے دروازے سے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ معظم علی نے کہا: چچا جان میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ آدھ گھنٹے کے بعد آپ کسی کی آواز نہیں سنیں گے۔ آئیے میرے ساتھ !

حسین بیگ نے کہا: نہیں میں آدھ گھنٹے کے لیے اندر جانے کی بجائے ساری رات یہاں کھڑا رہنا آسان سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اندر جا کر کسی کا گلا گھونٹ دوں گا۔ معظم علی نے ڈیڑھ سی میں جمع ہونے والے مسلح رضا کاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

تم دروازہ بند کرو اور میرے ساتھ آؤ!

رضا کاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ معظم علی موسلا دھار بارش میں حویلی کے اندرونی صحن کی طرف بڑھا۔ حسین بیگ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر جھانکنا ہوا ان کے ساتھ جا ملا۔ رہائشی مکان کے برآمدوں اور کمروں میں ایک طوفان حشر پھا تھا۔ حسین بیگ کے نوکر جگمگ مشطیں لیے کھڑے تھے۔

مستم علی برآمدے میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ بند کر کے چلایا۔ خاموش! خاموش!! برآمدے میں اس کے پاس چند لوگ خاموش ہو گئے لیکن مکان کے باقی حصوں میں چیخے مچاتے انسانوں کے جہوم کو اس کی آواز متاثر نہ کر سکی۔

مستم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: آپ اوپر جا کر دیکھیں اگر بالائی منزل میں جا رہے تو عورتوں اور بچوں کو وہاں بھیج دیا جائے۔

حسین بیگ نے جواب دیا: بالائی منزل پر عورتوں اور بچوں کے لیے کافی جگہ ہے لیکن مردوں کی بدتمیزی دیکھ کر میں نے میرے ہی کے دروازے پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں سے بسے وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔

آپ تالا کھول دیں۔ میں انھیں سمجھاؤں گا۔

تم پہلے تسلی کر لو ورنہ یہ دروازہ کھلتے ہی بیٹروں کے ریوڑ کی طرح اوپر بھاگے کی کوشش کریں گے۔ خدا کے لیے انھیں خاموش کرو۔ ورنہ میں واقعی کسی کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔ یہ ابھی خاموش ہو جائیں گے۔

مستم علی نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے بندوق کی اور صحن کی طرف منظر کے ہوا میں فائر کر دیا۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر کے ہر گوشے میں سناٹا چھا گیا۔ معظم علی نے لوگوں کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا:

”بھائیو اور بہنو! ابھی دشمن کی میل دور ہے اور صبح تک مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطو

نہیں۔ ہم نے تمہاری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر تمہاری افواہ پڑی کا یہی عالم رہا تو تمہارے محافظوں کے لیے یہ چیخ پکار اور یہ فطری دشمن کی گولیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی میں تمہیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اگر کسی نے میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو اسی حفاظت حملے ڈنٹے نہیں ہوگی۔ حملے اس حویلی سے باہر نکال دیں گے۔

میری ہدایات یہ ہیں۔ وہ تمام آدمی جن کی عمر پچاس سال سے کم ہے۔ فوراً باہر نکل آئیں انھیں میری صحن کی کوٹھڑیوں میں جگہ دی جائے گی۔ خواتین جن کے ساتھ کم سن بچے ہیں بالائی منزل کے کمروں میں چلی جائیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور عرسیدہ یا بیمار لوگ دولان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جن خواتین کو بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہ مل سکے وہ پختی منزل کے باقی کمروں میں رہیں۔

حملے کے وقت جو لوگ ٹھنڈے کے قابل ہوں اور جن کے پاس کوئی ہتھیار ہو وہ رضا کاروں کیساتھ شامل ہو جائیں اور باقی یہاں آجائیں۔ اگر بارش تم گئی تو وہ اندرونی صحن کے مورچوں میں پناہ لے سکیں گے۔ ورنہ برآمدوں اور پختی منزل کے کمروں میں ان کے لیے کافی جگہ ہوگی۔ دس منٹ کے بعد میں مکان کے تمام کمروں کا معائنہ کروں گا۔ اگر مجھے معلوم ہوگا کہ کسی نے جان بوجھ کر

اتنی دیر میں ان کے کئی اور ساتھی اس محلے میں جمع ہو چکے تھے۔ مرہٹوں نے اچانک مشرقی سمت میں جوبی کے قریب ایک دو منزلہ مکان کی چھت سے فائر شروع کیے تو اس طرف فسیل کے محافظ ان کی گولیوں کی زد میں تھے۔ چند رضا کار زخمی ہوئے اور باقی بندوق سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے مورچوں میں دھب گئے۔ مرہٹوں کے چند دستوں نے اس موقع پر فساد سے فائدہ اٹھایا اور اچانک گلیوں اور مکانوں سے نکل کر فسیل کے اس حصے پر دھاوا بول دیا۔ ان کے چند آدمیوں نے فسیل کے ساتھ ہنس کی سیڑھیاں کھڑی کر دیں اور ان کی آگ میں کوئی پچاس آدمی فسیل پر پہنچ گئے۔ فسیل کے محافظ اس پاس کے مورچوں سے نکل کر اس طرف بڑھے۔ لیکن مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سامنے ان کی پیش نہ گئی چند منٹ دست بردست لڑائی کے بعد مرہٹے فسیل کے مشرقی حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور جوبی کے محافظ صحن میں جمع ہو کر انھیں نیچے اترنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مظلم علی ڈیوڑھی کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک رضا کار سے کہا "پسپائی کے لیے نقابہ بجا دو۔"

رضا کار نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیرونی فسیل کے محافظ نقارے کی آواز سننے ہی اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ مشرقی دیوار کے نیچے لانے والے رضا کاروں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر مرہٹے انھیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مظلم علی جلدی سے نیچے اترا اور آٹھ دس فوجیوں کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس حملے کی شدت نے مرہٹوں کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور رضا کار ایک مظلم طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

مرہٹوں نے اپنی فتح یقینی سمجھ کر چند آدمیوں کے ہرج مکھ کو زیادہ اہمیت نہ دی اور انھوں نے آگے بڑھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ قریباً آٹھ سو مرہٹے سیلاب کے ریلے کی طرح بیرونی صحن میں داخل ہوئے۔ لیکن اس عرصہ میں اندرونی اور بیرونی چار دیواری کے درمیان کا وسیع

سیری دیاریات پر نہیں کیا تو اسے کسی اچھے سلوک کا متحن نہیں سمجھا جائے گا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تمام مشعلیں بجادی جائیں گی۔ میں آپ کی تسلی کے لیے پھر ایک بار یہ اعلان کرتا ہوں کہ صبح تک حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہیں۔ اس وقت ہماری ساری توجہ جوبی کے دفاعی انتظامات پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اور میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ میں پریشان نہیں کریں گے۔

قریباً پون گھنٹہ کے بعد جوبی میں مکمل سکون تھا اور مظلم علی حسین بیگ سے کہہ رہا تھا "چچا جان اب آپ اوپر جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔"

حسین بیگ نے جواب دیا: "میتا میں صحن سے گھبراتا تھا۔ اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ میں رضا کاروں کے ساتھ باہر کی فسیل پر پہرہ دینا چاہتا ہوں گا۔"



اگلے دن دس بجے کے قریب میرے صیب کی قیادت میں مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کے ضلعاً میں ٹوٹ مار کر رہا تھا۔ حملہ آور فوج کے ایک دستے نے حسین بیگ کے محلے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گلی کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑے دیر بعد چند اور دستے آگئے اور انھوں نے ایک گلی کے ناکے کے آس پاس چند مکانات کی چیتوں پر قبضہ کر کے رضا کاروں کو پیچھے مٹادیا اور محلے کے اندر داخل ہو گئے۔ محلے کی گلیاں اور مکانات خالی دیکھنے کے بعد انھوں نے حسین بیگ کی جوبی کی طرف توجہ کی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اچانک ڈیوڑھی کی چھت اور فسیل کے مورچوں سے گولیاں برسنے لگیں اور وہ گلی میں چند لاشیں چھوڑ کر اس پاس کے مکانات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کے ایک اور دستے نے دوسری طرف سے فسیل کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن جوبی کے محافظوں نے اسے بھی مار کر پیچھے مٹادیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہ آس پاس کے مکانات کی چیتوں پر لیٹ کر گولیاں چلاتے رہے۔

محاطہ حویلی کے محافظوں سے خالی ہو چکا تھا۔ مرہٹہ لشکر کا ایک سردار چلایا: "بہادر! ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیوار پھاڑ کر اندر داخل ہو جاؤ!"

سپاہیوں نے کسی وقت کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن چند منٹ بعد وہ اپنے ساتھیوں کو خندق میں گرفتار دیکھ کر انتہائی بے چارگی کی حالت میں چلا رہا تھا۔ یہ مکان نہیں تھوڑا ہے۔ ہم نے مفت میں اتنی جائیں گزوائی ہیں۔ دروازے کی طرف بڑھو!"

اندر دنی صحن کا دروازہ مرہٹوں کے بے پناہ جہم نے ایک ہی دھکے میں توڑ دیا۔ وہ فرخ کے نعرے لگاتے ہوئے ایک سیلے کی بیڑی کی طرح آگے بڑھے۔ اندرونی دروازے اور داخلی مکان کے درمیان کشادہ صحن کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں ایک کھائی تھی۔ جس کے دونوں سرے خندق سے ملے ہوئے تھے۔ اس کھائی کے اندر ساتھ دھڑا کارپنے توغرسالا کی آواز کے منظر تھے۔ کھائی کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے خیوں کے اندر توپیں نصب تھیں جن کا مورخ دروازے کی طرف تھا۔

حملہ آور لشکر کا سردار کھائی سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ بند کر کے چلایا: "لشکر! اور مرہٹوں کا جہم رک گیا۔"

مرہٹہ سردار نے قدرے وقت کے بعد کہا: "اب معاملے سے کوئی فائدہ نہیں تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر مورچوں سے باہر نکل آؤ، ورنہ ہم ایک آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محلے کے تمام لوگ اس مکان میں جمع ہیں۔ اگر تم اپنی عورتیں کی عزت اور بچوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ..."

سالار اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ مکان کی چھت سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑا کر مرنے کے بل گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی صحن اور برآمدوں کے مورچوں۔ مکان کی چھت اور کھڑکیوں سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مرہٹے طیش میں آکر چند قدم آگے بڑھے اور پھر لٹے پاؤں دروازے کی طرف ہٹا گئے۔ اچانک یکے بعد دیگرے توپوں کے دو خوشنک دھماکے سنائی دیے اور

وہاں کے جیشدار ٹکڑوں نے دروازے کے سامنے کئی گرگجک لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس کے بعد حملہ آورا ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کو ہزاروں خندقوں اور کھائیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر دسیانی دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کے سوسے زیادہ آدمی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ قریباً دو گھنٹے اور گزر گئے اور حویلی کے محافظوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ٹوٹے ہوئے دروازے کے قریب دیوار کے عقب سے سفید جھنڈا نمودار ہوا۔ اور کسی نے بلند آواز میں کہا:

"ہم صلح کی بات چیت کے لیے ایک آدمی اندر بھیجنا چاہتے ہیں:"

جب چند منٹ بعد اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو کسی نے دوبارہ کہا: "ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صلح کی بات چیت کے لیے ہمارا ایک آدمی اندر آ سکتا ہے یا نہیں؟"

مستظم علی صحن کے مورچے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جواب دیا: "تم ایک آدمی اندر بھیج سکتے ہو۔"

مرہٹہ فرخ کا ایک افسر سفید جھنڈا اٹھاتے دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور راستے میں بکھری ہوئی لاشوں سے بچ بچ کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ مستظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر رکا اور بولا: "ہمیں تمہاری تیاری کا علم نہ تھا اور ہم نے اپنی غلطی سے اتنا نقصان اٹھایا ہے لیکن تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم اتنا نقصان اٹھانے کے بعد غالی ہاتھ واپس پلے جائیں گے۔ مستظم علی نے جواب دیا: "ہمیں اس سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں کہ تم میں سے کوئی واپس نہ جائے۔"

مرہٹہ افسر نے کہا: "میں اس حویلی کے مالک کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں؟"

مستظم علی نے جواب دیا: "اس حویلی کا مالک ڈاکوؤں کے ساتھ بات کرنے کا عادی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ روپے کے عوض اپنی جانیں بچا سکتے ہو۔"

ہوتے ہی ان کے ساتھ چند اور دستے آئے۔ مغظم علی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ نئے محلے کے لیے رات کی تاریکی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندرونی دیوار کے پیچھے مرہٹوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس نے خندق کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگایا۔ شمالی دیوار کے قریب پہنچ کر اسے کچھ آہٹ سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ مرہٹے دیوار کے پیچھے زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ مشرقی دیوار کے قریب پہنچ کر بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ شمالی اور مشرقی دیوار کے ایک کونے میں آسم کے ایک بلند درخت پر چڑھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سینکڑوں آدمی دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضا کاروں کو خبردار کیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی دیواریں گرنے کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر وہ پچھلی منزل میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انھیں ہدایت کی کہ اب یہاں کسی عودت، بچے یا بیگاری آدمی کو نہیں رہنا چاہیے۔ وہ جن کے لیے بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہیں، چھت پر چلے جائیں۔ اگر مرہٹے یہاں تک آگئے تو تم میں سے ہر ایک کو اپنی بہنوں کے ناموس کی خاطر لڑنا پڑے گا۔ تھوڑی دیر بعد رضا کار مشرقی اور شمالی دیوار کے سامنے ریت کی بوریوں کے نئے مورچے بنارہے تھے۔

کوئی دس بجے کے قریب مرہٹوں نے جنوب اور مغرب کی سمت باہر کے مکانات کی چھتوں سے دوبارہ فائرنگ شروع کی۔ مغظم علی نے جھاگ کمریدان کے اندر ادباً تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضا کاروں کو یہ حکم دیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی طرف سے حملہ کرنے سے پہلے تھوڑا تو بدھری طرف مبذول کرنا چاہتا ہے تم اس فائرنگ کی پروا نہ کرو۔ مکان کی چھت سے چند آدمی دشمن کی گولیوں کا جواب دیتے رہیں گے لیکن باقی سب کی توجہ اس طرف رہنی چاہیے۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب یکے بعد دیگرے چند دھماکے سنائی دیئے۔ اور شمال اور مشرق کی دیواریں جن کی بنیادیں کھودی جا چکی تھیں۔ کئی جگہ سے گر پڑیں۔ دیواروں میں شکاف

تم نے ہماری جانوں کی قیمت بہت کم لگائی ہے۔ اور ہمارے پاس پرہوں کی بجائے گولیاں ہیں۔

ابھی طرح سوچ لو!

تم جانتے ہو!

مرہٹے افسر نے دسے وقت کے بعد کہا۔ تم نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے ہمارا لشکر شہر کے دوسرے محلوں میں مصروف ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو ہم ان سب کو یہاں لے آئیں گے۔

یہ جگہ کافی کشادہ ہے اور یہاں تمہارے تمام لشکر کی لاشیں سما سکتی ہیں۔ اور شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہماری فوج تمہارے پیچھے آرہی ہے!

میں معلوم ہے لیکن جب وہ یہاں پہنچیں گے تو ان کے سامنے صرف تمہاری قبریں کھنڈے کا کام ہوگا۔ ہم تمہیں آخری بار سوچنے کا موقع دیتے ہیں، یہی کے بعد تم مرشد آباد کے تمام خزانے ہماری قلموں میں ڈھیر کر کے تو جی تمہاری بات نہیں سنی جائے گی۔

تم ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہو۔ لیکن ہمارے پاس تمہارے لیے صرف گولیاں ہیں۔ تم جانتے ہو۔ ہم تمہارے محلے کا انتظار کر رہے ہیں!

چچا تئیں یہ وہ اسطاریں کرنا پڑے گا۔

مرہٹے افسر یہ کہہ کر مڑا اور سفید جھنڈا زمین پر پھینک کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں مرہٹوں نے اس پاس کے چند اونچے مکانات کی چھتوں سے فائرنگ شروع کر دی اور مغظم علی کے سامنے اس کے جواب میں عیثی کے رہائشی مکان کی چھت سے گولیاں برسانے لگی۔ غروب آفتاب تک بندوؤں کی یہ لڑائی جاری رہی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے فائرنگ بند کر دی۔ ان کے بیشتر آدمی ابھی تک عیثی کے بردن احاطے میں جمع تھے۔ شام

معظم علی نے برآمدے کے سامنے ایک مورچے سے باہر نکل کر بلند آواز میں کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ دشمن شہر خالی کر رہا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک چال ہو۔ تم اپنے مورچوں میں چوکس رہو اور میری ہدایات کا انتظار کرو۔ میں ادھر جا کر دیکھتا ہوں۔"

معظم علی تاریکی میں احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ کون ہے؟

"میں ہوں چچا جان! معظم علی نے حسین بیگ کی آواز پہچان کر جواب دیا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں تم سے مل چھٹا چاہتا ہوں کہ مرہٹوں نے اچانک گولہ باری کیوں بند کر دی۔ ہے؟ میرے خیال میں وہ واپس جا رہے ہیں۔ اور اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن میں ذرا چھت پر جا کر تلی کروں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

معظم علی کسی وقت کے بغیر زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پاؤں رکھتے ہی اسے ایک کونے سے ہندو چلنے کی آواز سنائی دی۔ چھت پر حسین بیگ کے اپنے نوکر دوں کا پھرا تھا اور وہ معظم علی کی ہدایات کے مطابق منڈیر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک چھت کے کونے میں کھڑا اطمینان سے اپنی ہندوق بھر رہا تھا۔ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے غضبناک ہو کر کہا: "بیوقوف اپنا سر نیچے رکھو!"

لیکن اس نے معظم علی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ہاتھ ہندوق بھرنے میں مصروف تھے اور نگاہیں صحن میں آسم کے ایک دخت پر لگی ہوئی تھیں۔ معظم علی کو کسی رضا کار یا حسین بیگ کے نوکر سے علم نہ ملنے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ہندوق کا دھماکا سنائی دیا اور گولہ سر کے بالوں کو چھوٹی ہوئی گزر گئی۔ معظم علی جلدی سے دیکھ کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اسے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی: "آپ ٹھیک ہیں نا؟"

پٹنے کی دیر تھی کہ مرہٹوں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اندر سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن حملہ آور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق عبور کرنے کے بعد بانس کی باڑ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ شدید نقصان اٹھانے کے بعد صحن کے اندر ادھر ادھر پھیل گئے اور زمین پر ریٹکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مرہٹوں کی فوج کے ایک حصہ نے براہ راست دروازے سے صحن پر بغیرا کرنے کی کوشش کی لیکن رضا کاروں نے انھیں صحن کے درمیانی مورچوں کے قریب نہ آنے دیا۔ توپوں سے پھر ایک بار کام لیا گیا اور مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد لڑائی کا سالانہ شمال اور مشرق کی طرف تھا۔ حملہ آوروں کے لیے رات کی تاریکی جس قدر فائدہ مند تھی اسی قدر نقصان دہ بھی تھی۔ وہ دیواریں توڑنے کے بعد اچانک حملہ کر کے حویلی کے محافظوں کی سرکشی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن رضا کاروں کی غیر متوقع مداخلت نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ تاریکی میں انھیں اپنے زخمی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی صحیح تعداد کا علم نہ تھا۔ تاہم گولیوں کی پوچھاڑ میں زخمی ہونے والوں کی جینیں ہر آن ان کی سرکشی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چند آدمی رستے کے مورچے توڑنے کے بعد مکان کے قریب پہنچ گئے لیکن تعدادوں، خجروں اور لاٹھیوں سے مسلح آدمیوں کا جھوم کھول اور برآمدوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند مرہٹے مارے گئے اور باقی پیچھے ہٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد چند حملہ آور مکان پر بغیرا کرنے کی بجائے صحن کے درختوں کی آڑے کر اور باقی گری ہوئی دیواروں کے پیچھے چھپ کر فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔



اُسی رات کو جب چاند مندار ہو رہا تھا۔ شہر کے مختلف گوشوں سے تعدادوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مرہٹے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے یردنی دروازے کی طرف سننے لگے۔ حویلی کے محافظ بندوؤں کے دھماکوں کی بجائے بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں کی آہٹ سن رہے تھے۔



”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن خودکشی کا اسان طریقہ یہ ہے کہ تم گولی کا انتظار کرنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے نیچے جھلا لگا دو۔“ یہ کہہ کر معظ علی نے جلدی سے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر نیچے بٹھایا۔

”یہ گولی سامنے کسی درخت سے آئی تھی؟“ معظ علی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”تم کون ہو؟“

اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر معظ علی نے کہا: ”تم ذرا نیچے چلی جاؤ۔ لوگوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔“

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور گھٹنوں کے بل ہو کر صحن کی طرف جھانکنے کے بعد اچانک ایک فائر کر دیا۔

معظ علی نے گردن اوپر کر کے صحن کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: ”تم ہوائیں فائر کر رہی ہو اور دیکھو گردن نیچے رکھو۔“

لڑکی نے کہا: ”اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو میرا نشانہ خالی نہ جاتا۔ اب وہ دوسری شاخ پر جا چکا ہے۔ یہ میری بندوق بھر دیکھیے اور مجھے اپنی بندوق دیکھیے۔ جلدی کیجیے وہ نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”یہ تو“ معظ علی نے اپنی بندوق آگے بٹھاتے کہا: ”تم اسے دیکھ سکتی ہو؟“

”ہاں۔“ لڑکی نے اٹھ کر نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔

”خدا کے لیے اپنا سر نیچے رکھو۔“ معظ علی نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں آخری بار آپ کی حکم مدلی کر رہی ہوں: لڑکی نے یہ کہہ کر بندوق چلا دی۔ صحن میں آہ کے درخت سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی۔

معظ علی نے کہا: ”اب تمھاری ضد پوری ہو چکی ہے۔ لیکن ایک مرہٹے کے لیے تمھیں اپنی

جان خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔“

وہاں ایک نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے دریچے سے چار آدمی درخت پر چڑھتے

دیکھے تھے۔ ایک کو میں نے دہلیز سے فائر کر کے گرایا تھا۔ دو بھاگ گئے تھے۔ اور یہ جو تھا

کمرے کے دریچے سے میرے نشانے کی زد میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے اور پانا پڑا۔“

معظ علی نے چاند کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے سر

پر سفید گڑھی تھی اور گلے میں بارود کا تھیلانگ رہا تھا۔ معظ علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس

نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

معظ علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا: ”تم فرحت ہو؟“

لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا: ”آپ نے مجھے گالیاں دی ہیں۔“

”مجھے کسی سپاہی سے حکم مدلی کی توقع نہ تھی۔ اور تمھیں بلاوجہ جان خطرہ میں ڈالنے سے

منع کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اگر تم خدا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

”میں آپ سے خدا نہیں ہوں۔“

معظ علی نے کہا: ”اب تم اطمینان سے نیچے جا کر سو جاؤ۔ اب مجھے کا کوئی خطرہ نہیں۔“

مرہٹے پسا ہو رہے ہیں۔ گلی سے ان کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔“

چھت کے پیریلر اٹھ اٹھ کر صحن کی طرف بھاگے۔ اور ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سناتے

گئے: ”مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔ مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔“

معظ علی نے بھری ہوئی بندوق فرحت کی طرف بٹھاتے ہوئے اپنی بندوق واپس لے

لی اور کہا: ”اب شاید آپ کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

فرحت کچھ کہے بغیر زینے کی طرف چل دی اور معظ علی نے رضا کاروں کی طرف متوجہ

ہو کر کہا: ”تم بہت غیر ذمہ دار ہو۔ اگر مرزا صاحب کی صاحبزادی اپنی بے احتیاطی کے باعث زخمی

ہو جائیں تو ہم انھیں کیسا منہ دکھاتے؟“

حسین بیگ کے ایک نوکر نے کہا: جناب ان کے لباس سے دھوکا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی رضا کار ہے۔

”لیکن کسی رضا کار کو بھی چھت پر کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تمھارا فرض تھا کہ تم انھیں بے احتیاطی سے منع کرتے۔“

حسین بیگ کے نوکر نے جواب دیا: ”ہم نے انھیں منع کیا تھا۔ لیکن انھوں نے ہماری طرف توجہ دینے کی بجائے اچانک بندوق چلا دی۔ اتنی دیر میں آپ پیچ گئے۔“

معظم علی نے اٹھ کر چھت کی چاروں طرف متوجہ ہو کر کہا: ”میرے خیال میں اب میدان خالی ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک مجھے حویلی کے باہر کے حالات کے متعلق تسلی نہیں ہوتی تب تک جو کس رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تک چند آدمی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد معظم علی پندرہ رضا کاروں کے ساتھ اندرونی صحن کے طول و عرض میں چکر لگانے کے بعد باہر کے احاطے میں پہنچا۔ حمد آدر و فخر جو چلے تھے۔ حویلی کے مختلف گوشوں میں دشمن کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور جگہ جگہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں، سر بٹے حسین بیگ کے اہل بل سے میں گھوڑے اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

معظم علی رضا کاروں کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا۔ قریباً ایک گھنٹہ محلے کی گلیوں میں چکر لگانے کے بعد اس نے واپس آکر اعلان کیا: ”مرتبے جا چکے ہیں۔ خزانے ہماری مدد کی ہے اب اس کی بارگاہ میں سجدوں کا وقت ہے۔“

خورشید، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی کے نعروں اور مسرت کے آوازوں سے اس کے اعلان کا خیر مقدم کر رہے تھے مکان کے اندر خواتین معظم علی کی مان کے گرد جمع ہو کر شکر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں اور مکان سے باہر مردوں کا ہجوم معظم علی کو نکیرے میں لیے ہوئے تھا۔ وہ ان کے لیے ایک قابل فخر بیٹا، ایک قابل عزت بھائی اور ایک قابل اعتماد دوست بن چکا تھا۔

معظم علی نے رضا کاروں کو مشعلیں جلانے کا حکم دیا اور برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہا: ”بھائیو! کمروں کے اندر خواتین اور بچے گرمی کے باعث سخت تکلیف میں ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تمام مرد حویلی کے بیرونی احاطے میں چلے جائیں تاکہ ہماری بہنیں باقی رات کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مسلح رضا کاروں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ وہ صبح تک بیرونی فصیل کے مورچوں میں پہرہ دیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مر بٹے دوبارہ حملہ کریں گے تاہم میں نے احتیاط کے طور پر چند آدمیوں کو باہر کے راستوں پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ کو رات کا کھانا نہیں ملا۔ مرزا صاحب نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ سب کے لیے دسترخوان بچھا دیئے جائیں گے۔“

## بچو تھا باب

صبح کی نماز کے بعد محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ معظم علی تھا کاٹھ سے نڈھال ہو کر دیوان خانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو محمود علی، یوسف، حسین بیگ، آصف اور افضل اس کی چارپائی کے گرد کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر یکے بعد دیگرے اپنے باپ، بھائی، اور دوستوں سے بغل گیر ہوا۔

افضل نے کہا: "معظم تم نے تو ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے!"

حسین بیگ بولا: "بیٹا اگر مرہٹے ہمیں ایک دو ماہ اور مہلت دیتے تو معظم اس محلے کے ہر مکان کا نقشہ بدل دیتا۔"

محمود علی نے کہا: "ہم راستے میں بہت پریشان تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ورنہ یہ محلہ بہت غیر محفوظ تھا۔"

حسین بیگ نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اب محلے کے لوگ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر معظم کا قیاس غلط ثابت ہوا تو مجھے اس شہر سے ہجرت کرنا پڑے گی" سلطان خان نے میرا مذاق اڑانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن جب مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سارے شہر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں آگیا تھا۔ رات کے وقت وہ میرے کتب خانے میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ تاریکی میں اسے ٹھوکر مار رہے تھے۔

تھے۔ لیکن وہ آٹ تک نہیں کرتا تھا۔

معظم علی نے سوال کیا: چچا جان آپ نے شہر کے حالات معلوم کیے ہیں؟

حسین بیگ نے جواب دیا: شہر میں مرہٹوں نے کافی لوٹ مار کی ہے جگت سیٹھ کے محل سے وہ بیس لاکھ روپیہ نکال کر لے گئے ہیں۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم شہیدوں کے نازے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد شام کے چار بجے تھیں میرمن کے پاس جا رہے: "میرمن کے پاس؟"

"ہاں تم سو رہے تھے انھوں نے تھیں جگتھ کے کی اجازت نہیں دی۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں وہ آئے تھے اور جلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ فوج کے چند اور افسر بھی تھے۔ وہ تمھاری کارگزاری پر بہت خوش تھے۔"

معظم علی نے سوال کیا: "انھیں آپ نے یہاں بلا دیا تھا؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا انھیں یہاں آنے کے لیے کسی کے بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے یہ خبر کافی تھی کہ اس جلی میں دوسرے مرہٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔"

محمود علی نے کہا: "راستے میں ہماری طرح میری مدن بھی اس محلے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کی حویلی بہت غیر محفوظ ہے۔ لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی جب ہمیں مرہٹوں کے نقصانات کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا کہ میں سب سے پہلے مرزا صاحب کی حویلی دیکھنا چاہتا ہوں۔"



شام کے چار بجے معظم علی شاہی محل کی چلدیواری کے اندر میرمن کے مکان میں داخل ہوا۔ ایک سپاہی اسے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک نوجوان افسر کے پاس لے گیا۔

تشریف رکھیے، افسر نے اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

مستظم علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میرا نام مستظم علی ہے اور مجھے میرا صاحب نے بتایا ہے۔"

افسر چونک کر کرسی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔  
"آپ محمود علی کے صاحبزادے ہیں؟ معاف کیجیے۔ میں آپ کو بڑی عمر کا آدمی سمجھتا تھا۔ میرا صاحب چند افسروں سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

مستظم علی افسر سے مصافحہ کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند ثانیے خاموشی سے مستظم علی کی طرف دیکھنے کے بعد افسر نے کہا:

"میرا نام گوہر خان ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔"  
تھوڑی دیر بعد فوج کے چند افسروں کو دیوان خانے کے ایک کمرے سے باہر نکلتے کچھ کرگوہر خان نے کہا:

"جیسے اب وہ فارغ ہو گئے ہیں۔"

مستظم علی گوہر خان کے پیچھے ہولیا۔ صحن عبور کرنے کے بعد وہ دیوان خانے کے باہر سے داخل ہوئے اور گوہر خان مستظم علی کو رکنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہوا۔ چند ثانیے بعد اس نے باہر نکل کر مستظم علی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔

سلطنت و جبروت کا ایک بیکر ہم کرسی سے اٹھ کر دو تین قدم آگے بڑھا اور مستظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا: "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مصروف تھا۔"

"مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔"

"جیتے جاؤ؟"

مستظم علی میرمدن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرمدن نے کہا: "میں تمہاری کارگزاری دیکھ چکا ہوں اور مجھے تم پر فخر ہے۔"  
"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" مستظم علی نے احسان مندی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ بنگال کی فوج کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

مرزا حسین بیگ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہیں فوج کی عازمت پسند نہیں۔ میں میاستان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے

کہ میں تمام کارآمد نوجوانوں کو اپنے گرو جمع کروں۔ محلے کی حفاظت کے سلسلہ میں تمہاری کارگزاری دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمہارے سیاسی نظریات خواہ کچھ ہوں۔ موجودہ حالات میں تم

بنگال کی فوج کے لیے اپنی خدمات کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکو گے۔ مرثوں کے ساتھ گذشتہ لڑائیوں میں میرے چند بہترین سالار شہید ہو چکے ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ ان میں سے

ایک کی جگہ اسی وقت پر گزری جائے۔ آج تک میں نے عہدوں کی تقسیم کے لیے کسی کی سفارش قبول نہیں کی۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔"

مستظم علی نے پریشان ہو کر کہا: "اگر مرزا صاحب نے میری سفارش کی ہے تو مجھے بہت افسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔"

میرمدن نے مسکراتے ہوئے کہا: "برفودار! مرزا حسین بیگ نے نہیں بلکہ ان کی حویلی میں پڑی ہوئی دوسو مرثوں کی لاشوں نے تمہاری سفارش کی تھی۔ پھر جب میں تمہارے محلے کی گلیوں

سے گزرا۔ دیکھا تو بچوں اور بوڑھوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مجھے یہ پیغام دے رہے تھے کہ اس محلے میں ایک نوجوان ایسا ہے جس کی جرات، ہمت اور ذہانت پر تم اعتماد کر سکتے ہو۔"

مستظم علی نے کہا: "لیکن میں نے صرف ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں۔"

"تم نے ایک چھوٹی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اب میں تمہیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے

کی دعوت دے رہا ہوں۔

معظم علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: اگر یہ دعوت کسی اور کی طرف سے ہوتی تو میں سوچے بغیر انکار کر دیتا لیکن آپ کے سامنے بات کرنا بھی میرے نزدیک گستاخی ہے۔  
تقصبات کرنے کی ضرورت نہیں: میرمن نے یہ کہہ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو معظم علی نے کہا: میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے تذبذب اور پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس قیادت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو قوم کے اجتماعی تقاضوں کی بجائے اپنی ضروریات کے مطابق دوستوں اور دشمنوں کے متعلق اپنا ذاتیہ نگاہ بدلتی رہتی ہے۔

میرمن نے مکھا ہوا کاغذ معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: سپاہی ہمیشہ سیاستدانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ اور تم ایک سپاہی ہو۔ میں بنگال کی فوج کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو قوم کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ متوقع پرست سیاستدانوں کے ذہن سے سوچتے ہیں اور تمہارے جیسے حقیقت پسند اور فرض شناس فوجیوں کے تعداد کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دن فوج کے سپاہیوں میں وہ اجتماعی ضمیر بیدار کر سکو جسے جو سیاسی طاعن آزمادوں کی کوتاہیاں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ تمہاری فہمردی کا حکم نامہ ہے۔ میں تمہیں دو دن سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ اگر تم نے دو دن کے بعد فوج میں حاضری زد ی تو یہ حکم نامہ خود بخود منسوخ ہو جائے گا۔ اور مجھے اس بات کا افسوس ہو گا کہ میں ایک مضبوط پتھر کو قوم کے دفاعی حصار کی تعمیر کے لیے کام میں رلا سکا۔ مرشد آباد میں اب کچھ عرصہ حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جنوب مغربی اضلاع کے لیے خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ یہ صیب سے زیادہ ہماری کمزوریوں سے کوئی واقف نہیں۔ وہ مرشد آباد میں اپنی ناکامی کا بدلہ لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔  
معظم علی نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اس وقت بردوان، میدانپور اور ہگلی کے علاقے خطرے میں ہیں اور اگر میں ایک سپاہی ہوں تو مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی ضرورت نہیں

میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں۔ میں کل ہی اپنے دستے کی کمان سنبھال لوں گا۔



علی دردی خاں مرشد آباد میں اپنی افواج کو لازماً منظم کر رہا تھا کہ مرشد افواج نے یہ صیب کی قیادت میں اچانک ہگلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ برسات کی وجہ سے مرشد آباد سے رسید و آمد کے راستے بند ہو چکے تھے اور مرشد کسی موثر حمایت کا سامنا کیے بغیر بردوان، میدانپور اور بامر کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ اور چند ہفتوں میں حالت یہ ہو گئی کہ مرشد آباد کے جنوب مغرب میں کوئی علاقہ مرہٹوں کے حملوں کی زد سے محفوظ نہ تھا۔

برسات کی شدت کم ہوتے ہی علی دردی خاں نے پوری تیاری کے ساتھ مرشد آباد سے ہشتنگری کی اور کولے کے قریب دریائے بھاگرتی کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ مرشد افواج نے چاروں طرف سے سمٹ کر بھاگرتی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریباً اکیس دن فریقین اپنے اپنے کیمپوں سے ایک دوسرے پر گولہ بادی کرتے رہے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ اودھ کا صوبہ دار اپنے لشکر کے ساتھ علی دردی خاں کی مدد کے لیے آ رہا ہے چنانچہ انھوں نے ایک گھمسان کی جنگ کے بعد پسپائی اختیار کی۔ چند دنوں میں علی دردی خاں کی افواج نے مرہٹوں کو بردوان، ہگلی اور میدانپور کے علاقوں سے نکال دیا۔ ہر محاذ پر مرہٹوں کی عام پسپائی شروع ہو چکی تھی اور بنگالی فوج کے تیز رفتار ہراول دستے ان کی افواج سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

معظم علی ہراول دستوں کے ان چند افسروں میں سے ایک تھا جو پورے لشکر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ دشمن کے تعاقب میں یہ لوگ باقی فوج سے ہمیشہ ایک منزل الگ رہتے تھے۔ مرشد فوج کی کسی کوس بھاگنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالتی۔ لیکن یہ لوگ اچانک حملہ کر کے ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ معظم علی کی کمان میں پانچ سو سوار تھے اور وہ چند دنوں میں دشمن کے پیچھے توڑوں اور سامانِ رسید کی ستر گاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

میرمدن مسکرایا: "عالیجاہ میں فوج کو تیاری کا حکم دے لیا ہوں۔ صرف آپ سے ہازت لینا چاہتا ہوں۔"

"کتنے سپاہی لے جا رہے ہو؟"

"پانچ ہزار۔"

"جاؤ!"

جب میرمدن نیچے سے باہر نکل رہا تھا تو علی وردی خاں نے کہا:  
"انشاء اللہ کل ہم وہ قلعہ دیکھنے آئیں گے۔"



میرمدن کا قیاس درست تھا۔ معظم علی غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ قلعے کی حفاظت کرنے والے پچاس سپاہیوں میں سے چوبیس ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ ہندو گرفتار ادیبانی ایک چور دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔

معظم علی نے قلعے کے برج پر بنگال کا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سے کہا:  
"بہادورو! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت تھکے ہو۔ لیکن آج رات شاید تمہیں کھلم کھاسب ہوگی۔ لیکن اگر تم نے بہت دیر میں اور مرہٹے دجاہ قلعے پر قابض ہو گئے تو ہمارے لیے جہاگ نکلے گا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ قلعے میں اتنا بارود ہے کہ ہم چند گھنٹے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں فضا کے ہر حصے پر چڑھ کر رہنا چاہیے۔"

مرہٹہ فوج کے سرداروں کو اس بات کا یقین تھا کہ علی وردی خاں کا لشکر ان کا منہ پر تکیا نہیں کرے گا اور وہ سرحدی قلعہ میں پناہ لے کر اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکیں گے۔ لیکن کوئی دیکھ کر اس کے فاصلے پر قلعے سے فرار ہونے والے سپاہیوں نے انہیں یہ خبر دی کہ

علی وردی خاں نے اڑیسہ کی سرحد تک، مرہٹوں کا تعاقب کیا۔ ایک شام بنگال کی افواج نے جھیل چھلکا کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور علی وردی خاں نے انہوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ یہ ہمدی آخری منزل ہے۔ اب اس سے اگے جانا بے سود ہے۔  
رات کے وقت جب فوج کا جشن منا رہی تھی۔ میرمدن، علی وردی خاں کے نیچے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "عالیجاہ! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہرادل فوج کے ایک سالار نے واپس آنے کی بجائے یہاں سے کوئی چوہیل درویش کے ایک قلعے پر حملہ کر دیا ہے۔"

علی وردی خاں نے برہم ہو کر کہا: "یہ میرے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے تمام فوج کو یہاں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔ وہ سالار کون ہے؟"

"عالیجاہ وہ معظم علی ہے۔"

"لیکن ہرادل فوج کو سرحد پر جانے کی اجازت نہیں تھی!!"

"عالیجاہ اس نے سرحد عبور نہیں کی۔ یہ قلعہ ہمارا تھا اور مرہٹے چند سال سے اس پر قابض چلے آتے ہیں۔"

اور وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پانچ سو سپاہی مرہٹوں کے تمام لشکر کو موت کے گھاٹ اتار کر قلعے پر قابض ہو جائیں گے؟

"عالیجاہ! میرے خیال میں وہ اب تک قلعے پر قابض ہو چکا ہوگا۔ جو اطلاع مجھے ملی ہے اس کے مطابق وہ ہرادل کے باقی دستوں سے کٹ کر مرہٹوں کے لشکر سے اگے نکل گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کے دہان پہنچنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسے شک نہ بھی گئی تو مرہٹوں کا لشکر دہان پہنچنے ہی قلعہ کا محاصرہ کرے گا اور ہمدی فوج کے پانچ سو بہترین سپاہی مارے جائیں گے۔  
علی وردی خاں نے کہا: "اگر صورت یہ تھی تو تمہیں کمک بھیج کر میرے پاس آنا چاہیے تھا۔"

بنگال کے مٹی بھر سپاہی قلعے پر قابض ہو چکے ہیں۔ مرہٹہ سردار قلعہ کے محافظوں کو بڑی ادب سے غیری کا طعنہ دیتے ہوئے آگے بڑھے اور اسی رات کے قریب انھوں نے قلعے سے کوئی آٹھ میل دور شمال کی جانب چڑا ڈال دیا۔ اس کے بعد میر میب اپنے پانچ ہزار آدمیوں کا سپاہی لے کر آگے بڑھا اور اس نے قلعے کا حاصر کر لیا۔

پچھلے پھر شدید گولہ باری کے بعد مرہٹوں کا فخر چاندوں طرف سے قلعے پر لیٹا کر دیا تھا اور مظلم علی کے ساتھی ملک پہنچنے کی امید پر اپنے مورچوں میں ڈلے ہوئے تھے۔ اچانک جنوب مشرق کی سمت سے گویوں کی بارش ہونے لگی اور مرہٹہ فوج میں افزائری پھیل گئی۔ وہ مغرب کی طرف سمٹنے لگے۔ مقررہ دیر بعد مغرب کی طرف بھی درختوں اور جھاڑوں کی آڑ سے مرہٹوں پر گولیاں برسنے لگیں اور کوئی آٹھ گھنٹے بعد مرہٹے انتہائی انتشار کی حالت میں شمال کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میر مدن نے اپنے مولوں کو عام حملے کا حکم دیا اور ان کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ بنگال کی فوج پڑاؤ تک مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آگئی۔  
صبح کے دھندلے میں مظلم علی اور اس کے ساتھی قلعے سے باہر نکل کر میر مدن کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

میر مدن کے حامی بائیں نمود ملی، راست کا نصف اور افسل بیگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ میر مدن نے ان کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا رکھا اور مظلم علی سے مخاطب ہوا کہ کہا: تمہیں اس قلعے پر حملہ کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟

یہ سوال اور یہ لب و لہجہ مظلم علی کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے متذبذب اور پریشانی کی حالت میں میر مدن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے باپ بھائی اور دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے۔ مظلم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔

”لوئے کیوں نہیں؟ میر مدن نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔  
مظلم علی نے جواب دیا: اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے مجھے کسی نے حکم کی ضرورت بتائی۔“

میرا یہ اقدام آپ کی منشا کے عین مطابق تھا۔“

میر مدن نے مگر غمزدگی کی طرف دیکھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”لیکن تمہارے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ انھیں آرام کی ضرورت تھی۔“

ایسے حالات میں سپاہی کے لیے گھوڑے کی زین بستر سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ پھر میں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قلعہ ان کے سفر کی آخری منزل ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جی بھر گرام کر سکیں گے۔“

میر مدن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا: ”مظلم علی تمہارا یہ کارنامہ میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن تم نے ہمیں آرام کی دعوت نہیں دی؟“  
مظلم علی نے جواب دیا: اندھ چیلے، میں نے آپ سب کے لیے آرام کا انتظار رکھ رکھا ہے۔“



دوپہر کے وقت قلعے سے باہر ایک کشادہ خیمے کے اندر علی دردی خاں کا دربار لگا ہوا تھا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ مظلم علی خیمے کے اندر داخل ہوا اور وہ بنگال کے حکمران کو سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔

علی دردی خاں نے گاؤٹیکے کا سہارا چھوڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا: ”تو جان! ہم یہ جانتا چاہتے ہیں کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟“

مظلم علی نے جواب دیا: ”عالی جاہ! مجھے یقین تھا کہ میں چند گھنٹے اس قلعے پر قبضہ کر سکتا ہوں اور اتنی دیر میں سپہ سالار تک بھیج دیں گے۔“

”لیکن ملک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟“

”عالی جاہ! میں نے یکے بعد دیگرے آٹھ سو پڑاؤ کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور میر مدن کی موجودگی میں ملک کے دیر سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

رات کے وقت اس قلعے کی طرف تھاری تھانی آواز آئی۔

مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس علاقے کا ہر شیبہ دفرا اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔

علی وردی خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نوجوان! میں تمہیں اس قلعے کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔ اگر تمہارے متعلق میرے مدین کے خیالات صحیح ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "عالی جاہ! میں میرے مدین کی توقعات پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چوتھے روز معظم علی اس قلعے کے کمانڈر کی حیثیت میں بنگال کے لشکر کو اوداع کہہ رہا تھا۔ قلعے کے قریب ایک بلند ٹیلے سے بنگال کی افواج کی آخری جھبک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پانچ سو سپاہیوں کو قلعے کی چار دیواری کے اندر جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے سامنے تقریر کی۔

"میرے ساتھیو! تم مجھے منہ مٹا کر دیکھ رہے ہو۔ ہم اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور پھینک دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک بہت بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قلعہ بنگال کی ایک دروازہ ہے جو کہ ہمیں بکراہاؤ کے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس دیرانے میں وہ کران گھروں کی حفاظت کریں گے جو یہاں سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور ہمیں یہ تسکین ہوگی کہ ہماری دہرے ہماری قوم کے لاکھوں افراد آرام کی نیند سو رہے ہیں۔"

میرمدن نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس قلعے کو مستحکم بنانے کے لیے وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے اور میں ان کے ساتھ یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے، اس قلعے پر بنگال کا پرچم لہرتا رہے گا۔ یہ قلعہ بہت اہم ہے اور ہمیں اسے ناقابلِ تسخیر بنانا ہے۔"

اگلے دن معظم علی کے سپاہی اس قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی مرمت کا کام شروع کر چکے تھے۔

ایک سال بعد کٹک کا ذہدار اس قلعے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے علی وردی خاں کو یہ خط لکھا:-

"ایک سال بعد یہ قلعہ دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ معظم علی نے اس کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی فصیل کی جگہ ایک نئی فصیل تعمیر ہو چکی ہے۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش کے لیے نئی کونٹینر تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اور فصیل سے باہر خندق کھودنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر نو کے لیے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت قلیل تھی اور معظم علی نے اخراجات بچانے کے لیے تعمیر اور مرمت کا بیشتر کام اپنے سپاہیوں سے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معظم علی کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو دفاعی لحاظ سے ہمارا یہ سرحدی قلعہ بہت مضبوط بن جائے گا۔"

اس قلعے کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کے علاوہ معظم علی نے ارد گرد کے جنگلات مرعہ ڈاکوؤں سے پاک کر دیئے ہیں اور سرحد کی اجڑی ہوئی بستیوں کو دوبارہ آباد ہو رہی ہیں ان بستیوں کی حفاظت کے لیے مقامی رضا کاروں کی فوج معظم کی جا رہی ہے اور اب یہ معظم علی کے سپاہی قریباً ایک ہزار آدمیوں کو فوجی تربیت دے چکے ہیں۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق معظم علی سے یہ کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو تمہیں مرشد آباد تبدیل کیا جاسکتا ہے، میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوشی سے جھپٹ پڑے گا۔ لیکن اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ ابھی اس علاقے میں میرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ ابھی اس علاقے میں اُسمر نو آباد ہونے والے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور یہ جذبہ صرف معظم علی میں ہی نہیں کہ اس کا ہر سپاہی مجھ سے کہے کوئی اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔"



## پانچواں باب

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ سرحدی قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں معظم علی کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ مرشد آباد کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ کبھی وہ بچپن کے ان ایام کا تصور کرتا جب وہ یوسف، افضل اور آصف بیگ کے ساتھ اپنے محلے کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیلئے لگتی۔ کبھی اسے اپنے والدین کا خیال آتا اور اسے قلعے کی فضائیں اداس محسوس ہونے لگتیں۔ بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کی تصویریں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتیں۔ اور بالآخر مرشد آباد کے متعلق اس کے تمام تصورات ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتے۔ ایک ایسی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی جس کے کوئی مستقل خطہ حال اس کے ذہن پر نقش نہ تھے اور اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینوں سے لبریز ہو جاتی۔ وہ رات کے وقت کھلی فضا میں لیٹے لیٹے کبھی بلند آواز میں اور کبھی دبی زبان سے فرحت کا نام پکارتا اور کائنات کی وسعتیں ستاروں کے نغموں سے لبریز ہو جاتیں۔ لیکن پھر اچانک تصورات کے یہ سنہرے تار ٹوٹ جاتے اور وہ گہری نیند سو جاتا۔

ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس نے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ زندگی کی کسی منزل میں فرحت اور اس کا راستہ ایک ہو سکتا ہے۔ تاہم فرحت نے متعلقہ موبوس، دکش اور دلفریب تصورات اس کے خیالوں اور سپنوں کی دنیا پر حاوی

ہوتے جارہے تھے۔ مرزا حسین بیگ، آصف اور افضل بیگ کے نام اس کے ہر خط کی آخری سطر پر ہندوگان حال کو سلام کے الفاظ پر ختم ہوتی تھی اور یہی ایک جملہ اس کے نزدیک تمام خط سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ آصف کو خط کا جواب لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن افضل اور حسین بیگ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کے خطوط کا جواب دیا کرتے تھے۔ حسین بیگ کے خطوط میں ایک پدرانہ شفقت کا اظہار ہوتا۔ افضل کے خطوط بنگال کی سیاسی صورت حالات کے تذکروں سے لبریز ہوتے۔ کبھی کبھی وہ ایک آدھ فقرہ اپنی بہن کے متعلق بھی لکھ دیتا اور معظم علی اسے پڑھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتا۔ فرحت ابھی بے نصیب سلام کہتی ہے۔ آج فرحت کتنی تھی کہ تمہاری امی جان بہت منوم رہتی ہیں، اس لیے تمہیں چند دن کے لیے گھر ضرور آنا چاہیے اور معظم علی کا جی چاہتا کہ وہ اڑ کر مرشد آباد پہنچے اپنی والدہ کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ احساس کارفرما ہوتا کہ وہ اس کی وساطت سے فرحت کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ معظم علی کی ماں اپنے خطوط میں فرحت کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا کرتی تھی۔ اگر کسی خط میں فرحت کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور وہ جواب میں شکایت کرتا: امی جان آپ نے مرزا حسین بیگ اور ان کے بال بچوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی؟ اور ماں کی طرف سے اس قسم کا جواب آتا: بیٹا! میں تمہارا خط لیتے ہی ان کے ہاں گئی تھی۔ وہ سب بخیریت ہیں۔ فرحت بہت خوش ہے، وہ تمہارے متعلق پوچھتی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتی ہے تمہارے متعلق پوچھا کرتی ہے۔ پچھلے دنوں میں ٹیلی تھی اور وہ ہر روز میری تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ بڑی نیک لڑکی ہے، وہ پوچھتی تھی کہ تم چند دن کے لیے چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آجاتے؟

علی وردی خان ایک بیدار منظم نگران تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں سلطنت

بنگلہ یسے سیاسی شاطروں کی آماجگاہ بن چکی تھی جو قوم کی عزت و آزادی کو ہر وقت دادوں پر لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مسند اقتدار کے یہ بے حیا دعویدار کبھی کسی صوبہ دار یا فوجدار کے ساتھ ساز باز کرتے، اسے علی وردی خان کے مقابلے میں لے آتے اور کبھی مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے۔ علی وردی خان کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی تھی جو بنگال کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں رہتے تھے۔ بنگال کے اندر حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور فوجی افسر اور بنگال سے باہر مرہٹہ لیڈروں کے لشکر ایسے لوگوں کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوئے۔

یہ دور تھا جب بنگال کی سیاست رائے عامہ کے محاسبہ سے قطعاً آزاد تھی۔ علی وردی خان کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی برہمنی حمداؤروں سے مقابلہ کرتا۔ جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کے حدود میں آگھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خان کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار پر فیصلہ کن ضرب نہ لگاسکے۔ لیکن اپنے تدبیرا ذہانت اور موقع شناسی کے باوجود وہ ان فتنوں کا سبب نہ کر سکا جو آغا فراس کے جانشین نواب سراج الدولہ کی شکست اور بنگال کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ برہمنی خطرات کے مقابلے کے لیے ملک کے عوام کا مدافعتیہ شعور اور اندرونی غداروں کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار نہ کر سکا۔

علی وردی خان کے دربار میں میر جعفر کے مروج کے ساتھ بنگال کی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکے تھے۔ وہ ان تمام آزمائشوں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھا۔ جو سلطنت کے عہدیدار

کے گٹھ جوڑ یا مرہٹوں کے تعاون سے بنگال کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اور اس کی ذرا نشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل ان انگریز تاجروں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ جو فرٹ دلیہ میں بیٹھ کر نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔

میر جعفر کا طریق کار ان طالع آزمائوں سے مختلف تھا جو کھلے بندوں علی وردی خان کے ساتھ قوت آزمائی کر کے اپنی شکست یا تباہی کا خطرہ مول لیتے تھے۔ وہ درپردہ ان تمام بغاوتوں اور سازشوں میں شریک تھا جو بتدریج بنگال کی قوت مدافعت کو مفلوج کر کے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔

یہ بعد دیگرے بنگال کے امرا کی بغاوتوں نے اس کی کامیابی کے راستے صاف کر دیئے۔ علی وردی خان جو عام حالات میں میر جعفر کو اپنا ایک حقیر ساتھی سمجھتا تھا، یہاں تک مجبور ہو گیا کہ اسے قابل اعتماد دوست سمجھنے لگا اور یہ ایک حقیقت پسند انسان کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس سیاست دان کی مجبوری تھی جو برائیوں کو ختم کرنے سے ناامید ہو کر ان سے اچھے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میر جعفر، اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہوا تو مرشد آباد کے امرا جو اسے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتے تھے، چونکہ اس نے جلد ہی ایک اور کامیابی حاصل کی یعنی ہنگلی اور میدنا پور کی فوجداری بھی حاصل کر لی، ہو سکتا ہے کہ دربار میں اپنے ایک رشتہ دار کی سازشوں سے تنگ آکر علی وردی خان نے اسے مرشد آباد سے دور بھیجنا مناسب خیال کیا ہو۔ لیکن بنگال کے سن رسیدہ حکمران کو کیا معلوم تھا کہ ہنگلی میں ایک فوجدار کی حیثیت سے میر جعفر کا اثر و رسوخ بنگال کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہو گا۔ ہنگلی اور میدنا پور میں علی وردی خان کی لگاؤوں سے دور کردہ زیادہ آزادی کے ساتھ انگریزوں کی سازشوں میں شریک ہو سکتا تھا۔



اڈیسہ پر مرہٹوں اور افغانوں کے متحدہ حملے کی خبریں مشہور رہی تھیں۔ ایک دن مرشدآباد کے پریشان حال لوگوں نے یہ سنا کہ گجلی سے میرجعفر کی کمان میں سات ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوج کٹک کا رخ کر رہی ہے۔ پھر کوئی ایک ہفتہ بعد یہ اطلاع آئی کہ میرجعفر دشمن کو شکست دینے کے بعد ان کا تعاقب کر رہا ہے۔

پھر جب مرشدآباد میں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، یہ خبر آئی کہ محمد آوروں کی مدد کے لیے رانگو جی کا بیٹا جاجی ایک ٹڈی دل لشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے اور میرجعفر اس کا سامنا کرنے کی بجائے اٹلے پاؤں بردوان کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کے بعد کئی دن تک اڈیسہ کے طول و عرض میں مرہٹوں اور افغانوں کی ٹوٹ مارت کی خبریں آتی رہیں۔ معظم علی کے دوست اور عزیزان خبروں سے بہت پریشان تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ دور افتادہ سرحدی قلعے کا یہ محافظ کس حال میں ہے۔ ہرنا حسین بیگ ہر روز سپہ سالار کے پاس جاتا اور معظم علی کے متعلق پوچھتا لیکن کئی دن تک وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ فرحت اور اس کی والدہ صبح شام معظم علی کے گھر جاتیں اور اس کی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتیں۔

چند دن بعد کسی نے یہ مشورہ کر دیا کہ مرہٹوں نے سرحدی قلعہ فتح کر لیا ہے۔ معظم علی کے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں اور باقی دشمن کی قید میں ہیں اور اس قسم کی افواہوں کے ساتھ معظم علی کی بہادرانہ موت کی فرضی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔

ایک دن فرحت اور اس کی والدہ حسب معمول معظم علی کے گھر گئیں۔ کچھ دیر معظم علی کی ماں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ معظم علی کی ماں انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ وہ دُعا مانگنے سے نکل کر مکان کے مردانہ حصے کے صحن میں داخل ہو رہی تھیں کہ لگی کی طرف سے ایک سوار اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

”معظم! ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی تمام حیات محنت کر آنکھوں میں آگئیں۔ کچھ دیر یہ تینوں سکتے کے عالم میں کھڑی رہیں۔

معظم علی گھوڑے سے اترا اور اسلام علیکم“ کہہ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں فرحت جس کے چہرے پر اب تک کئی رنگ آپکے تھے۔ اپنی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم! معظم!! ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر معظم علی کا سر اپنے سینے سے لگایا اور کہا: ”بیٹا! یہ تمہاری چچی جان ہیں!“

حسین بیگ کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور کہا: ”بیٹی تم گھر جاؤ اور اپنے آبا سے کہو معظم علی آگیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ فرحت اپنا چہرہ چادر میں چھپائے ہوئے جھپکتی اور سختی دروازے کی طرف بڑھی۔

معظم علی نے کہا: ”چچی جان آپ کے گھر میں خیریت ہے نا؟“ فرحت کی ماں نے جواب دیا: ”گھر میں سب خیریت ہے بیٹا، لیکن تم نے ہم کو بہت پریشان کیا۔“

”صابر! صابر!“ معظم علی کی ماں نے نوکر کو آواز دی۔ صابر نکلیں ملتا ہوا اصطبل کے قریب کے کمرے سے باہر نکلا اور خواتین کی موجودگی کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ پلٹ گیا۔

معظم علی کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا: ”صابر! معتمد کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دو اور اس کے ابا جان اور یوسف کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو۔“

معظم علی نے کہا: ”نہیں امی جان! گھوڑا باندھنے کی ضرورت نہیں، ابھی مجھے باہر کچھ کام ہے۔“

ذہن کی ماں نے کہا: بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ آرام سے گھر بیٹھو، تمہارے چہرے سے مسوومہ ہوتا ہے کہ تم نے کئی دن سے آرام نہیں کیا ہے۔

معظم علی نے کمانچہ جی جان! میں میرمدن کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے ملاقات کے بعد شاید مجھے ذواب صاحب کے سامنے حاضر ہونا پڑے۔ مجھے سیدھا وہاں جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ پہلے گھر کا حال معلوم کروں۔



کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی۔ میرمدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میرمدن نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ گرجوٹی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھانے کے بعد کہا: معظم علی! میں کسی تہید کے بغیر تمہارے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ معظم علی نے منہم لہجے میں جواب دیا: میرے ساتھی میرجعفر کی بزدلی اور بے خبری کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اور میں مرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت کی بے حسی اور نااہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شہر ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور باقی: "میرمدن نے دوسرے وقت کے بعد سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: چالیس سپاہی دشمن کی قید میں ہیں اور باقی ایک سوسائڈ جن میں سے قریباً پچاس زخمی ہیں۔ قلعے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ میں انہیں بردوان کے راستے میں ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہم نے دشمن کے ہاتھوں شکست نہیں کھائی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت نے ہمیں بے درست دیا بنا کر دشمن کے آگے ڈال دیا تھا۔ ہم نے پندرہ دن تک دشمن کے اس لشکر کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ہم سے بیس گنا زیادہ تھا اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر ہمک پہنچ جائے گی۔ میں ہر روز میرجعفر کے پاس پیغام بھیجتا تھا کہ ہمارا بارود ختم ہو رہا ہے اور ہم زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں پندرہ دن کے بعد یہ جواب ملا کہ اس قلعے کی حفاظت بے سود ہے۔

تم اگر دشمن کا محاصرہ توڑ کر نکل سکتے ہو تو بردوان پہنچ جاؤ۔

اگر یہی حکم ہمیں آٹھ دس دن پہلے مل جاتا تو اتنی جائیں ضائع نہ ہوتیں۔ میرجعفر کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث ہمارے ہاتھ سے صرف ایک قلعہ ہی نہیں نکلا بلکہ اڈلسیر کے تمام علاقوں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر حکومت نے کچھ عرصہ اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہے کہ پورا بنگال مرہٹوں کی شکاں گاہ بن جائے گا۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان حالات میں بھی مجھے میرجعفر سے چند منٹ کی ملاقات کے لیے دو دن بردوان میں ٹھہرنا پڑا۔

"تم میرجعفر سے مل کر آتے ہو؟"

ہاں! دو دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں زبردستی عمل کے اہل گھر گیا اور سپاہی مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے گئے تھے۔

میرمدن نے کہا: "جعفر اپنی تمام برائیوں کے باوجود بنگال کے حکمران کا رشتہ دار ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی؟"

معظم علی نے جواب دیا: اگر کسی بزدل آدمی کو بزدل کہنا گستاخی ہے تو میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں علی دردی خاں نے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میرجعفر ان کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اس قابضین کے اسے فوج میں کوئی معمولی عہدہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ میرمدن نے چند ثانیے سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: معظم علی! میں بھی ایک سپاہی ہوں اور موجودہ حالات میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ میرجعفر کے متعلق میرے خیالات تھک چکے ہیں۔ خیالات سے مختلف نہیں لیکن علی دردی خاں کے سامنے اس کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب اسے مہینہ پورا اور بھگی کی فوجیاری دی جا رہی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ میں نے علی دردی خاں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان کے لیے اس کا انتخاب درست نہیں۔ لیکن میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھیں میرجعفر کی صلاحیتوں کے متعلق

کوئی غلط فہمی نہیں لیکن بڑے بڑے امراء کی بغاوتوں نے انھیں میر جعفر جیسے خوشامدیوں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم ان کے سامنے اس میر جعفر کی شکایت کرو گے جس کی نااہلیت اور بدولی کے باعث اڑیسہ کے عوام تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن میر جعفر جب ان کے سامنے پیش ہوگا تو انتہائی غصے کی حالت میں بھی بنگال کے حکمران کا معاطہ اس شخص کیساتھ ہوگا جو بوقت ضرورت اپنے آقا کے قدموں پر گر جاتا ہے، وہ کہے گا: "عالی جاہ! میں آپ کا حقیر غلام ہوں۔ میں خداؤں کا پتا ہوں۔ میری تعظیم معاف کیجئے۔" اور علی درودی خاں اگر اس کے الفاظ سے نہیں تو اس کے آنسوؤں سے مزدور متاثر ہوگا اور جب میر جعفر دیکھے گا کہ اس کے آنسو بھی رانگاں گئے ہیں تو وہ محل کی بیگمات کے پاس جائے گا اور ان سے کہے گا کہ زاب صاحب میرے دشمنوں کی باتوں میں آگئے ہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔ خدا کے لیے میری سفارش کیجئے۔ سلطنت کے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ یہ وفادار غلام زاب صاحب کے قدموں میں رہے۔" اور پھر چند دن بعد زاب صاحب اسے بلا کر یہ کہیں گے: "میر جعفر! ہم تمہاری سابقہ فروگزاشتیں معاف کرتے ہیں۔ لیکن آئندہ کے لیے معاطہ نہ ہو۔ ہمیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیئے۔" اور وہ دیکھے گا: "عالی جاہ! مجھے جاہ و منصب کا شوق نہیں۔ مجھے کم از کم اس وقت تک اپنی خدمت کا موقع دیکھئے، جب تک سراج الدولہ سلطنت کے کاغذ ہار میں آپ کا ہاتھ بٹلنے کے قابل نہیں ہو جاتا اور ایسے امراء بنگال سے ختم نہیں ہو جاتے جو آئے دن آپ کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ معظّم علی! مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے بردوان میں میر جعفر سے یہ ضرور کہا ہوگا کہ تم علی درودی خاں کے پاس جا کر اس کی شکایت کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے میر جعفر کے جاسوس، علی درودی خاں کو اس کا یہ پیغام پہنچا چکے ہوں گے کہ ایک سرسبز جوان شاید آپ کے پاس پہنچ کر میری شکایت کرنے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سنی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور یہ جوان آپ کے متعلق بھی نہایت باغیانہ خیالات کا اظہار کر چکا ہے۔" مرشد آباد میں

شہابی محل کے اندر اور باہر اس کے جاسوس ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے مرشد آباد پہنچنے سے پہلے تمہارے متعلق اس کی ہدایات ان کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔ اب میرے ساتھ ملاقات کے بعد تم اگر علی درودی خاں کے پاس جا کر میر جعفر کی شکایت کرو گے، تو ایسے لوگ انھیں ذرا خراب کر دیں گے کہ تم میری طرف سے آگئے ہو۔

معظّم علی نے بدل ہو کر کہا: "مجھے معلوم نہ تھا کہ میر جعفر کے سامنے آپ بھی بے بس ہو چکے ہیں۔"

میرمدن نے جواب دیا: "معظّم علی! ہم نے بڑے حالات میں جہم لیا ہے۔ لیکن کاش ہم تمام برائیوں کے خلاف لڑ سکتے۔ موجودہ حالات میں نواب علی درودی خاں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بیک وقت ہر برائی کے خلاف نہیں لڑ سکتے وہ ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے خطرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس وقت ان کی ساری توجہ مرہٹوں پر مرکوز ہے۔ میرے مشورہ پر اب انھوں نے اڑیسہ کی اہم میر جعفر کی جگہ عطار اللہ خاں کو سوپ دی ہے۔ دو دن تک یہاں سے روانہ ہو چکے۔ آج قبر سے پہلے علی درودی خاں نے فوج کے چند افسروں کا اجلاس طلب کیا ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم میر جعفر کے خلاف اپنے جذبات پر قابو رکھو گے تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اس اجلاس میں تمہیں بھی بلایا جائے۔ تم تمام حالات سے واقف ہو اور اس اجلاس میں میر جعفر کی ذات کے متعلق کچھ بغیر تمہیں پوری آزادی سے ان غلطیوں پر کھینچ کر لے کر آؤ۔ میر جعفر کی اجازت ہوگی جن کے باعث یہ حالات پیدا ہوئے ہیں۔ میر جعفر کی اتحاد پسپائی کے متعلق ایک مثبت قبل بھرے دربار میں کافی لے دے چکی ہے اور تم اس کی ذات کو ہدفِ ملامت بنا کر علی درودی خاں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ لیکن اگر تم گذشتہ کوآہوں کی قافی کے لیے کوئی منفی تجویز پیش کر سکو تو ممکن ہے کہ اڑیسہ کے حالات کے روبرو اصلاح ہوتے ہی وہ وقت بہت جلد آجائے۔ جب ہر اطمینان سے میر جعفر کے قماش کے لوگوں پر توجہ دے سکیں۔"

معظّم علی نے کہا: "یہ یہی پہلی تجویز یہ ہوگی کہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں میر جعفر

جیسے لوگوں کو فوجی معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جائے

میرمدن مسکرایا۔ تعین یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی میرجعفر کو یہ ہدایات بھیجی جا چکی ہیں کہ عطاء اللہ خاں کے ساتھ پورا تعاون کرے اور عطاء اللہ خاں کو یہ اختیار دیا جا چکا ہے کہ اگر وہ کسی افسر سے ملنے نہ ہو تو اسے سبکدوش کر دے۔

معظم علی نے کہا: جب مرہٹے ہمارے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور مجھے کئی دن تک میرجعفر کی طرف سے اپنے پیغامات کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں اپنے ساتھیوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ کر وہاں سے نکلے لگا تو میں نے یہ عہد کیا کہ میں کم از کم ایک بار اور یہاں ضرور آؤں گا۔ میں عطاء اللہ خاں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن اگر آپ کو اس کی صلاحیت پر اعتماد ہے تو میں یہ درخواست کر دوں گا کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔

میرمدن نے کہا: لیکن میرا خیال تھا تم اتنی مدت کے بعد چند دن مرشد آباد رہنا چاہو گے۔ معظم علی نے جواب دیا: وہ قلعہ جہاں میرے ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مجھے مرشد آباد سے زیادہ عزیز ہے۔



میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی واپس گھر پہنچا تو اس کا باپ، بھائی اور حسین بیگ دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پندرہ بیس آدمی اور سب دیہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ سب باری باری اس سے مل گئے۔

مرزا حسین بیگ نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھایا اور کہا: بیٹا! ہم بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تمہاری زبان سے اڑیہ کے حالات سننے کے لیے بے چین ہیں۔ چند دنوں سے سرحدی علاقوں کے متعلق بہت بری خبریں آرہی تھیں اور ہم تمہارے متعلق بہت پریشان تھے۔ میں تمام واقعات سناؤ۔

معظم علی نے اس کے جواب میں میرجعفر کی نااہلیت، مرہٹوں کے مظالم اور سرحدی قلعے کی تباہی کی داستان مختصراً بیان کر دی۔

اتنی دیر میں محلے کے بڑے، بچے اور جوان جوق در جوق مکان کے اندر داخل ہوئے تھے اور صابر بندہ آواز سے چلا رہا تھا: بھئی ٹھہرو! اندر جگہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے شور نہ مچاؤ! اندر مرزا صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔

معظم علی جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا اور لوگ دیوانہ وار آگے بٹھ بٹھ کر اس کے ساتھ بنگلہ ہونے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود علی، حسین بیگ اور محلے کے باقی معززین بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گئے اور پامسے میں کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔

جب معظم علی صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے کے بعد ڈیوڑھی میں پہنا تو باہر لگی میں ایک اور جہم دکھائی دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ ان لوگوں سے ملنے میں مصروف رہا۔ اتنی دیر میں آصف بیگ اور افضل بیگ بھی آ گئے، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی جہم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے باقی لوگ دھشت ہو چکے تھے اور معظم علی دیوان خانے کی بجائے بلائی منزل کے ایک کمرے میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ باقی کر رہا تھا۔

اگلے دن سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ معظم علی، عطاء اللہ خاں کے ساتھ اڑیہ کی ہمہ جہاں ہمسایہ کے بھائی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹوں نے بھی اس ہم کے لیے اپنے نام پیش کیے تھے۔ لیکن مرشد آباد کے فوجدار نے صرف آصف بیگ کو معظم علی کا ساتھ دینے کی اجازت دی ہے۔

تیسرے دن مرزا حسین بیگ کے ہاں معظم علی کی دعوت تھی، جس میں مرشد آباد کے قریب ساٹھ املاہ اور بڑے بڑے افسر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب مرزا حسین بیگ محلے کے چند معززین کے ساتھ ڈیوڑھی سے باہر نکلا تھا اور اس کے محل کے اندر دس سائیکس کے نیچے جج

ہونے والے جہانوں کی نگاہیں اندوہناک صحن کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک نوکر لڑکا، جس کے دائیں بائیں میرمدن، راجرام موہن لال، عطاء اللہ خاں اور مرشد آباد کے فوجدار تھے۔ دروازے سے نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے مرزا حسین بیگ اور محلے کے چند اور معززین تھے۔ فوج خوش وضع لڑکا، جس کی تباہیوں سے مرصع سخی، ایک شاہد تکمنت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور ساہبان کے نیچے برہونے والے مہمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ گمنام لڑکا سلطنت بنگال کا دلی عہد سراج الدولہ تھا۔ وہ سی کے ساتھ بے تکلفی سے مصافحہ کرتا اور کسی کو لڑکے کے اشارے یا مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دہانے میں مہمان سراج الدولہ کے بعد جس شخص کی طرف سب سے زیادہ دیکھ رہے تھے وہ معظم علی تھا جس کے بائیں ہاتھ عطاء اللہ خاں اور حسین بیگ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسین بیگ اٹھا اور اس نے ایک مختصر تقریر میں سراج الدولہ، میرمدن اور دوسرے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سراج الدولہ نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا: اس وقت ہم سب کو معظم علی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس کی خاطر اس شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اس فوج کی عزت افزائی کا موقع ملا ہے جس نے بنگال کی فوج کے لیے جرات، ہمت، بہادری اور وفاداری کی قابلِ فخر مثال قائم کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ جب اڑیسہ کی مہم سے مرشد آباد کی فوج واپس آئے تو مرزا صاحب اس طرح کی کئی اور دعوتوں کی ضرورت محسوس کریں:

بنگال کی فوج اڑیسہ میں رہتوں: پے درپے شکستیں دینے کے بعد انھیں مغرب کی طرف دھکیل دی تھی۔ سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر عطاء اللہ خاں کی فوجیں پڑاؤ والے ہوئے تھیں۔ ایک شام معظم علی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑاؤ میں داخل ہوا اور گھوڑوں سے

اترتے ہی سیدھا سپہ سالار کے نیچے میں پہنچا۔

عطاء اللہ خاں اپنے کاتب سے کوئی مراسلہ کھنوا رہا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھتے ہی کہا: میں دودن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے بہت دیر لگائی!

معظم علی نے جواب دیا میں مرہٹوں کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شمال کے تمام جنگلات ان کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ پھر سبھی اگر پانچ سو قیدیوں کو ساتھ لائے گا مسدود ہوتا تو میں دودن قبل یہاں پہنچ جاتا۔ قیدیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحدی قلعے میں اس وقت مرہٹوں کے صرف ایک ہزار سپاہی موجود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی تاجر کے بغیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے!

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: قلعے پر حملہ کرنے کے لیے تمہیں چند دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف مرہٹوں کا ایک لشکر جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور میں آج علی الصباح میر جعفر کی قیادت میں پانچ ہزار سواروں کو اس طرف روانہ کر چکا ہوں:

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا: میر جعفر کو ایسی مہم پر بھیجنے سے پہلے اگر آپ دشمن کو غیر مسلح کر کے درختوں کے ساتھ باندھ دیتے تو شاید یہ مہم کامیاب رہتی۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: میر جعفر اس مہم پر جانے کے لیے مصر تھا اور میں اسے گزشتہ بنا ہی کا داغ دھونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمہارا دوست آصف بیگ میر جعفر کے ساتھ جا چکا ہے اور مجھے میر جعفر سے زیادہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ میں اس مہم پر تمہیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن تم دیر سے پہنچے ہو۔

معظم علی نے کہا: میر جعفر کی رفاقت کے لیے آصف بیگ جیسے جری فوجان کا انتخاب صحیح نہیں تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے اور میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آنے کی بجائے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔

کر رہی تھیں۔ وہ گھوڑا بھگاتا ہوا سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچا۔ ایک فوجان افسر نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ معظ علی نے کسی وقت کے بغیر سوال کیا۔ تم نے رات کے وقت یہاں پڑاؤ ڈالا تھا؟

”جی ہاں۔“

”فوج کو یہاں سے روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“

”کوئی ڈیڑھ گھنٹہ۔“

”رات کے وقت دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق کوئی اطلاع ملی تھی؟“

”جی ہاں! رات کے وقت ہمیں پتہ چلا تھا کہ دشمن یہاں سے کوئی تین کوس کے

فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔“

”ادھر وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے ہیں؟“

”جی ہاں! اس سئلے پر کافی بحث ہوئی تھی کہ جنگل میں فوج کو اس سے آگے پیدل پیش قدمی

کرنی چاہیے یا گھوڑوں پر۔ اصف بیگ کا خیال تھا کہ فوج کو اس سے آگے پیدل جانا چاہیے لیکن میر جعفر

یہ کہتے تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

معظ علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میر جعفر یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے کے لیے پاؤں کی بجائے

گھوڑے زیادہ کام دیتے ہیں۔“ پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم میں سے سچاس آدمی

میر سے ساتھ پیدل چلیں اور دوسراں ندی کے کنارے درختوں اور پتھروں کی آڑ میں چھپے بنا

لیں۔ باقی تمام گھوڑوں کو لے کر ان ٹیلوں کے پیچھے چھپ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ میر جعفر دشمن

کو بہت جلد یہاں لے آئیں گے۔“

پھر وہ پڑاؤ کے محافظ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں سے یہ نیچے اٹھو

اور دریا کا رخ کر کے سامان ان ٹیلوں کے پیچھے لے جاؤ۔“

فوجان افسر نے گہرا کر کہا۔ ”لیکن جناب! میر جعفر کے حکم کے بغیر۔۔۔۔۔۔“

عطار اللہ خاں نے جواب دیا۔ ”اگر تمہیں میر جعفر کی کمان میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تو میں خوشی سے تمہاری درخواست منظور کرتا ہوں۔“

معظ علی نے کہا۔ ”میں ایک سپاہی ہوں اور اگر میر جعفر نے کوئی بہت بڑی حماقت نہ کی تو ہمارے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔“

عطار اللہ خاں نے ایک نقشہ اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

معظ علی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور عطار اللہ خاں نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے

ہوئے کہا۔ ”یہ مرہٹوں کا پڑاؤ ہے۔ اور میں نے میر جعفر کو یہ راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی

ہے۔ کل طلوع آفتاب سے پہلے وہ دشمن پر حملہ کرے گا۔ میرے خیال میں تمہیں دیر نہیں کرنی

چاہیے۔ تمہیں تازہ دم سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے لیے پانچ سو سولہوں کو تیاری

کا حکم دیتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنی رہنمائی کے لیے اس نقشے کی نقل تیار کرو۔“

معظ علی نے جواب دیا۔ ”یہ نقشہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ یہ دیکھنے

مرہٹوں کے پڑاؤ سے صرف تیس میل دور ہے۔ جہاں میں کئی برس گزار چکا ہوں۔ ان

جنگلوں میں میں نے بار بار مرہٹوں کا تعاقب کیا ہے۔ مرہٹوں کے پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلے

وادیاں اور ندیاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ

ہے کہ میں شاید حملے سے پہلے نہ پہنچ سکوں۔“

عطار اللہ خاں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے۔“

معظ علی پر سالار کے ساتھ نیچے سے باہر نکلا اور قریباً نصف گھنٹہ بعد اس کی قیادت

میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رخ کر رہے تھے۔



اگلی صبح چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد معظ علی کو اپنے سامنے ایک ندی کے کنارے نیچوں

کی ایک قطار دکھائی دی۔ مسلح سپاہیوں کی چند ٹولیاں ان نیچوں کے درمیان ادھر ادھر گشت



معلم علی نے چلا کر کہا: "لیکن تم بھاگ کیوں رہے ہو؟"  
"یہ میر جعفر کا حکم ہے۔"

مرزا آصف بیگ کہاں ہے؟

وہ حملے کے وقت اپنی ایک ہزار فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اتر کر جنگل میں گھس

گیا تھا اور اب معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؛ میر جعفر اس سے بہت خفا ہیں۔

معلم علی نے کہا: اگر آصف کے ایک ہزار جانناز ابھی تک جنگل میں ہیں تو مرٹے کھلے  
میدان میں تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ تم تمام سواروں کو اس جگہ روکنے کی کوشش  
کرو، میں جوابی حملہ کرنا چاہتا ہوں!"

افسر نے جواب دیا: "لیکن میر جعفر اسے حکم عدلی سمجھیں گے۔"

معلم علی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: "میر جعفر مرشد آباد پہنچنے سے پہلے دم نہیں لیں  
گے اور تم اس وقت میری کمان میں ہو۔ اگر کسی سوار نے آگے جانے کی کوشش کی تو میں  
اپنے سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ وہ اسے بلا توقف گولی مار دیں۔"

افسر نے کہا: "اگر آپ یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو میں بھاگنے کی بجائے آپ کی ناک  
میں جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا  
کرتے چلے آئے والے ساتھیوں کو روکنے لگے اور تھوڑی دیر میں چار ہزار سپاہی وہاں جمع ہو گئے۔ معلم علی نے  
آٹھ سو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے گھوڑے ندی کے پار لے جائیں اور باقی فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں  
تقسیم کر کے جنگل میں پیش قدمی شروع کر دی۔ راستے میں سپاہیوں کے چند دستے منتشر دستے ان کے ساتھ ملتے گئے  
جنگل میں چند مقامات پر بہڑوں کے اکا دکھاتوں کیساتھ ان کا تصادم ہوا لیکن وہ معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ نکلے۔

کوئی دو گھنٹے بعد انہیں ایک طرف بند قوت کے دھماکے اور لڑنے والوں کی چیخ پکار  
سنائی دی۔ وہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک نصف دائرہ میں آگے بڑھے۔

معلم علی نے جھنجھلا کر کہا: "اگر تم نے رات کے وقت اس جگہ پڑاؤ ڈالا تو مجھے یقین ہے  
کہ تھوڑی دیر بعد میر جعفر کو حکم دینے کا ہوش نہیں ہوگا اور میں اس کے سامنے تمہیں حکم عدلی کی  
سزا دے سکوں گا۔"

"لیکن جناب میں نے کوئی حکم عدلی نہیں کی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میر جعفر!"  
معلم علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں دس  
منٹ کے بعد اس جگہ پڑاؤ کا کوئی نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔"  
"بہت اچھا جناب!"

اچانک جنگل میں دد سے بند قوت کے دھماکے سنائی دیئے اور معلم علی نے گھوڑے  
سے کود کر اپنی بند قوت سمجھاتے ہوئے کہا: "بہادو! جلدی کرو، میر جعفر میری توقع سے پہلے  
واپس تشریف لا رہے ہیں۔"

پچاس سپاہی گھوڑوں سے اتر کر معلم علی کے پیچھے ندی میں گھس پڑے اور گھٹنے گھٹنے  
پانی میں سے گزرنے کے بعد جنگل میں غائب ہو گئے۔ کوئی ایک میل جنگل میں چلنے کے بعد  
انہیں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی معلم علی نے سپاہیوں کا اشارہ کیا اور وہ اس کے دائیں بائیں بکھر  
کر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ بعد جنگل کی فوج کے چند سوار دکھائی دیئے جن میں سے  
ایک میر جعفر تھا۔

"ٹھہریے! ٹھہریے!!" معلم علی نے دونوں ہاتھ بند کر کے انہیں روکنے کی کوشش کی  
لیکن وہ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتے ہوئے نکل گئے۔ پھر چند دستے خود ار ہوئے۔ ایک افسر  
نے معلم علی کو دیکھ کر پنا گھڑا روکا اور معلم علی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے  
سوال کیا: "کیا جو تم کیوں بھاگ رہے ہو؟"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ ہماری بیشتر فوج ان کے گھیرے میں  
آ چکی ہے۔"

سکا : پھر اس نے ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ادھر ادھر بٹ گئے۔

”معلم علی ! آصف نے تیرے وقت کے بعد کہا : مجھے اسی جگہ دفن کر دینا اور ابا جان سے یہ کہنا کہ میں نے تمام زخم سینے پر کھائے تھے۔ فضل کو میری طرف سے نصیحت کرنا کہ وہ کبھی کسی بزدل آدمی کی قیادت میں لڑنے کی غلطی نہ کرے۔ میں اپنی فوج کے سپاہی تھیں سوچتا ہوں۔ اور میرے جو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے لواحقین کے لیے حکومت سے اعانت حاصل کرنا تھا فرض ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی دن اڈیسر کے گورنر بنو اور پھر میری قبر پر اگر یہ کہو : آصف ! میں تھیں بھولا نہیں۔ ابا جان کی یہ خواہش تھی کہ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی کر دی جائے۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آج ہی ڈھاکہ کسی ادبچے گھرانے سے میرے لیے پیغام آیا ہے۔ تمہارے متعلق میرے دل میں ایک خواہش تھی، لیکن کاش میں یہاں آنے سے پہلے ابا جان کو کچھ بتا سکتا۔ معلم علی ! تمہیں ایک بھائی کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم ہوں گی۔ لیکن اب تمہیں شاید یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہ ہو۔ کو میں اپنے دل میں فرحت کا مستقبل تمہارے ساتھ وابستہ کر چکا تھا۔ معلم وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اسی جان کسی اور جگہ اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کے دل کا حال معلوم تھا اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ابا جان کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔ لیکن اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہو تو انہیں استاذ در بتا دینا کہ فرحت کے متعلق میری خواہش یہ تھی۔ یہ باتیں میں نے اس لیے کہی ہیں کہ فرحت کے دل کا حال مجھے معلوم ہے : نہیں چاہتی ہے جب تم اڈیسر کے محاذ پر جا رہے تھے اس کے آنسو مجھے بھانے کے لیے کافی تھے۔ اس سے پہلے میں نے اپنی فحش بہن کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ آصف نے یہاں تک کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

معلم علی نے ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے اپنی چھال کھول کر آگے

معلم علی کو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا ٹیلے کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے کناروں پر آصف بیگ کے سپاہی اور مرثوں کے درمیان گھسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ان کی آن میں وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر اپنی فوج کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جنگل کا لشکر دائیں اور بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑے کر جھیل کے گرد گھیر ڈالنے کے بعد مرثوں پر حملہ کر چکا تھا۔ مرثوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ حملہ جس قدر شدید تھا۔ اسی قدر غیر متوقع تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معلم علی کے سپاہی جھیل کے ارد گرد دشمن کی لاشوں کے انبار لگا چکے تھے اور مرثے انتہائی مراسمی کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے

قریباً چالیس منٹ کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔ شکست خوردہ دشمن کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی جو بوجھ اس کی حالت میں جھیل میں کودنے کے بعد ایک جھوٹے سے پاؤ پر جمع ہو گئے تھیں ڈال چکے تھے۔ جنگل کے ڈیڑھ سو سپاہی فوجی اور اتنی شہید ہوئے۔ آصف بیگ جس کا جسم زخموں سے پھلنی تھا۔ جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ چند سپاہی اور انفراس کے گرد کھڑے تھے۔ معلم علی جاگتا ہوا پسینا اور آصف کے قریب بیٹھ گیا۔

آصف نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”دست بردار رہو آئے !  
معلم علی نے ارد گرد کھڑے ہونے والے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا : جراح کو بلاؤ۔  
جلدی کرو !“

آصف بیگ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا : جراح کی ضرورت نہیں ! تم اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے یہاں آنے کی توقع تھی۔ اند میں تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ کسی باتیں ایسی تھیں جو میں تم سے نہیں کہہ

تمہیں مبارک باد کا متحق سمجھتا ہوں۔

مظلم علی نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کو آپ کے تعاقب کے لیے کھلے میدان میں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ بالخصوص اس حالت میں جب کہ وہ آصف بیگ کے ایک ہزار سپاہیوں پر اپنی قوارب کی تیزی آزما سکتے تھے۔"

میر جعفر نے کلمہ "آصف بیگ کی موت کا افسوس ہے۔ لیکن اگر وہ میری حکم مدد لی نہ کرتا تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی؟"

"لیکن اگر آپ بھی اس کی طرح جان دینا پسند کرتے تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی۔ میر جعفر کا چہرہ خستہ سے تمنا اٹھا۔ لیکن اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی۔"

مظلم علی نے قلمیے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چند کوس دور ایک قلعے پر حملے کی اجازت دی جائے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم پہلے ٹھاڈ میں جا کر اس ہم کے لیے عطا اللہ کی اجازت حاصل کرو؟"

"میں عطا اللہ خاں سے اجازت لے چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس جنگل سے شکست کھا کر بھاگنے کے بعد مرے اس قلعے کا رخ کریں گے۔ اس لیے میں کسی تاخیر کے بغیر شقیہی کرنا چاہتا ہوں۔"

میر جعفر نے کہا۔ "میں اس ہم میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"لیکن اس چھوٹی سی ہم کے لیے آپ کو تکلیف کرنے کی عذر دت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فوج کے ڈیڑھ ہزار سپاہی ساتھ لے جانے کی اجازت دیں۔"

"نہیں، میں خود بھی چلوں گا۔"

"بہت اچھا! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مرزا حسین بیگ کو آصف کی موت کی اطلاع

کردی۔ مظلم علی نے آصف کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد اس کا سراپی گود میں رکھ لیا۔

آصف بیگ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور خفیت آواز میں کہا۔ "میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کا آخری فرض پورا کر چکا ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹہ تک آصف کی یہ حالت رہی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتا اور مظلم علی سے چند باتیں کرنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیتا۔

مظلم علی میں بات کرنے کی طاقت نہ تھی وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوج کے سپاہی ان کے گرد سر جھکائے کھڑے تھے۔ آصف بیگ نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور آسمان کی نیلگوں فضاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبی آواز میں "ابا جان۔ امی جان۔ افضل۔ اور زحمت کے الفاظ چند بار دہرائے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔"

مظلم علی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر کچھ دیر اس کے سینے کے ساتھ کان لگانے کے بعد "ان اللہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اس کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اور جنگل کی خاموش فضا میں ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

مظلم نے شہیدوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور میر جعفر کو ٹٹائی کے واقعات کی اطلاع دینے کے لیے ایک افسر اور چند سپاہی روانہ کر دیئے۔



مزی کے کنارے میر جعفر بڑی بے حسینی کے ساتھ فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مظلم علی کو دیکھتے ہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ "فوج! تمہارا یہ اقدام میری خواہش کے مطابق نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کی جائے۔ لیکن میں

دینے کے لیے کوئی ایچی رواد کریں :

اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اب بتاؤ ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے ؟  
"ابھی اسی وقت !۔ معظم علی نے جواب دیا :

اگلے دن عروب آفتاب سے قبل بنگال کی فوج کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر  
سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکی تھی۔ میرجعفر کی حیثیت اس ہم میں ایک خاموش تماشا سے زیادہ نہ  
تھی۔ اور فوج کی کمان عملاً معظم علی کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن فتح کے بعد وہ عطاء اللہ خاں اڑیسہ  
کے صوبیدار، میردن اور علی درودی خاں کے نام اس قسم کے خطوط لکھ رہا تھا۔  
"خدا نے میں بہت بڑی فتح دی ہے۔ ہم نے اڑیسہ کی سرحد پر بیٹوں کا سب سے  
بڑا مستقر چھین لیا ہے۔ اب مجھے امید ہے کہ دشمن ایک مدت تک اپنے زحمت چاشنا  
رہے گا۔"

علی درودی خاں کے نام اس کے خط کے آخری فقرے یہ تھے : "اس حقیر غلام نے اپنی  
بساط کے مطابق حضور پُروردہ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے  
کہ مرثا آباد پہنچ کر حضور کی قدم پوی کا شرف حاصل کروں اور حضور کو یہ خبر بھی سنائوں کہ اڑیسہ  
کی سرزمین دشمن کے ذمہ نہ رکھ ہو چکی ہے۔"

قیصر سے دن عطاء اللہ خاں باقی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے کون درجہ  
تعمیل میں قیام کیا۔ اس مہرے میں اسے شمال مغرب کے سرحدی علاقوں پر مہم جوں کے بارہ حملوں  
کی خبر ملی اور اس نے معظم علی کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ کوچ کا حکم دیا۔

دس دن بعد معظم علی واپس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شمال مغرب کے سرحدی  
علاقے مرہٹوں کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ عطاء اللہ خاں نے معظم علی کو قلعے کی حفاظت  
پر متین کر کے کلک کی طرف کوچ کیا۔

تین ماہ کے بعد معظم علی نے دو بیٹے کی چھٹی لی اور مرثا آباد روانہ ہوا :

ایک روز دوپہر کے وقت مرزا حسین بیگ بنار کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اس  
کی بیوی، افضل اور فرحت اس کے بستر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل  
ہوئی اور اس نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ افضل جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ درخت  
برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم دا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، افضل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ حسین بیگ اسے دیکھتے  
ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل کی والدہ بڑی شکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر  
رہی تھی۔

معظم علی کی آنکھیں آنسوؤں سے بریر تھیں۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا : "بچا جان !  
چچی جان ! مجھے آنسو ہے کہ میں آخری منزل تک آصف کا ساتھ نہ دے سکا۔"

"بیٹھ جاؤ بیٹا ! حسین بیگ نے اس کی طرف پدرارہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
وہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالآخر حسین بیگ نے ہر سکوت توڑی  
"معظم ! میں اس کی قبر بیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا، لیکن بیماری کے باعث سفر کرنے  
کے قابل نہ رہا۔ مجھے تمہارا خط ملا تھا۔ لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اس کی شہادت کے تمام  
واقعات تمہاری زبانی سنوں :"

معظم علی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کر دیئے۔ جب وہ  
آسمانی موت کی تفصیلات سنا رہا تھا تو اس کی آواز اس کے قابض رہی تھی۔ فرحت  
سے متعلق وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ آخری لمحات میں آصف بار بار اپنی بہن  
کو یاد کرتا تھا۔

اس کے بعد معظم علی صبح شام حسین بیگ کی تیمارداری کے لیے جاتا اور کئی گھنٹے

ہاں امی جان! کیا آپ کے خیال میں نائب فوجدار بہت بڑا ہوتا ہے؟  
 نہیں بیٹا! میں تو دعا کیا کرتی ہوں کہ تم کسی دن بنگال کی فوج کے سپہ سالار بنو۔  
 تمہارے آبا جانا یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے۔ ہاں میں تمہیں ایک بات بتانا بھول  
 گئی تھی۔ آصف کی موت کی خبر آنے سے چند دن پہلے ڈھاکہ کا کوئی بہت بڑا رئیس، جو  
 مرزا حسین بیگ کا رشتہ دار ہے، اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں آیا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کے  
 لیے فرحت کا رشتہ مانگتے تھے۔ حسین بیگ کی بیوی کی یہی خواہش تھی کہ فرحت کی لگنی ہاں  
 کر دی جائے لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب آصف واپس آئے گا تو میں اس  
 کے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا، اور لڑکے کو دیکھ کر فیصلہ کر لوں گا۔ بیٹا! میں کبھی کسی سوچا کرتی تھی کہ  
 فرحت میری ہو بنے گی لیکن ایک دن میں نے تمہارے ابا سے ذکر کیا تو وہ مجھ پر برس پڑے  
 کہنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے ٹھکانا چاہتی ہو۔ مرزا صاحب کا یہ احسان قبول ہے  
 کہ وہ ہمارے ساتھ اس قدر مہربانی سے پیش آتے ہیں تمہیں معلوم نہیں کہ وہ خاندان جس نے  
 فرحت کا رشتہ مانگا ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو گاؤں کا مالک ہے، پھر بھدی اگر کوئی حیثیت ہوتی  
 بھی تو مرزا حسین بیگ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی بلدی سے باہر لڑائی کا رشتہ  
 کریں گے۔ اگر تمہارے آبا جانا بخیر نہ کرتے تو میں شاید فرحت کی ماں سے اس کے متعلق پوچھ  
 بیٹھتی۔ فرحت بہت اچھی لڑکی ہے، اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ میری  
 بہو بنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہاری ترقی کے لیے بہت دعا کیا کرتی ہوں کبھی کسی میں یہ سوچتی  
 ہوں کہ مرزا صاحب تم سے بلا وجہ اس قدر محبت نہیں کرتے۔ جو سکتا ہے کہ انہوں نے  
 فرحت کے متعلق اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رکھا ہو اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہوں جب  
 تم اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اپنے خاندان کے لوگوں کی ہماری کا دعویٰ کر سکو۔ ورنہ  
 فرحت کے لیے کھنڈ کے ایک بہت بڑے گولے کا رشتہ بھی آیا تھا اور مرزا صاحب نے اس کی  
 طرف توجہ نہیں کی۔

اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مرزا بکاد میں اس نے ابھی کوئی بیس دن گزارے تھے کہ اسے میردن  
 نے اپنے پاس بلایا اور کہا: معظم علی! سرحد کے حالات ٹھیک نہیں۔ مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا  
 ہے اور جاسوسوں نے ملی دردی خاں کو اطلاع دی ہے کہ عطار اللہ خاں اور میر جعفر کلک  
 میں میٹر حکومت کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً سر  
 قلعے میں پہنچ جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ یہ لوگ مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز  
 نہ کر سکیں۔

اگر حالات ایسے ہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا۔

میرمدن نے میر سے ایک کاغذ اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ تمہارا  
 نئے عہدہ کے متعلق ملی دردی خاں کا حکم نامہ ہے۔ تمہیں اڑیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت  
 میں سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری کمان میں مستقل طور پر دو ہزار سپاہی دیئے  
 گئے ہیں اور کلک کے صوبیدار کو یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ سرحد پر دفاعی چکیاں تعمیر کرنے  
 کے لیے سرکاری خزانے سے مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔ آج تمہارے لیے کوچ کی تیاری کرنا  
 مشکل ہو گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح تھکے روانہ ہو جاؤ۔ عطار اللہ خاں کو یہ حکم  
 بھیج دیا جائے گا، کہ وہ مزید ایک ہزار سپاہی تمہاری کمان میں دے دے۔

میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی اپنے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بالا خانے کے ایک  
 کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

مستم علی نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا: امی جان! میری چھٹی منسوخ کر دی گئی  
 ہے اور میں کل صبح یہاں سے جا رہا ہوں۔

ماں نے پریشان ہو کر کہا: بیٹا تمہیں کسی خطرناک مہم پر تو نہیں بھیجا جا رہا ہے؟

نہیں امی جان! مجھے اڑیسہ کے سرحدی اضلاع کا نائب فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔

نائب فوجدار؟ ماں نے چونک کر سوال کیا۔

## پچھٹا باب

عطار اللہ خاں کنک کے قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ عطار اللہ خاں نے کہا: مجھے کل ہی تمہارے متعلق حکم ملا تھا۔ میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا نیا عہدہ اڑیسہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟

”اگر فوج تیار ہے تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“  
”فوج کے لیے چند دن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جو دستے تمہاری کمان میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ بردوان اور میدنا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں آج ہی انہیں حکم بھیجتا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی تازہ سرگرمیوں کے پیش نظر میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سپاہیوں کو وہاں سے سیدھا سرحدی قلعے میں پہنچے گا حکم بھیج دیں۔ میں کل علی البصیح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“  
”بہت اچھا۔ میں ابھی انہیں حکم بھیج دیتا ہوں۔ آج آپ میرے جہان میں میں نے میرے جہاز سے آپ کی ترقی کا ذکر کیا تھا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔“  
”میرے جہاز یہاں ہیں؟“ میرا تو خیال تھا کہ وہ بردوان میں ہوں گے۔“

”امی جان!“

”کیا ہے بیٹا؟“

”کچھ نہیں امی جان۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے آپ کو بھائی یوسف کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔“

”ماں نے جواب دیا: یوسف کے لیے تین رشتہ آئے ہیں۔ لیکن وہ تینوں لڑکیاں مجھے پسند نہیں۔ عبداللہ خاں کی لڑکی مجھے پسند تھی۔ لیکن وہ یہیں۔ ۷ کلکتہ جا چکے ہیں۔ تمہارے آبا جان نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر انہیں فرصت نہیں ملی۔ پچھلے ہفتے ان کا خط آیا تھا کہ وہ اس سال حج کے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ حج سے واپس آئیں گے تو میں تمہارے آبا جان کو ضرور دیکھوں گی۔“

معظم علی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ ماں نے پوچھا۔

”مرزا صاحب کے پاس۔“

”دروازے کے قریب پہنچ کر معظم علی نے مرزا کے طرف دیکھا اور کہا:“

”امی جان! پچ بتائیے آپ کو فرصت بہت پسند ہے؟“

”ہاں بیٹا!“

”لیکن امی جان میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔“

”جھوٹا کہیں کا۔“ ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور معظم علی ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا : "وہ ایک مزدوری مشین کے لیے یہاں آئے تھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان سے خوش نہیں۔ کیجئے آپ مرشد آباد میں حضور نواب صاحب سے ملے تھے؟"

نہیں! "معظم علی نے جواب دیا : "میں دہلی صوفیہ میرمن سے ملا تھا۔ اچھا یہ بتائیے آپ نے میرمن سے میرجعفر کے متعلق کوئی بات کی تھی؟"

"نہیں ان کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

عطاء اللہ خاں نے قلم سے وقف کے بعد کہا : "میرجعفر کا خیال ہے کہ دربار میں کلبش امراء ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے بھی خبردار کیا ہے کہ مرشد آباد میں تمھارے خلاف بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں۔"

"میرا تو یہ خیال ہے کہ حکومت مرہٹوں کے خلاف آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے تاہم اگر آپ بڑا مایوس تو ہیں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ جیسے شخص دوستوں کے نیک مشوروں کی ضرورت ہے۔ کیجئے؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرجعفر کے متعلق عطا دیں۔ میرجعفر اگر کوئی غلطی کریں تو ان کا سب سے بڑا منتظر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بنگال کے مکران کے رشتہ دار ہیں۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا : "آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر میرجعفر کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو عطا رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ کے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ میرجعفر مجھے ہکا سکتا ہے؟"

معظم علی نے پریشان ہو کر جواب دیا : "میں نے یہ نہیں کہا کہ میرجعفر آپ کو ہکا سکتا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ آپ عطا دیں۔"

عطاء اللہ چند تائین غور سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا : "معظم علی! میں تمھیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔ اگر مرشد آباد میں میرے دشمن میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں تو مجھے آگاہ کرنا تمھارا فرض ہے۔"

"مجھے آپ کے خلاف کسی سازش کا علم نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر پریشان ہوں گے تو میں آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔ میرجعفر کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ بنگال میں ہر سازش سب سے پہلے ان کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔ وہ چند عبادہ پسندوں کو پہلے حکومت کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور پھر اپنی دغا داری کا ثبوت دینے کے لیے علی وردی خاں کو باخبر کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کھل دی جاتی ہے۔ چنانچہ مرہٹوں اور ان کے ساتھ چند بے گناہ مارے جاتے ہیں اور میرجعفر کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی انتہائی نااہلی کے باوجود وہ حکومت کے لیے ایک کارآمد آدمی ہیں۔ میں تو یہاں تک عموماً کرتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا۔ جب علی وردی خاں کو امراء کی آئے دن کی بغاوتیں اسی قدر بدل کر دیں گی کہ انھیں میرجعفر کے سوا اپنا کوئی خیر خواہ نظر نہ آئے گا اور یہ دن بنگال کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا : "میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میرجعفر کیا کرنا چاہتا ہے اور علی وردی خاں اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔"

"ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں سے کہا : "میرجعفر تشریف لائے ہیں۔"

معظم علی نے اٹھ کر کہا : "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"بہت اچھا۔" عطاء اللہ خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا : "آپ میرے مکان پر جا کر آرام کریں۔"

میرجعفر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے

بعد معظّم علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ کب آئے؟"

میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔

تشریف رکھئے! "میر جعفر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"نہیں، مجھے اب اجازت دیجیئے!"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "میر صاحب! یہ بہت تنگے ہوئے ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ ہم شام کے وقت باتیں کریں گے۔"

پھر وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "تم انھیں میرے مکان پر چھوڑ آؤ۔"

معظّم علی سپاہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میر جعفر اور عطاء اللہ خاں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میر جعفر نے کہا: "اس نوجوان کے متعلق آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ میرمدن کا خاص آدمی ہے۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "میں اسے جانتا ہوں اور آپ نے کل جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ وہ کسی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ معظّم علی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ حکومت کے جاسوس ہمارے متعلق کافی جوکس ہیں۔ معظّم علی آپ کو میرا دشمن سمجھتا ہے اور اس نے مجھے آپ کے متعلق خبردار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔"

میر جعفر کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ "آپ نے کہیں اسے اعتماد میں لینے کی کوشش تو نہیں کی؟"

نہیں میر صاحب! میں اتنا جو قوت نہیں ہوں۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے عوام کے متعلق کس حد تک باخبر ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرثیہ میں میرے متعلق کوئی خطرناک اطلاع نہیں پہنچی۔ تاہم یہ آپ کی جتنی ہے کہ آپ کو ہر جگہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اب تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فوج کے انصر میرے ساتھ ہیں۔ صوبیدار نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا۔ تو دقت آنے پر اس کے گھر

کا گھارو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نوجوان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسے بروقت ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میرے نزدیک ہر آدمی کے ضمیر کی ایک قیمت ہے۔ لیکن معظّم علی اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ پوری قوت کے ساتھ ہماری مخالفت کرے گا اور سرحدی اضلاع کی چوکیوں کے گماندار کی حیثیت سے اس کی مخالفت ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کرے گا۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سرحد تک پہنچنے کا موقع دیا جائے؟"

نہیں، یہ ضروری نہیں۔

میر جعفر نے کہا: "لیکن موجودہ حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔"

"ہم اس پر ہاتھ ڈالنے بغیر اسے سرحد تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں۔ میر حبیب کا ایلچی اگر دلپس نہیں چلا گیا تو اسے یہ پیغام دے کر روانہ کر دیجیے کہ معظّم علی صبح یہاں سے روانہ ہوگا اور یہ وہی نوجوان ہے جس نے مرزا حسین بیگ کی جوبلی کی حفاظت کی تھی۔ آپ اسے یہ بھی بتا دیں کہ وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہوگا۔ مرثیہ آباد سے صرف آٹھ سپاہی اس کے ہمراہ آئے ہیں اور یہی اس کے ساتھ یہاں سے جائیں گے۔ سنگھ اور سرحدی علاقے کے درمیان کئی مقامات ایسے ہیں۔ جہاں میر حبیب کے آدمی اس کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تجویز کامیاب ہوگئی تو ہمارے راستے سے ایک پتھر مٹ جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا؟"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میں اسے بتا چکا ہوں کہ اس کے حصے کی فوج بردوان اور مینا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

میر جعفر نے کہا: "آپ میری توقع سے زیادہ دوراندیش ہیں۔"

عطاء اللہ خاں نے مسکرا کر کہا: "میر صاحب! یہ سب آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

اگلے روز صبح کی نماز کے بعد معظّم علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے سے باہر



نکل ہے تھے کہ میر جعفر دروازے کے قریب ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”معظم علی ٹھہرو! اس نے اپنا ہاتھ بند کرتے ہوئے کہا۔

معظم علی نے گھوڑا روکا۔ میر جعفر نے کہا: مجھے تمھاری فرض شناسی کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ تم فوج کو ساتھ لے کر جاتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر راستے میں تمھیں کوئی خطر پیش آیا تو یہ آٹھ آدمی تمھاری حفاظت کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔“

معظم علی نے جواب دیا: میری حفاظت کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں اور میں فوج کے انتظار میں یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

”بہر حال تمھیں راستے میں بہت خطرات رہنا چاہیے۔ گزشتہ چند دنوں میں مرہٹے یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر کئی بستیاں لوٹ چکے ہیں۔“ یہ کہہ کر میر جعفر، معظم علی کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”معظم علی بنگال کی فوج کا بہترین سپاہی ہے اور اس کی جان بہت قیمتی ہے“ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کا خیال رکھو!“

معظم علی نے کہا: ”آپ میری خور کریں۔“



دن بھر سفر کرنے کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت ایک گاؤں کے زمیندار کے ہاں قیام کیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت وہ ایک ندی کے قریب ٹھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے ڈکے۔ ندی کے دونوں کناروں پر گھنے درخت تھے۔ کچھ دیر سنانے کے بعد وہ ٹھہر کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ درختوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول رہے تھے کہ اچانک چاروں طرف درختوں کی اڑے قریباً پچاس مسلح مرہٹے نمودار ہوئے۔ معظم علی کے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں پر سوار ہونے یا بندہ قیں سمجھانے کا موقع نہ تھا۔ پچاس آدمی بندہ قیں سیٹھی کیے ان کے گرد گھیر اڑل رہے تھے۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا: ”اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمھارے لیے یہی بہتر

ہے کہ تم ہتھیار پھینک دو!“

معظم علی چند لمحوں کے اندر پریشانی کی حالت میں کھڑا ہوا۔ بالآخر اس نے اپنی بندوق اور تلواریں ہتھ میں لے کر اس کے ساتھیوں نے اس کی تلقین کی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی چاہنے لاس سے اس جتنے کا سردار معظم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر سوال کیا: ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

معظم علی نے جواب میں کہا: تمھیں ہم سے سوالات پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“

مرہٹہ سردار بولا: ”ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“

مرہٹہ سردار نے جواب دیا: ”قیدیوں کو ایسے سوالات کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ میں تمھاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر کسی نے راستے میں جھگڑنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“

مرہٹہ سردار کے اشارے سے چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑوں اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے ہاتھ رتوں سے جکڑ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ جنگوں اور پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد انھیں سرد کے پار ایک گاؤں کے قریب مرہٹہ فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کی بندوقوں کے پہرے میں پڑاؤ عبور کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچے اور پھر ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک قلعہ محرابی کے اندر داخل ہوئے۔ مرہٹہ فوج کے چند سپاہی انھیں دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔

معظم علی کو گرفتار کرنے والے دستے کے سردار نے ان کے افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سپر سالار کا حکم ہے کہ ان قیدیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انھیں کوئی تکلیف

زدی جائے۔ لیکن اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کسی وقت کے بغیر چپانی پر لٹکا دیا جائے۔ سپہ سالار کچھ عرصہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ پھر اس نے معظم علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ بنگال کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں اور سپہ سالار کی ہدایت ہے کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: انھیں لے جاؤ اور کوٹھڑیوں کے اندر بند کر دو۔ لی الحال ایک کوٹھڑی میں دو قیدی بند کیے جائیں۔

معظم علی نے آگے بڑھ کر افسر سے سوال کیا: "میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ ہم کس کی قید میں ہیں؟"

اس نے بے رخی سے جواب دیا: ایک قیدی کو ایسے سوالات پوچھنے کا حق نہیں۔ پھر وہ سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "انھیں اکبر خاں کے ساتھ بڑی کوٹھڑی میں رکھو۔"

پھر ملکہ، قیدیوں کو جلی کے ایک طرف لے گئے۔ معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کو چار کوٹھڑیوں میں بند کر دیا اور اس کے بعد انھوں نے ایک کشتہ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور معظم علی کو اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔

معظم علی کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا اور پھر ملکہوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر کوٹھڑی کے درمیان بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کواڑ کے دروازے سے پہرے کے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ فرش پر کھجور کی چٹائیاں بھی ہوئی تھیں۔ معظم علی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ معاسے کوٹھڑی کے ایک تارک کو نے میں ایک اور قیدی دکھائی دیا جو بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: بھائی! معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے کچھ عرصہ کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے معارف ہو جائیں!

قیدی جلدی سے ایسا کرانگے بڑھا اور معظم علی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا: "میرا نام اکبر خاں ہے۔ مجھے مرہٹوں کی قید میں آج یاقین بمبئی لائے گئے ہیں۔ پہلے مجھے

اس جلی کے اندر گھونسنے پھر سنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی ایس دن ہونے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، جب سے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔"

معظم علی حیرانی کے عالم میں قیدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ چودہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ و سپید چہرے کے تھکے نقوش میں غایت درجے کی جاذبت تھی۔

"تھیں کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا، لیکن لڑکے نے در سے برہم ہو کر جواب دیا۔

معظم علی نے کہا: تمھاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

لڑکے نے اس سوال کے جواب میں معتقراً اپنی مرکزشت شروع کر دی:

"میرا گاؤں مدھیکھند میں ہے۔ عظیم خاں میرے آبا جاجان تھے اور وہ اپنے علاقے کے سردار تھے۔ انھیں گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ وہ راجپوتانہ سے گھوڑے خرید کر کبھی کبھو اور کبھی حیدرآباد میں فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا بڑا بھائی عام طور پر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس سال میں نے ضد کی اور وہ اس کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ساتھ چالیس مسلح و فوج تھے اور ہم راجپوتانہ سے ڈیرہ سوگھڑے خرید کر کبھو کی طرف آ رہے تھے۔ راستے میں ادھ کی سرحد سے تھوڑی دور مرہٹوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ابلجان اللہ خان کے ساتھ چندہ اور آوی ملوانی میں شہید ہو گئے۔ سات آدمی مرہٹوں نے گرفتار کر لیے اور باقی بھاگ گئے۔ مرہٹوں کے سردار نے باقی آدمیوں کو تاشی لے کر کھڑ دیا، لیکن مجھے اپنے پاس رکھا اور چند دن بعد میرے صیب کے پاس بھیج دیا۔ میرے صیب نے مجھے یہاں سپنا دیا۔ وہ کبھی کبھی چند دن کے لیے یہاں آتا ہے اور ہمیشہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے: تمھیں میرے سپاہیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی؟ اگر میں کسی کی شکایت کرتا ہوں تو اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ لیکن جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھر پہنچا

دیا جلتے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ جب میں روہیکھنڈ پر حملہ کروں گا۔ تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارے باپ نے اپنے گھر میں ہمشیر دولت جمع کر رکھی ہے اور جب تم مجھے اپنے گھر کا خزانہ تلاش کرنے میں مدد دو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے گھر میں کوئی خزانہ نہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر تمہیں خزانے کا علم نہیں تو تم تمہارے بھائی سے پوچھ لیں گے۔ میر حبیب کو یہ یقین تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ ایک شام میں یہاں سے بھاگ گیا اور ساری رات جھنڈوں اور پہاڑوں میں گھومتا رہا۔ لیکن صبح کے وقت چند سوار مجھے دوبارہ گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔ خوش قسمتی سے میر حبیب یہاں نہیں تھا اور اس کے سپاہیوں نے مجھے اس کوٹھڑی میں بند کرنے کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی۔ جب میر حبیب آیا تو اس نے مجھے دودن بھوکا رکھنے کی مرادی۔ اب پھر میر مجھے صبح شام تنہا دیکر کے لیے اس کوٹھڑی سے باہر نکالتے ہیں۔ لیکن ان کا پہرہ اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اب میر سے لیے دوبارہ بھاگ نکلنا ممکن نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی ان کی قید میں ہیں۔ بتائیے آپ یہاں کیسے پہنچے؟

معلم نے جواب دیا: میں کلک سے اڑیہ کے ایک سرحدی قلعے کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مرہٹوں نے اچانک حملہ کیا اور مجھے گرفتار کر لیا۔ تم سے باتیں کرنے سے پہلے مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں میر حبیب کی قید میں ہوں۔



چھ ماہ بعد ایک صبح چار مسلح سپاہیوں نے معلم علی کوٹھڑی سے نکالا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ معلم علی کوئی سوال کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ سپاہی ایک کمرے کے دروازے پر دھکے مارے اور معلم علی ان کے اشارے پر کمرے کے اندر داخل ہوا۔ یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اور دو آدمی قالین پر بیٹھے

شترچ کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں اپنے لباس سے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ایک نے ہلاتا ہوا نوجوان تھا اور دوسرا جس کی عمر چالیس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی دوسرے جسم کا ایک بارعب آدی تھا۔

تمہارا نام معلم علی ہے؟ قوی بیکل آدی نے سوال کیا۔

ہاں! معلم علی نے جواب دیا۔

میں نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی قیدی کو بلاوجہ تکلیف نہ دی جائے۔ تمہیں میرے آدمیوں سے کوئی مشکایت تو نہیں؟

معلم علی نے جواب دیا: ایک قیدی کو کیا مشکایت ہو سکتی ہے؟

ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو بہت زیادہ محسوس نہ کرو۔ میں ہمارے اس عورت کرتا ہوں اور تم مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت میں اپنی جرأت و ہمت کا ثبوت دے چکے ہو۔

معلم علی نے کہا: آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں۔

تمہارے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ سرحد کا نائب فوجدار اس کے اٹھ ساتھی کہیں دوپوش ہو گئے ہیں اور میر سے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا، کہ یہ نائب فوجدار کون ہے؟

میں اپنی ذات کے لیے آپ سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔ لیکن اگر آپ میر حبیب ہیں تو میں بیگل سے آپ کی دشمنی کی وجوہات پوچھنا چاہتا ہوں۔

میر حبیب نے جواب دیا: میں کسی کا دوست ہوں نہ دشمن۔ میری دلچسپی صرف بیگل کے حکمران اور امارت کی دولت سے ہے۔

لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں؟

مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کسی دولت مند

آدی کے بیٹے نہیں ہو۔ لیکن اگر تم مجھے کسی دولت مند آدمی کے گھر کا پتہ بتاؤ تو مجھے تمہارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

معظم علی نے مختصر سے ہنٹ کاٹتے ہوئے کہا: "میں تمہیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہوں اور وہ مرشد آباد کا قیفاں ہے۔"

میر حبیب نے بے پروائی سے جواب دیا: "قیفاں میں وہ جلتے ہیں جن کی کسی کو بھی ضرورت نہ ہو اور میں بدترین حالات میں بھی بنگال کے حکمران کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اسے میری ضرورت ہے۔ تم ایک زمین کوئی پوچھیں میں حیران ہوں کہ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تم بڑے بڑے امراء کی تجویزوں پر پیرہ دے کر بنگال کی کوئی خدمت کر رہے ہو؟"

مگر تمہیں اسی بات کا افسوس ہے کہ تمہارے سپاہی حسین بیگ کے گھر سے نامراد واپس آئے تھے تو میں تمہاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں۔ مرزا حسین بیگ کے گھر میں روپیہ نہیں بکھرتا تھی جس کی حفاظت ہر شریف آدمی کا فرض تھا۔ میر حبیب نے جواب دیا: "میں نے اپنے جیسے جیسے میں کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو موت کے معنی سمجھتا ہو۔ وہ صرف دولت اور حکومت کے معنی سمجھتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "میں جس بنگال کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں وہ صرف امیروں اور حکمرانوں کا بنگال نہیں ہے میرا وہ بنگال ہے جسے لاکھوں مسلمان اپنا او اپنی آنے والی نسلوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور یہ اسے چوروں، رابرزوں اور انسانیت کے دشمنوں سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

نوجوان! میں تمہارے خیالات کی داد دیتا ہوں۔ لیکن جس بنگال کو میں جانتا ہوں اس کے محافظ میرے نزدیک باہر کے رہنروں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دن بہت جلد آئے گا جب تم بنگال کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے متعلق سوچنا زیادہ بہتر سمجھو گے صرف

علی مدنی خاں کے اکھیں بند کرنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم بنگال کے متعلق سوچنا بھی تمہارے لیے سمجھو گے۔ اتنی دیر شاید تم میری قید میں رہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے ہی تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی آجائے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ تمہارا تعاون قبول کروں گا۔ پھر ہم بنگال کے شہر نہیں بلکہ اپنے متعلق سوچیں گے۔ بالکل مرشد آباد کے امراء کی طرح، جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو ملی وردی خاں کا واحد جانشین سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کے فساد کے جواب میں میں بھی یہ نعرہ لگانے کا حق ہے کہ بنگال ہمارا ہے۔

معظم علی نے کہا: "اگر آپ کی وفات سے مجھے دلی ماتحت ملنے کی امید ہو تو مجی میں ایک قیدی کی حیثیت میں گنتا می کی موت کو ترجیح دوں گا۔"

میر حبیب نے کہا: "انسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں چند ماہ یا چند برس انتظار کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ حوالی کے اندھکھٹے پھرنے کی پوری آزادی ہوگی، لیکن اگر تم نے جلد گتے کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

معظم علی کمرے سے باہر نکلا اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ چوروازے کے باہر کھڑے تھے چل دیا۔



علی وردی خاں کی افواج، میدان پور کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ میر حسن علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا۔ اور تین دفعہ فری سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔ علی وردی خاں کی مسند کے پیچھے دو محافظ نئی تلواریں لیے کھڑے تھے۔ میر حسن چند تانبے خوف و خطر اب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر علی وردی خاں نے کہا: "ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عطار اللہ خاں یہاں حاضر ہونے سے کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟"

"ماہیاجہ! مجھے معلوم نہیں۔"

علی دردی خاں نے کہا: ہمارے خلاف کوئی سازش تھا رے منم کے بغیر نہیں ہوتی۔  
 "عالیجاہ! اگر مجھے اس کی سازش کا علم ہوتا تو میں اس کا سرے کر حضور کی خدمت  
 میں پیش ہوتا۔"

"اس کے سرے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس  
 کے عزائم کیا ہیں اور اسے ہماری فہم عدلی کی جزا کیسے ہوئی اور منظم علی کا آج تک کیوں پتر  
 نہیں چلا؟"

"عالیجاہ! ملک کا صوبیدار آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہے۔ جہاں تک میری  
 معلومات کا تعلق ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسر عطار اللہ خاں  
 کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس کی نیت بری ہو تو ہم وہ موجودہ حالات میں حضور کے خلاف کوئی  
 سازش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی جان کے خوف سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے  
 پس و پیش کرتا ہے۔ میں نے حضور کا حکم ملنے ہی معظم علی کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ بد قسمتی  
 سے جس دن وہ ملک سے روانہ ہوا تھا۔ میں وہیں تھا اور میں نے اسے یہ کہا تھا کہ تم آٹھ آدمیوں  
 کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے فوج کا انتظار کرو اور میرے اس مشورے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے  
 سرحد کے آس پاس مرہٹوں کی سرگرمیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن معظم علی ایسے مشورے سننے  
 کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مارا گیا ہے یا قید ہو گیا ہے۔ بہر حال وہ ملک  
 سے میرے سامنے روانہ ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عطار اللہ خاں نے اس کے خلاف کوئی  
 سازش کی ہو لیکن یہ ثابت کرنا آسان نہیں۔"

علی دردی خاں نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا: "عطار اللہ خاں کے متعلق تمہارا کیا  
 مشورہ ہے؟"

"عالیجاہ! میرا خیال ہے وہ ڈر کے مارے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ میری یہ  
 درخواست ہے کہ حضور کوئی اہم اٹھانے سے پہلے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دے اگر

اس کی نیت خراب ہے تو ممکن ہے میں اسے یہ سمجھا سکوں کہ تمہاری سازش طشت از بیم  
 ہو چکی ہے اور تمہارے بچاؤ کی اب یہی ایک صورت ہے کہ تم کسی وقت کے بغیر حضور کی خدمت  
 کے لیے حاضر ہو جاؤ۔"

علی دردی خاں نے کہا: اے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں اگر تم اسے راہ راست  
 پرلا سکتے ہو تو اسے کہو کہ وہ استغفار دے کر سیدھا مرشد آباد چلا جائے۔  
 "عالیجاہ! اگر میں اسے یہ یقین دلا سکوں کہ آپ نے اس کی جان بخشی کا دعو کیا ہے تو  
 مجھے یقین ہے کہ وہ مرشد آباد جانا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔"

"تمہیں غلاموں کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ بہر حال اگر وہ راست پر آجائے تو ہم  
 اس کے لیے معمولی سزا کافی سمجھیں گے۔"



رات کے وقت عطار اللہ خاں اپنی قیام گاہ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے نوکر نے  
 اسے جگایا اور کہا: "میرے حضرت تشریف لائے ہیں اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتے  
 ہیں۔ میں نے انہیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ ان کے ساتھ فوج کے دو  
 افسر بھی ہیں۔"

عطار اللہ خاں پریشانی کی حالت میں لباس تبدیل کیے بغیر نیچے اترا اور ملاقات کے  
 کمرے میں داخل ہوا۔ میرے حضرت نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی  
 طرف متوجہ ہو کر کہا:

"تم جا کر سپاہیوں کے آرام کا بندوبست کرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

فوجی افسر اٹھ کر باہر نکل گئے اور میرے حضرت نے عطار اللہ خاں سے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ  
 میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو بروقت  
 خبردار کیا جائے۔"

جائے گا۔

میر جعفر نے جواب دیا : میں یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میر حبیب ایک ڈاکو ہے۔ اور اس کی دوستی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بنگال کے اندرونی غنڈہ فروش سے فائدہ اٹھانے کی امید پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اسے آپ کی کامیابی کا یقین ہو۔ لیکن جب آپ ایک شکست خوردہ آدمی کی حیثیت میں اس کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو چند ٹکوں کے عوض میں علی دودی خاں کے ہاتھ فروخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر مستغنی نہ ہوئے تو بھی علی دودی خاں آپ کو سبکدوش کر دے گا۔ اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ابھی انھیں یہ کہیں کہ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کا اعتماد دکھو چکا ہوں اور میرے مخالفین آپ کو بھن کرنے کے لیے میرے متعلق ہی قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ آپ کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستغنی ہوجاؤں اور آپ سے یہ درخواست کروں کہ مجھے مرشد آباد میں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنے کی اجازت دی جائے لیکن اگر آپ کو کسی دقت میری نیک نیتی کا یقین آجائے تو مجھے ہر وقت اپنی خدمت کے لیے تیار رہائیں گے :

عطار اللہ خاں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا : میر صاحب آپ کو یقین ہے کہ مستغنی دینے کے بعد مرشد آباد جانا میرے لیے خودکشی کے مترادف نہیں ہوگا ؟

نہیں ! بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کو مرشد آباد پہنچے ہی علی دودی خاں کا یہ بیخا ملے گا کہ ہمارے تمام شکوک دور ہو چکے ہیں اور تمہیں فلاں عہدہ پر مامور کیا جاتا ہے۔

عطار اللہ خاں نے کہا : مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اتنی جلدی بازی لڑ چکا ہوں۔

میر جعفر نے تسلی دیتے ہوئے کہا : میرے دوست آپ نے بازی نہیں ہاری۔

وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عطار اللہ خاں کچھ دیر انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں جھڑکی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا : معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہیں۔ مجھے مینا پور میں علی دودی خاں کی آمد کی اطلاع ملے ہی یہ خدمتہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی ساتھی نے انھیں ہمارے ارادوں سے خبردار کر دیا ہے۔ میر جعفر نے کہا : مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ لیکن آپ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آپ علی دودی خاں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ میرا آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ مینا پور میں علی دودی خاں کی غیر متوقع آمد کے بعد ہماری سازش کی کامیابی کے امکانات بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اس کے شکر کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اگر وہ شک پیچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی فوج کے بیشتر سپاہی اپنی شکست کو یقین سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ کہ مستغنی دے کر مرشد آباد روانہ ہوجائیں۔ میں نے علی دودی خاں کو آپ کی طرف سے طعن کرنے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ مستغنی ہو کر مرشد آباد چلے جائیں تو آپ پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی :

عطار اللہ خاں کچھ دیر پٹی پٹی نگاہوں سے میر جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا :

علی دودی خاں نے آپ سے بھی استغنے کا مطالبہ کیا ہے ؟

نہیں اور اگر آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔

عطار اللہ خاں نے جواب دیا : میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد کی پناہ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ میر صاحب آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیتا ہوں۔ میر حبیب مرحوم سے زیادہ دور نہیں۔ ہمیں اس سب کی پناہ لے کر علی دودی خاں کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کا وقت مل

تمہارا استعفا منظور کر لیا ہے۔ سابقہ غلطیوں کے بارے میں تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ لیکن آئندہ کے لیے تمہیں بے حد محتاط رہنا چاہیے!

اور علی دردی خاں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا: ہاں، اور اسے یہ بھی کھدو کہ اس کی سابقہ فوجی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے گزارے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا جائے۔

علی مددی خاں اپنی عمر کی آخری منزل میں قدم دکھ چکا ہے۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم چند مہینے یا چند برس اور انتظار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی شکست کا اعتراف کرنے یا ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دینے نہیں آیا بلکہ یہ مشورہ دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ ہتھیار اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں:

عطاء اللہ خاں نے کہا: میرا صاحب! جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے تو آپ نے مجھے یہیں بتلایا تھا کہ مجھے کئی صورت حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اب اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو میں استعفا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن استعفائے کا جواب آنے تک میرا یہاں رہنا ضروری ہوگا۔ پھر گھٹی مددی خاں نے مجھے مرشد آباد جانے سے منع کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آپ کو جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ استعفا دینے کے لیے کریں۔ اب کسی تاخیر کے بغیر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ علی دردی خاں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا۔ عطاء اللہ خاں نے اٹھ کر دھڑکتے کے قریب جا کر ڈکڑ کو آواز دی اور کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ اب پھر میر جنرل کی طرف متوجہ ہو کر بولا: میرا صاحب! استعفائے کا مضمون لکھنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔

بہت اچھا! میں بولتا جاؤں گا اور آپ کہتے جائیں:

دوسرے روز علی الصباح عطاء اللہ خاں مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا اور اس کی روانگی کے چند من بعد مر حجاز مینا پور پہنچ کر علی دردی خاں سے یہ کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! خدا کا نچو ہے کہ اس نے میری باتوں میں اگر استعفا دے دیا، ورنہ اس کے عزائم بہت خطرناک تھے، مرشد آباد میں وہ حضور کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے جاسوس ہر وقت اس کی مٹولی کے لیے موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی نادان دوست نے بہکایا تھا۔ اب اگر حضور کی اہم بات ہو تو میں اسے یہ کھٹنا چاہتا ہوں کہ حضور والا شان نے

## ساتواں باب

میرحبیب کی قید میں معظم علی کے لیے زندگی صبح و شام کے ایک بے کیف تسلسل کا نام تھی۔ اسے بنگال کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ قید کی تنہائی میں اکبر خاں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ذہنی کرب کے باعث معظم علی کئی کئی گھنٹے خاموش رہتا اور اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا: "بھائی جان! آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خدا ہماری مدد کرے گا اور ہم بہت جلد ان ظالموں کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کہتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ میں بردقت آپ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ آپ کہتے تھے خدا اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔ لیکن آج آپ غموم ہیں۔"

جب مسکرانے کی کوشش کے باوجود اکبر خاں کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں تو معظم علی خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر اسے تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ "اکبر میں اپنے متعلق نہیں، بلکہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وطن کیا جگہ ہے؟"

پھر وہ آپس میں بار بار کی ہوئی باتیں دہراتے اور حال کی مایوسیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش کرتے۔ اکبر خاں اپنے وطن کے حسین

اور دلکش مناظر بیان کرتا اور معظم علی اسے مرشد آباد کی ان گلیوں اور مکانات کے متعلق بتاتا جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک دوسرے کا وطن دیکھنے کا وعدہ کرتے۔

اکبر خاں اپنی عمر کے عام بچوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ اور ذہین تھا۔ وہ معظم علی کو اس حویلی کے اندر اور باہر مرہٹوں کے کیمپ کے تمام حالات بتا چکا تھا۔ ذرا کی کوشش سے پہلے جب اسے ادھر ادھر گھومنے کی آزادی تھی وہ پڑاؤ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ معظم کو بتا چکا تھا کہ مرہٹے گاؤں کے اصل باشندوں کو نکالنے کے بعد ان کے مکانات پر قبضہ کر چکے ہیں۔ بیشتر مکانات ان کے گھوڑوں کے لیے اصطبلوں کا کام دیتے ہیں اور بعض مکانات میں انھوں نے گولہ بارود اور رسد کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں، پھر پڑاؤ کی ٹولیاں دن رات گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتی ہیں۔ گاؤں کے باہر چاروں طرف مرہٹ سپاہیوں کے نیچے ہیں۔ اس حویلی کی چار دیواری کے اندر بھی بعض کوٹھڑیوں کے تہہ خانوں میں رسد اور بارود کے ذخیرے جمع ہیں۔

اکبر خاں سے متعدد سوالات پوچھنے کے بعد معظم علی کو اپنی کوٹھڑی سے باہر ہر دیوار، برگلی اور بر مکان کا نقشہ حفظ ہو چکا تھا۔ صبح شام انھیں تنہائی دیر ہوا خودی کے نیلے قید خانے سے باہر نکالا جاتا۔ معظم علی حویلی کے اندر دوسرے قیدیوں کے علاوہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے ملتا لیکن مسلح پھر پڑاؤ بردقت اس کے سر پر موجود ہوتے اور اسے کسی سے بات کرنے کا موقع نہ دیتے۔

ایک دن اکبر خاں فرار ہونے کے متعلق اسے اپنی نئی تجویز بتا رہا تھا۔ معظم علی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "اکبر خاں تمہیں معلوم ہے کہ بھاگنے کی ناکام کوشش ہمارے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔ پھر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر تم اس کوٹھڑی سے باہر رو کر گردش کے حالات معلوم کر سکو تو شاید



معظم علی نے اکبر خاں کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر میر حبیب کا دامن پکڑتے ہوئے کہا: خدا کے لیے میرا مقصد معاف کر دیجیے۔ اب اگر میں بھاگنے کی کوشش کر دوں تو مجھے گولی مار دیجیے۔

میر حبیب نے کہا: میرا خیال تھا کہ تم یہاں خوش ہو:

”نہیں! نہیں! اکبر خاں نے جواب دیا: ”میں کھلی ہوا میں رہنا چاہتا ہوں:

معظم علی نے کہا: ”اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وطن کس سمت ہے لیکن اگر یہ بھاگ

بھی جائے تو آپ سے یہ کون سے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے؟

میر حبیب نے کہا: ”دیکھو اکبر! میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ

بھاگنے کی کوشش کی تو تمہیں باقی تمام عمر اس بہ خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں دوپہر

کے وقت بھی روشنی نہیں پہنچتی:

پھر وہ پریلوں کی طرف متوجہ ہوا: ”اسے جاؤ! لیکن اس کا اچھی طرح خیال رکھو!

اکبر خاں ایک پریلر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میر حبیب دروازے کے قریب پہنچ

کر اچانک مڑا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: میرا خیال تھا کہ تم اپنے متعلق کچھ کہتے

چلے جاتے ہو:

”اپنے متعلق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کی قیدی

ہوں۔ جس سے دھم یا انصاف کی درخواست کرنا بے سود ہے اور میں اس وقت کا انتظار

کر رہا ہوں جب انصاف کی توار میرے ہاتھ میں ہوگی:

میر حبیب غصے میں آنے کی بجائے مسکرایا اور اس نے سوال کیا: ”جب انصاف

کی توار تمہارے ہاتھ میں ہوگی تو تم کیا کر دو گے؟

”میں آپ کو اس سے بہتر کوٹھڑی دوں گا اور آپ کے ساتھ کوئی ایسا قیدی نہیں رکھوں

گا۔ جس کی مظلومیت اور بے کسی کے احساس سے آپ اپنی تکالیف بھول جائیں:

ہم بھاگنے کے متعلق کوئی بہتر تجویز سوچ سکیں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ اگر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تو ممکن ہے ہم بہت جلد رہا ہو جائیں:

اگلے دن پریلر کھانائے کو آیا تو معظم علی نے اس سے کہا: ”میں میر حبیب سے ملنا چاہتا ہوں:

پریلر نے جواب دیا: ”وہ یہاں نہیں ہیں جب وہ آئیں گے تو آپ کی درخواست پسندادی جائے گی:

معظم علی انتہائی بے چینی سے میر حبیب کا انتظار کر رہا تھا: ”وہ دروازہ صبح اٹھتا اور پریلر اس سے پوچھتا مگر اسے نفی میں جواب ملتا:

کوئی دس ماہ انتظار کے بعد پریلر نے داروں کے ایک افسر نے اس کے پاس آکر اطلاع دی کہ میر حبیب تشریف لائے ہیں اور آپ کی درخواست ان تک پہنچا دی گئی ہے

لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے اس کا کوئی جواب نہیں دیا:

معظم علی نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں چند دن اور گزارے۔ ایک دن اچانک اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور میر حبیب فوج کے دو افسروں اور چار مسلح سپاہیوں کے

بمراہ کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے:

میر حبیب نے سوال کیا: ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

معظم علی نے جواب دیا: ”میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آپ ایک بہادر آدمی ہیں۔ لیکن بہادری اور بے رحمی میں بہت فرق ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ

اس معصوم بچے نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور آپ اسے کب تک قید میں رکھنا چاہتے ہیں؟

میر حبیب نے جواب دیا: ”ایک قیدی کو دوسرے قیدی کی سفارش کا حق نہیں۔

تاہم ذاتی طور پر میری یہ خواہش دہشت گردی کہ اکبر کوٹھڑی میں بند کیا جائے۔ لیکن اس نے بھاگنے

کا کوشش کی تھی، اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی شکل دیکھ کر رحم آ گیا تھا:

”تم بیوقوف ہو۔ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔“ میر حسیب یہ کہہ کر نکل گیا۔



قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے حویلی کے صحن میں تین چھولہ لاریاں نصب تھیں۔ درمیانی چھولہ لاری ڈراڑھی تھی جس میں قیدیوں کے محافظوں کا جھنڈا رہتا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو چھولہ لاریوں میں آٹھ سپاہی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں قیدیوں کے محافظ دن کے وقت ان چھولہ لاریوں میں پناہ لیتے تھے۔ لیکن رات کے وقت وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے سامنے کھلی فضا میں آرام کرتے تھے۔ دو دو پہر لاریوں کی چار ٹولیاں رات کے وقت باری باری قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے گشت کرتیں اور شام سے صبح تک برتن گھسنے کے بعد پہرہ بدلتا تھا۔ اس چوکی کے دوسرے محافظ جن کی تعداد عام طور پر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی بڑے دروازے کی طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں اور بانس کے چھپرہ میں رہتے تھے۔

میر حسیب نے اکبر خاں کو معظم علی کی کوٹھڑی سے نکال کر قیدیوں کے محافظ سپاہیوں کے جھنڈے کے سپرد کر دیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ اکبر خاں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ جھنڈا ایک مرہٹہ تھا اور اس کا نام مرلی دت تھا۔ مرلی دت بے ضرورت تھا۔ وہ سرے گنجا تھا اور اس کے سیاہ چہرے پر چمک کے داغ تھے۔ دو سال قبل وہ میر حسیب کی فوج کے اچھے سپاہیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے باعث اس کی بائیں ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اپنے ماتحت سپاہیوں کے ساتھ وہ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ لیکن اکبر خاں کے ساتھ اس کا برتاؤ نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے اکبر خاں کو قید خانے کی کوٹھڑی سے نکلانے کے بعد اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ لیکن تم نے مجھنے کی کوشش کی۔ میر صاحب نے تمہیں ایک موقع اور دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بھی تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ مجھنے کی کوشش کی تو تمہارا

انجام بہت بُرا ہوگا۔“

اکبر خاں نے انتہائی مصحومیت کے انداز میں جواب دیا۔ ”جی میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔“

”تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی شرارت نہ کرو!“

چند دنوں کے اندر اکبر خاں، مرلی دت کے لیے ایک کارآمد نوکر بن چکا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر چھولہ لاری میں جھاڑو دیتا۔ اس کا بہتر دوست کرتا اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھو لاتا۔ سپاہی اس پر اس لیے خوش تھے کہ پہلے اس قسم کے تمام کام انہیں کرنے پڑتے تھے۔

مرلی دت کو بانسری بجانے اور اس سے زیادہ سننے والوں سے داد حاصل کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اس کے چند سپاہیوں کے علاوہ جیسے ایک مجبوری سمجھ کر اس کے گرجے ہو جاتے، قلعے میں کسی اور کو اس کے اس فن سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دوسرے سپاہی اور افسر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بانسری بجانے کے علاوہ اسے گانے کا بھی شوق تھا۔ لیکن برہمنی سے اس کی آواز اس کی صورت سے بھی زیادہ گریہ تھی۔

اکبر خاں کو اس کی کمزوری کا علم تھا اور وہ جی کھول کر اسے داد دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا ”چچا مرلی دت! آپ! آپ تو کمال کرتے ہیں۔ میں نے کسی اور کو اتنی اچھی بانسری بجانے نہیں دیکھا۔“

اور وہ جواب دیتا: ”اے مجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور تم ان سب سے زیادہ سمجھدار ہو۔“

چچا مرلی دت! آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ کاش میں بھی اس طرح گاسکتا! اور مرلی دت خوش ہو کر کہتا: ”گانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے بیشا۔ آہستہ آہستہ اکبر خاں پر مرلی دت کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اسے حویلی کے اندر گھسنے کی آزادی

تھی۔ جب قیدیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ان کے پاس چلا جاتا۔ پہرہ داروں کی موجودگی میں اسے عام طور پر منظم علی سے باتیں کرے یا کوئے زلما۔ لیکن جب کبھی سپاہیوں کی توجہ دوسری طرف ہوتی تو وہ آہستہ سے کوئی بات کہہ کر نکل جاتا۔

جب سپاہی قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کبھی روٹیوں کی ٹوٹری اور کبھی پانی کا مشکاکہ لے لیتا۔ آہستہ آہستہ پہرہ دار اس سے اس قسم کے کام لینے کے عادی ہوتے گئے۔ پانچ چھ مہینوں کے بعد یہ حالت بنتی کہ جب قیدیوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آتا تو سپاہی اسے کبھی گنوں سے پانی اور کبھی نگرخانے سے کھانا لانے کے لیے کہتے۔

کوٹھڑیوں کے تالوں کی چابیاں مرلی دت ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ رات کے وقت قیدیوں کو کھانا دینے کے بعد وہ چابیوں کا گچھا چھو لہاری کے اندر ایک کڑی کے صندوق میں بندوق میں بند کر دیتا تھا۔ اور صندوق کے آٹے کی چابی جو ایک دھاگے میں بندھی ہوتی تھی۔ اپنے گلے میں ڈال لیتا تھا۔ پہرہ دار ہر صبح قیدیوں کو باہر نکالنے کے لیے مرلی دت سے چابیاں لینے آتے تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے اکبر خاں کو صندوق کی چابی دیتے ہوئے کہا: جاؤ تم نکال دو!

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد اکبر خاں مستقل طور پر یہ کام اپنے ذمے لے چکا تھا۔ ایک رات بجلی بجی بارش ہو رہی تھی۔ مرلی دت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بانسری بجاتا رہا اور اس کے بعد اپنی موٹی اور بھیدی آواز میں اکبر خاں کو چند گیت سنانے کے بعد لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں اس کے خڑے جو حلی کے تقریباً ہر سپاہی اور انفسر کے لیے موضوع بحث بن چکے تھے۔ اکبر خاں کو پریشان کر رہے تھے۔ پچھلے پہر جب بارش تم گئی تو اکبر خاں نے اپنی کھاٹ چھو لہاری سے باہر نکال لی۔ دو پہر میا گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: کیوں اکبر خاں کیا بات ہے؟

کچھ نہیں! چچا مرلی دت میں ہمارا لمبے اور لمبے نیند نہیں آتی!

پہرہ دار نے اس کے قریب آکر کہا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ توپ کی آواز بھی اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو مرلی دت کے ساتھ چھو لہاری میں ہوتے کی بجائے ترخانے میں رہنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن دیکھو یہ بات کہیں اس سے نہ بکھیر دینا!

دوسرے سپاہی نے کہا: یہی اکبر خاں! پس بتاؤ تمہیں واقعی ان کا گانا پسند ہے؟ اسی رات تک وہ بانسری بجاتے رہے اور پھر جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر سونے کے لیے وقت مل جائے گا تو تم گھنٹے کے لیے اصرار کرنے لگے:

ان کا گانا مجھے بہت پسند ہے۔ اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹے ہوئے جواب دیا۔

صبح کے وقت پہرہ دار نے اکبر خاں کو جگایا اور کہا: جاؤ چابیاں لے آؤ!

اکبر خاں آنکھیں مٹا ہوا چھو لہاری میں داخل ہوا تو مرلی دت بدستور خڑے رہا تھا، اس نے مرلی دت کو جگانے کی بجائے آگے بڑھ کر اطمینان سے دھاگے کی گرہ کھولی اور اس کے گلے سے چابی اتاری۔ پھر اس نے صندوق کا ٹالا کھولا اور قید خانے کی چابیوں کا گچھا لے کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کھاٹ چھو لہاری کے اندر لے آیا۔ اور اس پر لیٹے ہی گہری نیند سو گیا۔

اچانک اسے مرلی دت کی آواز سنائی دی: اکبر خاں! اکبر خاں!! بہت دیر ہو گئی۔ جاؤ پہرہ داروں کو چابیاں دے آؤ۔ مجھے رات نیند نہیں آتی!

اکبر خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مرلی دت نے اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بدعواس ہو کر کہا: ارے میری بی کہاں گئی؟

اکبر خاں نے اپنے گلے سے چابی اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: لیجئے، میں نے

پہرہ بدوں کو چابیاں نکال دی ہیں۔ آپ گری نیند سو رہے تھے۔ اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

”تم بہت شریر ہو!“ مرلی دت نے چابی کا دھاگا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہنا لیں۔  
مجھے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ تم نے اچھا کیا کر مجھے جگایا نہیں۔

”اب مجھے نیند آرہی ہے۔“ اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔  
اس واقعہ سے چند ہفتے بعد صبح کے وقت قیدیوں کو کوٹھڑیوں سے باہر نکالا گیا تو  
اکبر خاں نے موقع پاکر منظم علی سے کہا: ”میرے صیب کل کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی تیر جھڑی میں  
پر وخت نہیں ہوتا۔ بادل آ رہے ہیں لہذا آج رات بارش شروع ہو گئی تو آپ تیار رہیں۔“



شام کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مرلی دت چھو لاری کے باہر کھاٹ  
پر بیٹھا اطمینان سے بانسری بجا رہا تھا۔ اکبر خاں پہرہ بدوں کے ساتھ قیدیوں کو کھانا تقسیم کرنے  
کے بعد اس کے پاس آیا اور اس نے چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ”چچا  
مرلی دت آج بہت گرمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بعض راگیناں بارش لے آتی ہیں۔ آپ کو  
کئی ایسا راگ آتا ہے؟“

مرلی دت نے بے پروائی سے جواب دیا: ”راگ آدمی کے لیے ہوتے ہیں۔ بادلوں کے  
لیے نہیں۔“ اور پھر بانسری بجنے میں مصروف ہو گیا۔

اکبر خاں نے قے سے توقف کے بعد کہا: ”چچا مرلی دت چابیاں اندر رکھ آؤں؟“

مرلی دت نے جواب دینے کی بجائے اپنے گلے سے صندوق کی کنجی نکال کر اس کے  
ہاتھ میں دے دی۔ اکبر خاں چابیوں کا گچھا لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا دل تیری طرح دھڑک رہا تھا۔  
چند لمبے وقف کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا صندوق کے پیچھے رکھ دیا۔ پھر اس نے صندوق  
کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے

بعد تالا لگا کر باہر نکل آیا۔

”کیسے بیوقوف ہو!“ مرلی دت نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تم میرا صندوق توڑ ڈالو گے۔“

اکبر خاں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”چچا! اندر  
بہت گرمی ہے۔ دیکھو مجھے پسینہ آ رہا ہے۔“

”آج بارش ضرور آئے گی۔“ اس نے اکبر خاں کے ہاتھ سے چابی لے کر گلے میں ڈالتے  
ہوئے کہا۔

اکبر خاں مرلی دت کے سامنے دوسری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس پاس  
لیٹے ہوئے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا:

”بھئی یہاں آؤ! آج چچا مرلی دت کمال کر رہے ہیں۔“ اور سپاہی مرلی دت کی مستحق  
سے بظن انداز ہوئے کی بجائے اس کے عقاب سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ  
کر اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

مرلی دت نے کہا: ”راگ سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اب ذرا غور سے سنو۔“  
اور وہ کوئی ایک گھنٹہ انتہائی پیچیدگی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ اچانک بارش کی  
موٹی موٹی ٹوئیں گرنے لگیں۔ بادل گرا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

اکبر خاں نے کہا: ”چچا مرلی دت بارش آگئی۔ آئیے۔ آپ کی کھاٹ اندر کر دوں؟“ اور وہ  
بدستور بانسری بجاتا ہوا چھو لاری کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر اکبر خاں اور مرلی دت چھو لاری کے اندر اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے رہے۔ مرلی دت  
بانسری بجنے کی بجائے ایک انتہائی ناقابل برداشت نے میں گارہا تھا۔ وہ گاتے گاتے سو گیا  
اور پھر اس کے خزانے تاریک رات کی ہولناکی میں اضافہ کرنے لگے۔

اکبر خاں کے دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہونے لگیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔  
بالآخر اٹھا اور کھاٹ سے آکر کھاتوں اور گھنٹوں کے بل فرش پر چلتا ہوا صندوق کے پاس پہنچا۔

صندوق کے پیچھے چابیوں کے گچھے کو ہاتھ لگنے سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ نمودار ہو کر رہ گیا۔ لیکن مرلی دت کے خراٹوں کے تسلسل نے اس کے توہمات دور کر دیئے۔ وہ مڑا اور اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چھو لاری کے دروازے پر کھڑا ہو کر باہر چلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی اور کپڑوں میں دوپہر پلڑوں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اکبر خاں دبے پاؤں معظم علی کو کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ وہ کوٹھڑی کے تالے میں یکے بعد دیگرے مختلف چابیاں لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سابیوں کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ جھٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خوف دہرا اس کے باعث اس کی یہ حالت تھی کہ اسے اپنا سانس بھی بارے محسوس ہوتا تھا۔ سبکی کی ایک ہلکی سی چمک ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی جو اس نے مبینوں کے غور و خوض کے بعد تیار کیے تھے۔

ایک پر پلڑا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: "بھئی چلیں اپنی چھو لاری کے اندر۔ یہ طوفان بہت خطرناک ہے۔"

"شہر و! میں ابھی آتا ہوں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"کہا، جدت۔"

"ذرا جھجھکا صاحب کا حال دیکھ آؤں۔"

ایک پر پلڑا، اکبر خاں سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا اور دوسرا مرلی دت کی چھو لاری کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا: "جو بھئی! جھجھکا جی کو اس وقت دنیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ہم اپنی چھو لاری کے اندر بیٹھے ہیں۔ یہ کمبخت خود جھینے کی طرح سوتا ہے اور یہ ایسی بارش میں بھی سر چھپانے کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر ان کوٹھڑیوں میں کون سا سفر نہیں ہے۔"

جسے کوئی ٹوٹنے آئے گا۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھک لگاتے رہیں گے۔ وہ چلے گئے۔

اکبر خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چابی لگ گئی۔ اس نے تالا کھلا کر کھڑی اتاری اور آہستہ سے کواڑ کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیئے۔

"بھائی جان! بھائی! اس نے دبی زبان میں کہا۔

"اکبر آہستہ بولو!" معظم علی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں نے کہا: "پر پلڑا چھو لاری کے اندر چلے گئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آؤ ہم اسے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اکبر خاں نے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "یہ لیجئے! اگر پر پلڑا جلدی نہ آگئے تو ہم تمام کوٹھڑیاں کھول سکتے ہیں۔"

معظم علی نے باہر نکل کر دروازے کو کھڑی لگا دی اور کہا: "اس کا تالا کہاں ہے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا: "وہ میں نے پھت پر پھینک دیا ہے۔"

معظم علی جلدی سے آگے بڑھ کر دوسری کوٹھڑی کا تالا کھولنے میں لگ گیا۔ چند چابیاں آرنے کے بعد اس نے تالا کھول لیا۔ کوٹھڑی کے اندر اس کے دو ساتھی منتظر تھے۔ اس نے چابیوں کے گچھے کی رسی کھینچ کر توڑ ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو چابیاں تقسیم کرتے ہوئے کہا: "تم ان چابیوں سے جن کوٹھڑیوں کے تالے کھول سکو وہاں سے قیدیوں کو نکال کر میری کوٹھڑی میں جمع کرو۔ اور دروازے اسی طرح بند کرتے جاؤ۔ اور دیکھو ہمیں اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسرے قیدیوں کو بھی یہاں سے نکالنا ہے۔"

چند منٹ میں معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کے علاوہ بارہ اور قیدی اس کی کوٹھڑی میں جمع ہو چکے تھے۔ صرف آخری سرے پر تین کوٹھڑیاں باقی تھیں جن کے اندر پانچ پانچ قیدی بند تھے۔

معظم علی نے ایک کوٹھڑی کا تالا ابھی کھولا ہی تھا کہ اکبر خاں جھگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: "پہریدار گشت کے لیے آرہے ہیں!"

معظم علی نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور اکبر خاں کا بازو پکڑ کر فوراً اندر داخل ہو گیا قیدی دروازے پر منتظر تھے۔ معظم علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے اکبر خاں سے دریافت کیا۔

پہریدار کتنے ہیں؟

صرف دو! اس نے جواب دیا۔

معظم علی نے کوٹھڑی کے قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "تم میں سے تین مضبوط آدمی میرے ساتھ آجائیں۔ ہم پہریداروں کو چیخ نکار کا موقع دیتے بغیر اس کوٹھڑی میں بند کریں گے۔ لیکن یاد رکھو۔ تمہاری ذرا سی کوتاہی ہمارا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گی۔"

اس کے بعد معظم علی نے دروازہ کھول دیا بھڑوڑی دیر میں پہریداروں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ جن وہ باتیں کرتے ہوئے کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ معظم علی اچانک آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک کا گلا دبوچ کر کوٹھڑی کے اندر گھسیٹ لایا۔ دوسرے آدمی کے منہ سے صرف "کیا ہے" نکلنے پایا تھا کہ ایک قیدی نے بڑھ کر اس کی گردن دبا لی اور باقی دو نے اسے گھونٹوں اور ٹکڑوں سے ادھ موڑ کر کے کوٹھڑی کے اندر ڈال دیا۔

تقریباً میں معظم علی کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ نوکرتاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کوئی ان کی قمیص پھاڑ کر ان کے منہ میں ٹھونس رہا تھا تو کوئی ان کی پگڑیاں اتار کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں مصروف تھا۔ اور کوئی لاتوں اور ٹکڑوں سے ان کی تواضع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: "بھائی! دیکھنا اندھیرے میں اپنے کسی ساتھی کو نہ مار دینا!"

پہریداروں کی ہندوؤں اور تواروں پر قبضہ کرنے کے بعد معظم علی قیدیوں کو لے کر باہر نکلا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔ باقی دو کوٹھڑیوں سے قیدیوں کو نکالنے میں اسے دیر

لگی جب تمام قیدی معظم علی کی کوٹھڑی میں جمع ہو گئے تو اس نے اکبر خاں سے کہا: "اکبر! تم نے میں قید سے نکالا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لیے بھی میں تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "حوالی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا مکن نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم یا تو پھلی دیوار میں عقب نگاہیں یا پھٹ پر چڑھ کر پھوڑے کی طرف دوسری حویلی میں کود جائیں۔ پھوڑے کی حویلی میں غلے کے گودام اور گھڑیوں کے اصطبل ہیں۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس پہریدار ہوں گے۔ ہمارے پاس صرف دو ہندوؤں اور دو توار ہیں۔ میں مرلی دت کی ہندوق، توار، پستول اور باند کا ہتھیار بھی لا کر آپ کو لے سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم اچانک ان خیموں پر چڑھ کر کے پہریداروں کو مغلوب کر لیں تو ہم چند بدقیں اور تواریں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ساتھ دلی حویلی کے پہریداروں کو مغلوب کرنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں! ہمارے لیے دوسری حویلی سے ہتھیار حاصل کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ ان کوٹھڑیوں کی چھت زیادہ اونچی نہیں اور ہم آسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

اکبر خاں! سب سے پہلے تمہاری باری ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ!"

کوٹھڑی سے باہر نکل کر معظم علی نے دیوار کے قریب جھکے ہوئے کہا: "تم میرے کندھے پر سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اکبر خاں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے ہاتھ چھت کی مٹھری تک نہ پہنچ سکے۔ معظم علی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے گھٹنے پکڑ کر اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اکبر خاں کو مٹھری پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد معظم علی نے اسی طرح ایک اور آدمی کو چھت پر چڑھایا اور پھر باقی تمام آدمیوں کو اسی طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان کی آن میں تمام آدمی چھت پر چڑھ گئے۔ نیچے آخری آدمی معظم علی تھا۔ دو آدمیوں نے اپنی پگڑیوں کا رٹا بنا کر نیچے لٹکا دیا۔ معظم علی نے بڑے اطمینان

کے ساتھ کوٹھی کا دروازہ بند کیا اور بچوں کے سہارے چھت پر چڑھ گیا۔

اس چھت سے آگے دوسری حویلی کے مکانات کی چھتیں قریب ایک گز نیچی تھیں۔ معظم علی اپنے ساتھیوں کو دیں رکنے کا حکم دے کر مولا دھار بادش میں گھنٹوں کے بل رنگیتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسری چھت کی مٹیر کے قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے صحن کا جائزہ لیا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے درمیان ایک کشادہ ڈیڑھ میٹر میں ایک مشعل جل رہی تھی جس کی روشنی میں ڈیڑھ میٹر سے آگے ایک چھپر کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ چھپر کے نیچے چند آدمی کھاؤں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو کاندی اور وہ آگے بڑھ کر ایک لمبی قطار میں منڈر کر کے پیچھے لیٹ گئے۔ معظم علی نے پہلے اکبر خاں کو نیچے لٹا دیا پھر خود منڈر کر کے ساتھ تنگ کر اڑ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے تمام ساتھی کسی وقت کے بغیر دوسری حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔ معظم علی نے باقی آدمیوں کو دیں صحن کے حکم دیا اور اکبر خاں کے علاوہ تین اور ساتھیوں کے ہمراہ پانی اور کچھ مین احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے روشن حصے کی طرف بڑھا۔ چھپر کے نیچے دو چلدا پتوں کے درمیان خلی بگڑیں سے گزر کر یہ لوگ ڈیڑھ میٹر کے اندر داخل ہوئے۔ ڈیڑھ میٹر کے اندر دو آدمی کھاؤں پر یاد رسات آدمی فرش پر سوار ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک مشعل جل رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی تیل کی کچی پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ ایک کھاٹ کے سرٹانے دیوار کے ساتھ چند بندو قیں اور بارود کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ فرش پر لیٹے ہوئے آدمیوں سے پاؤں بچاتے ہوئے آگے بڑھے اور بندو قیں اٹھا کر دبے پاؤں باہر نکل آئے۔ معظم علی نے مشعل اٹھائی اور اس پر کچی سے تیل ڈالنے کے بعد واپس مڑا۔ ڈیڑھ میٹر سے چھپر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں چھ آدمی اور آدمی چارپائیوں پر سوار ہوئے ہیں اور ان چارپائیوں سے آگے دونوں طرف چھپر کے نیچے گھوڑوں کی کھڑکیاں ہیں۔ معظم علی نے مشعل بند کر کے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا اور ان کی آن میں اس کے ساتھی آگے بڑھ کر ڈیڑھ

کے سامنے جمع ہو گئے۔ چند آدمی معظم علی کے اشارے پر ڈیڑھ میٹر کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں گھوڑے برجاس ہو کر کھلبلی مچا رہے تھے۔ چھپر کے نیچے لیٹے ہوئے تین آدمی کے بعد دیکھے بڑھ کر آگے گئے۔ لیکن معظم علی کے ساتھیوں نے انھیں بندو قوں کے کندوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ ایک پہر یار نے پیچھے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ڈیڑھ میٹر کے اندر اور پھر کے نیچے باقی پہر یار انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں ان غیر متوقع حملہ آوروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے کہا: یہ گاؤں ہمارے محاصرہ میں ہے۔ تمھارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں اگر کسی نے شہر چلنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ تمھاری بہتری یہاں میں ہے کہ تم بلا چون دچا ہمارے حکم کی تعمیل کرو!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھی پہر یاروں کو ہانک کر فٹے کے ایک گودام میں بند رہ چکے تھے۔ معظم علی گودام کا دروازہ بند کر دیا تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: بھائی جان حویلی کے چھانگ میں قتل لگا ہوا ہے، آپ ان سے چابی لے لیں۔

"چابی کس کے پاس ہے؟" معظم علی نے پہر یاروں سے سوال کیا۔

جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو معظم علی نے دوبارہ کہا: میں حویلی کی چابی مانگتا ہوں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر چابی ہمارے حوالہ نہ کی گئی تو اس گودام کو آگ لگا دی جائے گی۔"

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کہے بغیر ایک چابی معظم علی کے ہاتھ میں دے دی۔ معظم علی دروازے کی کھڑکی لگانے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ دو آدمی سیل دروازے کے پاس کھڑے رہیں اگر یہ لوگ شہر چائیں تو اس حویلی کو آگ لگا دی جائے اور باقی دوا گھوڑوں پر سوار ہو جائیں۔"

حویلی کے صحن میں تین طرف دیواروں کے ساتھ چھپر کے نیچے کوئی ڈیڑھ سو گھوڑے

پھر وہ جھانکتا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے اسے مشعل کی روشنی میں چوکی کا محافظ دکھائی دیا۔

”کیا ہوا جناب؟“ اس نے پوچھتے ہوئے سوال کیا۔ گھوڑے خود بخود کیسے نکل گئے؟ گھوڑے ڈاکو لے گئے ہیں۔“

”لیکن پھر یہاں کہاں گئے تھے؟“

”پھر یہاں کو ہم نے ایک کوٹھڑی سے نکالا ہے۔ تم اپنے قیدیوں کا خیال رکھو!“

”جناب قیدیوں کی آپ فکر نہ کریں۔ لیکن اتنے گھوڑوں کا نقصان!“

مرلی دت کا ایک سپاہی جھانکتا ہوا آیا اور اس نے دو سپاہیوں کے گم ہو جانے کی اطلاع دی۔

مرلی دت نے سوال کیا۔ ”تم نے قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھی ہیں؟“

”ہاں جناب! وہ تو بند ہیں اور ان میں تالے لگے ہوئے ہیں۔“

ایک دوسرا سپاہی جھانکتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی۔ ”جناب قیدی اندر سے کوئی آواز نہیں دیتے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پیچھے کی دیوار میں نقب لگا کر دوسری حویلی میں نہ چلے گئے ہوں۔“

مرلی دت نے برہم ہو کر کہا۔ ”قیدی ناخنوں سے ڈیڑھ گز چڑی دیوار نہیں کھود سکتے وہ صرف ہماری پریشانی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔“

چوکی کے محافظ نے کہا۔ ”میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

قتوڑی دیر بعد مرلی دت مشعل کی روشنی میں اپنا صندوق خالی دیکھنے کے بعد چلا چلا کر اکبر خاں کو آوازیں دے رہا تھا اور چوکی کا محافظ چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

ایک اور سپاہی جھانکتا ہوا چھو لہاری میں داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا۔ ”سر کا غضب“

بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کی کھڑکیوں کے اوپر دیوار میں لگی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ گھوڑوں کی لگائی اور زینیں ٹنکی ہوئی تھیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق گھوڑے تیار کرنے کے بعد غلام کے ساتھیوں نے باقی تمام گھوڑے کھول کر ڈیوڑھی کے سامنے جمع کیے پھر حویلی کا پھاٹک کھول دیا گیا اور وہ گھوڑوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے باہر نکل آئے۔

گھوڑوں کی ٹاپ سن کر گاؤں کے پھر یہاں جھانکتے ہوئے اس تنگ لگی میں داخل ہوئے لیکن وہ گھوڑوں کے سموں تلے پس کردہ گئے۔

چند منٹ بعد جب ساتھ دالی حویلی کے محافظ بند و تین چلا کر اور فائر سے بھاگ کر لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ معظم علی اور اس کے ساتھی گاؤں سے باہر سر پہ فوج کا پڑاؤ عبور کر رہے تھے اور پھر جب پڑاؤ کے سپاہی اپنے خیموں سے باہر نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ دتین میں آگے جا چکے تھے۔

مرلی دت حویلی میں خود سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے لیٹے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔ سپاہی بھاگ کر اس کی چھو لہاری میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں جناب!“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”ساتھ دالی حویلی سے گھوڑے کھل کر باہر نکل گئے ہیں۔“

”گھوڑے باہر کیسے نکل گئے؟“ اس نے برہم ہو کر سوال کیا۔

”پتا نہیں کیسے نکل گئے جناب! حویلی کا دروازہ کھلا ہے اور پھر یہاں کہیں غائب ہیں“ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑوں کو روکنے کے لیے ان کے پیچھے گئے ہیں۔

”کتنے گھوڑے بھاگ گئے ہیں؟“

”جناب تمام نکل گئے ہیں وہاں ایک بھی نہیں رہا۔“

مرلی دت بستر سے اٹھا اور سپاہیوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکل کر بولا۔ ”تم پاگل ہو رہا ہوں گھوڑے خود بخود کیسے بھاگ سکتے ہیں۔“



ہو گیا۔ معظم علی کی کوٹھی خالی ہے۔

”تمہیں کیسے معلوم ہو کہ وہ خالی ہے؟ اس نے سراسیمہ ہو کر سوال کیا۔

”جناب میں نے ٹول کر دیکھا تو اس کا آلا غائب تھا۔ صرف کنڈی باہر سے بندھتی

میں دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔“

مرلی دت نے سراپا فریاد بن کر چوکی کے محافظ کی طرف دیکھا اور کہا: ”سرکار چاہیں

کا گچھا غائب ہے۔“

چوکی کے محافظ نے کچھ کہے بغیر مرلی دت کے بستر سے اس کی بانسری اٹھائی اور اسے

بے تحاشا پیشینا شروع کر دیا۔



علی وردی خاں، میدنا پور کے سرکاری عمل میں متم تھا اور اس کی فوج شہر سے باہر ٹپاؤ

ڈالے ہوئے تھی۔ ایک صبح وہ محل کے کشادہ کمرے میں بیٹھا اپنے میرمنشی کو درخواستوں اور

مراسلوں کے جواب لکھوا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ ایک کرسی پر سراج الدولہ بیٹھا ہوا تھا۔

عمل کا داروغہ اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ کر ایک مہر لے

پیش کیا۔

علی وردی خاں، میرمنشی کو چند جملے کھولنے کے بعد داروغہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس

نے کہا: ”عالمیاء! یہ معظم علی کی درخواست ہے اور وہ اسی وقت قدسوی کی اجازت چاہتا ہے۔“

”معظم علی کون ہے؟“ علی وردی خاں نے مراسلہ کھولتے ہوئے سوال کیا۔

داروغہ نے جواب دیا: ”عالمیاء! یہ دیوی فوجان ہے جسے حضور نے سرحدی علاقوں کا

محافظ مقرر کیا تھا وہ مدت سے لاپتہ تھا اور اب مرہٹوں کی قید سے فراہ ہو کر یہاں

پہنچا ہے۔“

علی وردی خاں نے جلدی سے مراسلہ کھول کر پڑھا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا

”اسے فوراً حاضر کرو!“

داروغہ سلام کر کے باہر نکل گیا۔ اور علی وردی خاں کی نگاہیں دوبارہ مراسلے پر مرکوز ہو گئیں

تھوڑی دیر بعد معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ علی وردی خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ کرسی

سے مصافحہ کیا اور مزاج الدولہ نے اس کی تعلیم کی۔ علی وردی خاں نے کہا: ”ہم تمہارے متعلق

میلوس ہو چکے تھے۔ شیخو، اور مجھے اپنی سرگزشت سناؤ!“

معظم علی، علی وردی خاں کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس نے مختصراً اپنی سرگزشت بیان

کر دی۔

اختتام پر علی وردی خاں نے کہا: ”کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ تم میر حبیب کی قیدی ہو۔

تمہاری گرفتاری یقیناً عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت

رہے۔ ہم اسے حکم دے کر چکے ہیں۔“

معظم علی نے قہر سے توقف کے بعد کہا: ”مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری تمہا عطاء اللہ

خاں کی سازش کا نتیجہ نہ تھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔“

علی وردی خاں نے جواب دیا: ”سازش و حقیقت ہمارے خلاف تھی اور عطاء اللہ

خاں کے جن ساتھیوں پر ہمیں شبہ تھا وہ سب فوج سے نکلے جا چکے ہیں۔ میر جعفر نے

ہمیں بتایا تھا کہ ان کے دل میں عطاء اللہ خاں کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے اور

انھوں نے تمہیں فوج کی حفاظت کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا تھا۔“

”عالمیاء! انھوں نے مجھے منع نہ کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ

ابتداء سے ہی عطاء اللہ خاں کے رازدار نہیں تھے۔“

علی وردی خاں نے قہر سے آئندہ ہو کر جواب دیا: ”اگر وہ عطاء اللہ خاں کے رازدار

بن کر ہمیں بروقت اس کے ارادوں سے باخبر نہ کرتے تو آئندہ میں میں انتہائی خطرناک

صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہ زوال اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری گرفتاری کے صحیح اسباب معلوم

کیے جاتیں تو یہ مشکل نہیں۔ ہم میر حبیب سے تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ میر حبیب نے ہمارے ساتھ صلح کی درخواست کی ہے اور ہم صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے میر جعفر کی سرکردگی میں ایک وفد اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔

معلم علی نے ہر اس ہو کر سوال کیا: آپ میر حبیب سے صلح کرنا چاہتے ہیں؟  
ہاں! ہم اٹلیس پر مرہٹوں کے پلے درپے حملوں سے تنگ آچکے ہیں۔ میر حبیب بعض شرائط پر اٹلیس کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے اس کے (بڑے) دوبار ہمارے پاس آچکے ہیں۔ میر جعفر کا خیال ہے کہ وہ ہماری ملازمت اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ اگر میر جعفر نے اسے رام کر لیا تو ہم اسے بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔ مرہٹوں کے ساتھ پنشنے کے لیے اس سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نہایت دقت پر آتے ہو اور میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے تمہیں بھی میر جعفر کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔

معلم علی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں علی دردی خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کلمہ عالجیہ: اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں! کہو!

میر حبیب جیسے لوگوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں تو اراکی زبان کی ضرورت ہے۔ میں پیشہ ویرانوں سے بیٹروں کی حفاظت کا کام لینے کی مشق کا قائل نہیں۔ میں میر حبیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک فدا ہے اور ایک فدا پر دوبارہ اعتماد کرنا پارے درجے کی خود فریبی ہوگی اگر وہ صرف آپ کا دشمن ہوتا تو آپ اس کا ماضی فراخوں کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن وہ آپ کی حکومت سے زیادہ بنگال کے باشندوں کی عزت و آزادی اور بقا کا دشمن ہے اور بنگال کا کوئی محب وطن اس کا ماضی فراخوں کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ میں آپ کی فوج میں اس لیے شامل ہوا تھا کہ میں اپنے دل میں بنگال کی عزت اور آزادی

کے لیے ایک تڑپ محسوس کرتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے آپ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے پیش کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کے دشمنوں کو بنگال کا دشمن اور بنگال کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اب اگر آپ نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے تو ایسے لوگوں کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا جو اپنے خون کی روشنائی سے قوم کی آزادی کی تاریخ کھٹکا چلبٹے ہیں۔ علی دردی خاں نے کہا: کاش قوم میں تمہارے جیسے چند اور نوجوان ہوتے۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں بیک وقت ان ان گنت طالع آزمائوں کے ساتھ کیسے منٹ سکتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حکومت کی منہ کا دھڑکتا سمجھتا ہے۔ موجودہ حالات میں میر حبیب کی طرف مصالحت کا اٹھ بڑھانا میرے لیے ایک مجبوری ہے۔

معلم علی نے جواب دیا: آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ حکومت کا کاروبار چلانے یا بنگالی حالات سے عہدہ بردار ہونے کے لیے چند طالع آزمائوں کے درمیان توازن قائم رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان جاہ پسندوں میں سے کسی کو بھی قوم کی عزت اور آزادی کا امین نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ قوم کی اجتماعی قوت مدافعت ہی ہماری بقا اور آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہ ابن الوقت، یہ فدا اور یہ اقتدار کی مندوں کے لیے بے حیا و غیرار، عوام کی بے حس، بددلی اور ایسی کی پیلاوار ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سودا کرنے کی بجائے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار کریں۔ یہ وہ ناسور ہیں جنہیں کاٹ کر جڑ سے نکلے بغیر ایک صحت مند قوم کی تخلیق ممکن نہیں۔ اور جو حکومت ایک صحت مند قوم کی تخلیق سے قاصر رہتی ہے اس کے لیے گھر کے فدا ویرانی حملہ آوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

علی دردی خاں نے دسے تلخ ہو کر کہا: نوجوان تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ میر حبیب کے خلاف تمہارے غم و غصہ کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں لیکن موجودہ حالات میں

ہیں اس کی دشمنی کی بجائے اس کی دوستی کی ضرورت ہے۔

معظم علی نے جواب دیا: میرے حسیب کی دوستی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک معمولی سپاہی کی ضرورت نہیں۔ اگر موجودہ حالات مجھے ایک حقیقت پسند انسان بننے سے منع کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری قسمت کے امین دوست اور دشمن میں تیز کر سکیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔

معظم علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

علی دردی خاں چند ثانیے غصے — اور غصے سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: معظم علی! میں اپنی توار کا لوہا پہچانتا ہوں۔ تمہارا استحقاق منظور نہیں کیا جائے گا۔ ایک طویل عرصہ مرہٹوں کی قید میں رہنے کے بعد تم چھ ماہ کی رخصت کے حق دار ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اس عرصہ میں یہ سمجھ سکو گے کہ میرا یہ اقدام صحیح تھا۔ مرہٹوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے میرے حسیب کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

معظم علی باہر نکل گیا اور علی دردی خاں سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

سراج الدولہ نے کہا: جہاں پناہ اگستاخ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد بھی شاید ہماری فوج میں دوبارہ آنا پسند کرے۔

علی دردی خاں مسکرایا: ”وہ محمود علی کا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر ہمیں کسی محاذ پر جانا پڑے تو وہ گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند کرے گا۔ تم جاؤ اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو۔ کسی دن وہ تمہارے ترکش کا بہترین تیر ثابت ہو گا۔“

سراج الدولہ نے کہا: ”تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے؟“

علی دردی خاں نے معنوم بے میں کہا: ”خفا؟ ایک بوڑھا اپنی لاشی سے ایک سپاہی اپنی تلواریں سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرزند اپنے عصائے حکمرانی سے کیونکر خفا ہو سکتا ہے۔ ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں ہول رہا تھا تو میں نے آگے بڑھ کر پیٹنے سے کیوں نہ لگایا۔ کاش! میرے ہلو خانے میں اس قسم کی تواریں اور بھی ہوتیں اور میں ہر محاذ پر دشمن کو کھٹک سکتا۔ لیکن جب تمہارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ جنگال کے حالات اس سے مختلف ہوں گے۔ معظم علی یہ فوجیوں کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی۔ تم جاؤ اور کبھی سے کہو کہ اسے اس کے ساتھیوں کو قید کے زلزلے کی پوری تحواریں ادا کر دی جائے۔ ہم ایک ہفتہ تک مرشد آباد پہنچ جائیں گے اور وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے تمہاری محافظ فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا جائے۔“

سراج الدولہ کمرے سے نکلا اور محل کے دروازے پر معظم علی سے جا ملا اور اس نے اسے آواز سے کر دیا کہ: ”آپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔“

”فرمائیے؟ معظم علی نے کہا۔“

سراج الدولہ نے کہا: ”میں یہاں سے سیوا، بجلی جا رہا ہوں اور شاید کچھ عرصہ مرشد آباد رہا سکوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مستعفی ہونے کے متعلق اپنا لہو تبدیل کر سکیں تو سیدھے میرے پاس آئیں مجھے وہاں اپنی فوج کے لیے قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے قابل اعتماد سمجھتے ہیں؟ معظم علی نے مسکرا کر سوال کیا۔“

سراج الدولہ نے جواب دیا: ”اگر میں آپ کو قابل اعتماد نہ سمجھتا تو درود نہ ہوتا آپ کے پیچھے نہ آتا۔ چلیے ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

معظم علی اس کے ساتھ محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا اور دو قریب دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت سراج الدولہ نے اس کے ساتھ گرجویشی سے مصافحہ کرتے

دئے کہا: کیا میں یہ توقع رکھوں کہ چند دنوں یا چند ہفتوں کے بعد آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے؟  
معلم علی نے جواب دیا: میں آپ سے صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر مستفی ہونے کے  
مشتعل میں نے اپنا ارادہ تبدیل کیا تو کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا آپ کے  
پاس آؤں گا۔

سراج المودلہ نے کہا: مجھے یقین ہے کہ آپ کا ارادہ بہت جلد میل جائے گا۔  
تھوڑی دیر بعد معلم علی بارہ سواروں کے ہمراہ مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا۔ ادران میں سے  
اٹھ دھڑے جو معلم علی کے ساتھ قید ہوئے تھے، باقی راستے کی مختلف منازل پر اس کا ساتھ  
چھوڑ چکے تھے۔

میدان پور چند گھنٹے قیام کے دوران میں معلم علی اپنے ادر مرزا حسین بیگ کے گھر کی  
خیریت معلوم کر چکا تھا۔ اس کے محلے کا ایک سپاہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اس کا باپ مرشد آباد  
میں ہے۔ اس کا بھائی یوسف اس کے روپوش ہونے کے بعد عظیم آباد سے مرشد آباد آ گیا تھا  
ادرا ب میرمدن نے ڈھاکہ کی فوجداری سنبھالنے کے بعد اسے اپنے پاس بلا لیا ہے، فاضل بیگ  
مرشد آباد میں ہے۔

مرشد آباد سے میرمدن کی تیلی کی خبر اس کے لیے پریشان کن تھی۔ لیکن فوج کے ایک  
افسر سے تبادلہ خیالات کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ میرمدن نے مرشد آباد کے بعض امرا بالخصوص  
میر جعفر سے شدید اختلافات کے باعث علی وردی خاں سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے  
ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔

## آٹھواں باب

آمنہ بالا خانے کے ایک کمرے میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھ رہی تھی کہ صابو بھاگتا  
ہوا زمانہ مکان کے صحن میں داخل ہوا اور پوری طاقت کے ساتھ چلانے لگا۔ معلم علی اٹھ اٹھا  
معلم علی آگیا!

آمنہ قرآن بند کر کے اٹھی، لیکن اس میں ہونے یا پھٹنے کی ہمت نہ تھی۔ نیچے خدامہ صابو  
کا بازو پکڑ کر بھنبھوڑ رہی تھی۔ کہاں ہے معلم علی؟ خدا کے لیے بتاؤ کہ کہاں ہے؟ لیکن  
وہ اس کی طرف توجہ دینے بغیر بالا خانے کی طرف منہ اٹھا کر بدستور چلا رہا تھا۔ بی بی جی اب بی  
جی!! معلم علی آگیا۔ معلم علی آگیا!

معلم علی، اکبر خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا اور خادمہ بھاگ کر بالا خانے کی طرف  
پرچڑھنے لگی۔ بی بی جی! معلم علی....! اس نے پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن  
اس کی آواز صحن میں بیٹھ گئی۔

آمنہ دھڑکتی ہوئی دریچے کی طرف بڑھی۔ معلم علی نے اس کی طرف دیکھا، اور تیزی  
سے قدم اٹھاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا اور  
وہ ایک کتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

امی جان میں آگیا ہوں؟ معلم علی نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا۔ ادران کی آنکھوں میں  
آنسوؤں کا سیلاب اتر آیا۔

میرالال۔ میرا بیٹا! اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے دفن ہاتھ پھیلا دیئے۔  
معظم علی بے اختیار ماں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آمنہ اب بڑی مشکل سے اپنی جنین  
ضبط کر رہی تھی۔

میرے چاند۔ میرے لال اچھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔ میں ہر روز تمہیں خواب  
میں دیکھا کرتی تھی۔

اباجان کہاں ہیں؟ معظم علی نے سوال کیا۔

وہ مسجد میں غنا پڑھنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ کہہ کر آمنہ خادمہ کی طرف  
متوجہ ہوئی جو دروازے میں کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ تم جلدی سے ناشتہ تیار کرو اور  
صابر سے کہو ان کے اباجان کو اطلاع دے دے۔

صابر جا چکا ہے۔ خادمہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

ماں اور بیٹا قالمین پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ماں نے اس کے سر پر  
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: تم کہاں تھے بیٹا؟

امی جان میں مرٹوں کی قید میں تھا۔ معظم علی یہ کہہ کر اٹھا اور دیرپے کے قریب جا کر

ولا دی: اکبر خاں! تم نیچے کیوں کھڑے ہو اور پورا جاؤ!

اکبر خاں کون ہے؟ ماں نے سوال کیا۔

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا: امی جان آپ کے لیے ایک اور بیٹا لایا ہوں۔ وہ میرے  
ساتھ قید تھا اور میں اسی کی وجہ سے رہ ہوا ہوں۔

اکبر خاں جھکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے معظم علی کی ماں کو سلام کیا۔

آمنہ نے جواب دیا: جیسے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔

کوئی دس منٹ بعد نیچے صحن سے محمود علی کی آواز آئی: کہاں ہے معظم علی؟

معظم علی اٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اتر آیا اور بے اختیار اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالا خانے کے اسی کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں میں بیٹھ کر مسکرا ہٹوں  
کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی، ماں اور باپ کے ان گنت مولاہت  
کے جواب میں اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔

صابر نے میز چھوٹے سے آواز دی: "مرزا حسین بیگ آئے ہیں"

انہیں اوپر لے آؤ۔ محمود علی نے کہا۔

ان کے ساتھ آواز آئی بھی ہیں: صابر نے جواب دیا۔

اچھا انہیں دلو انہی نے میں بٹھاؤ، ہم آتے ہیں۔

جب معظم علی اور اس کا باپ اپنے اترنے لگے تو اکبر خاں ان کے پیچھے ہولیا۔

آمنہ نے کہا: تم کہاں جاؤ گے بیٹا! تم یہیں بیٹھو۔ میں تم سے تمام واقعات سننا

چاہتی ہوں۔

مرزا حسین بیگ اور مختے کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد معظم علی واپس

آیا تو اکبر خاں قالمین پر پڑا کمری نیند سو رہا تھا۔ خادمہ ناشتہ لے کر آئی تو معظم علی، اکبر خاں کو جگانے

لگا۔ لیکن ماں نے کہا: بیٹا! اسے مزاج دار۔ میں اسے ناشتہ کھلا چکی ہوں۔

محمود علی نے جلدی سے ناشتہ کر کے اٹھتے ہوئے کہا: منظر! آج دفتر میں چند

ضروری کام ہیں۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا اتنی دیر تم اپنی ماں سے باتیں کرو۔ میں بس

کو ابھی پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ بھی ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر آ جائے۔

محمود علی کے جانے کے بعد معظم دیر تک اپنی ماں کے مختلف سوالات کے جواب دیتا رہا

بالآخر اس نے پوچھا: امی جان! فرحت اور اس کی امی کیسی ہیں؟

وہ بہت خوش ہیں بیٹا۔ ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

کیا ہوا امی جان؟ معظم علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

”کچھ نہیں بیٹا! ماں نے آنسو پونچتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم مرزا صاحب سے  
لے آئے ہو نا؟“

”ہاں امی جان! لیکن افضل مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مرزا صاحب کہتے تھے وہ کل  
شکار پر چلا گیا ہے، میرا خیال ہے میں جی جان کو سلام کر آؤں۔“  
”ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔“

معظم علی نے پوچھا: ”امی جان فرحت کی اتنی آپ سے ملا کرتی ہیں نا؟“  
”ہاں بیٹا! کبھی میں ان کے یہاں چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ ہمارے یہاں آجیا کرتی ہیں۔  
پہلے فرحت بھی ان کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے وہ گھر سے نہیں نکلتی۔“  
”امی جان! کیا بات ہے، آپ مفوم کیوں ہو گئی؟“

”کچھ نہیں بیٹا! ماں نے ابدیہ ہو کر کہا۔ ”کاش تم دو مہینے پہلے آجاتے۔“

”اے معظم علی! انتہائی اضطراب کی حالت میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”ماں نے قدمے توقف کے بعد کہا۔ ”بیٹا! فرحت کی مگنی ہو چکی ہے۔“

ایک ٹائیپ کے لیے معظم علی نے محسوس کیا کہ کائنات کے نظام میں یکایک شہر آؤ آ  
گیا ہے اور زمانے کی ایک ٹھوکر نے اسے امیدوں، آنسوؤں، امنگوں اور دلوں کے حسین  
اور سدا بہار تختوں سے نکال کر ایک بے آب و گیاہ صحرا کی بھیانک و مستحق میں  
پھینک دیا ہے۔

”فرحت کی مگنی ہو چکی ہے۔“ یہ چند الفاظ معظم کے لیے حال اور مستقبل کی اس ہلکان  
کاغذ پر تھے جو نغموں، مسکراہٹوں اور قہقروں سے خالی تھی۔ وہ رنگین پسوں، دلفریب نظاروں  
اور دکش نغموں کی حسین وادیوں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ جس کی صمیم سوچ  
کی مٹی پاشیوں سے اور جس کی راتیں ساروں کی مسکراہٹوں اور چاند کے قہقروں سے  
محروم تھیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ماں کے لیے یہ مسکراہٹ ہزاروں آنسوؤں سے  
زیادہ دردناک تھی۔ معظم علی نے سنبھل کر کہا: ”امی جان آپ فرحت کی مگنی پوچھ نہیں ہیں؟“  
اور ماں نے جواب دینے کی بجائے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگایا۔

”بیٹا! اس نے اس کے چہرے پر ہلارے ہاتھ پھیرے ہوئے کہا۔ ”مرزا حسین بیگ  
کو تمہارا بہت خیال تھا۔ لڑکے والے کئی بھان کے یہاں آئے۔ لیکن وہ ہر بار انکار کرتے رہتے  
پھر جب وہ تمہارے متعلق ایسے ہو گئے تو انھوں نے ہاں کر دی۔ اس بات کو ایک مہینہ ہوا ہے۔  
میں مگنی کے دن ان کے ہاں گئی تھی۔ شرکے امرار کی بیویاں دال جمع تھیں۔ میں نے جب فرحت  
کی ماں کو مبارک باد دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کہا: ”بہن خدا کو منگھ  
نہ تھا۔ ورنہ مرزا صاحب یہ فیصلہ کر چکے تھے، کہ فرحت آپ کی ہے۔ اب آپ میری بیٹی کے  
لیے دعا کریں۔“ اس کے بعد جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ  
فرحت میری بیٹی ہے اور وہ نوجوان جس کے ساتھ اس کی مگنی ہو رہی ہے، صرف مایہ کا بی  
نہیں بلکہ میرا بھی داماد ہے۔“

جس وقت ماں بیٹے آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے۔ فرحت اپنے مکان کے ایک  
کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک بے تکلف ہسپلی جس کا نام ناصرہ تھا، کمرے میں داخل  
ہوئی اور اس نے دبے پاؤں فرحت کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں  
اور کہا: ”بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟“

”چھوڑو ناصرہ مجھے تنگ نہ کرو۔“ فرحت نے مفوم آواز میں جواب دیا۔

”غلط! بالکل غلط! ناصرہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”میں ناصرہ نہیں ہوں میں  
معظم علی ہوں۔ سنتی ہو میرا نام معظم علی ہے۔“

”ناصرہ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔“ اس نے انتہائی مفوم لیے میں کہا۔

ناصرہ قدمے نادرم سی ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فرحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں



جہنم میں جوںک دیا تھا یہ لوگ اپنی محنت و مشقت سے فراغت اور خوشحالی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مصروف تھے اور جب بڑے بڑے صوبوں کے عیش پرست حکمرانوں کی افواج اپنی رعایا کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچانے سے قاصر تھیں، یہ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو رہے تھے۔

معظم علی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرنے کی نیت سے آیا تھا، لیکن اس نے تین مہینے یہاں گزار دیئے۔ ابتدا میں کبھی کبھی وہ اطراف اور اکبر کے ساتھ شہر کا شکار کھینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب شکار سے اس کا جی بھر گیا تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تیراندازی، نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

تین ماہ بعد جب وہ اطراف اور اکبر خاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں سے جدا ہو رہا ہے۔ اطراف اکبر اور علاقہ کے چند آدمی اودھ کی سرحد تک اسے چھوڑنے کے لیے آئے۔ اکبر خاں کے ساتھ جب وہ مصافحہ کر رہا تھا تو اس نے ابدیدہ ہو کر کہا: "بھائی جان، آپ پھر کب آئیں گے؟"

"مجھے معلوم نہیں، اکبر خاں! ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے بعد ہم اس زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔"

اکبر خاں سے رخصت ہو کر معظم علی نے آگرہ اور دہلی کا رخ کیا۔ دہلی سے واپسی پر کچھ عرصہ لکھنؤ ٹھہرا اور بالآخر اپنے ساتھی مسلمانوں کی زبوں حالی کی دلگراش داستانیں لے لے کر پینا پہنچا۔



گھر میں معظم علی کو سکون نصیب نہ ہوا کچھ عرصہ وہ بیکاری کے لمحات کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا رہا۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کی طبیعت کتابوں سے بھی اجاڑ ہو گئی۔ ایک دن اس کا بھائی یوسف علی رخصت پر گھر آیا اور ایک ہفتہ رہ کر واپس چلا گیا۔ جب معظم علی

کے رخصت کے دن ختم ہونے کے قریب آ رہے تھے تو اس نے چند بار استعفا لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھا تو اس کی قوت فیصلہ جواب دے جاتی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سراج الدولہ مرشد آباد آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا: "کیسے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"معظم علی نے جواب دیا: "میں چند دنوں سے یہاں پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "میری درخواست ہے کہ ہنگی کے قلعے کی کمان آپ کے سپرد کر دی جائے میں ایک ہفتہ تک واپس جا رہا ہوں اس لیے آپ تیار رہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "ہنگی کے قلعے کے لیے آپ میری ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ انتظار کرنے کی بجائے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

بہت اچھا! شام تک آپ کے پاس میرا حکم نامہ پہنچ جائے گا۔"

اگلے دن علی الصباح معظم علی ہنگی کا رخ کر رہا تھا اور چند دن بعد ہنگی کے قلعے کے ارٹھلے پاسی اور افرامیک دوسرے شہر تک پہنچے تھے کہ نیا کماندار ہمیں ایک لمحے کیسے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

معظم علی ایک سال بعد چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہوئے والی ہے۔ اس کے والدین اور مرزا حسین بیگ کی درخواست تھی کہ وہ شادی کی تاریخ تک واپس نہ جائے۔ چنانچہ اس نے سراج الدولہ کو لکھا کہ مجھے تین ہفتے اور مرشد آباد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس خط کا جواب آنے سے پہلے اڑلہ میں ایک نئے انقلاب کی خبر آگئی اور وہ یہی کہ مرہٹوں نے اچانک حملہ کر کے میر صاحب کو جسے علی وردی خاں نے مرہٹوں سے مصالحت کی خاطر کنگ کا فوجدار تسلیم کیا تھا، قتل کر دیا ہے اور ان کی افواج اڑلہ کے بیشتر اضلاع پر قابض ہو چکی ہیں۔

معظم علی کو اپنے باپ کی زبان یہ معلوم ہوا کہ علی وردی خاں نے مرشد آباد کی فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا ہے اور ڈھاکہ اور ہنگی کے فوجداروں کو یہ فرمان بھیجا ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنی



افواج لے کر اڑلیہ کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر ہنگامی کارخ کیا۔

دو ہفتوں کے بعد ہنگامی اور مرشد آباد کی فوج کلک سے چند منزل دور پڑاؤ ڈال کر ڈھاکرے میرمدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمود علی اور افضل بیگ مرشد آباد کی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ پانچ دن بعد میرمدن بھی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب میرمدن کی فوج پڑاؤ میں داخل ہوئی تو فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے میرمدن نے گھوڑے سے اتر کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب معظم علی کی باری آئی تو اس نے کہا: "معظم علی! تمہیں دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ دور ہوگئی ہے۔ میں سراج لڑنے سے ملنے کے بعد تمہارے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں گا۔"

میرمدن ایک افسر کی رہنمائی میں سراج الدولہ کے خیمے کی طرف بڑھا اور افضل نے جو چند قدم دور کھڑا تھا معظم علی کو آواز دی: "معظم علی! تمہارے بھائی جان بھی آگئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟" معظم علی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ "وہ دیکھو۔" افضل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف علی کوئی تیس قدم دور لشکر کے چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ معظم علی اور افضل تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یوسف علی نے ان کے ساتھ یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا۔ اچانک افضل کو معظم علی کے پیچھے ایک اور نوجوان دکھائی دیا جو اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

افضل نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا: "آپ یہاں کیسے آئے؟"

"میں ڈھاکرے کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

افضل نے کہا: "مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے قدرے آزدہ ہو کر جواب دیا: "اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں

اپنے ساتھ دو سواروں کا بھی لایا ہوں۔"

معظم علی نے دبی زبان میں یوسف سے پوچھا: "بھائی جان یہ کون ہیں؟"

"یہ شوکت بیگ ہیں۔ جن کی افضل کی ہمیشہ کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔"

افضل نے شوکت بیگ کو معظم علی کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا: "یہ معظم علی ہیں،

یوسف علی کے چھوٹے بھائی۔"

شوکت بیگ نے آگے بڑھ کر معظم علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میرا نام شوکت

بیگ ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔"

شوکت بیگ کھلتے ہوئے رنگ کا ایک قوی الجڑہ نوجوان تھا اور چہرے سے اس کی

عمر کوئی پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، محمود علی، یوسف، افضل اور مرزا شوکت بیگ ایک خیمے میں

بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اب تک معظم علی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ

شوکت بیگ ڈھاکرے کے ایک بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے اور میرمدن کی فوج کے

ساتھ اس کی آمد اس کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ لیکن یوسف علی سے استفسار پر اسے

معلوم ہوا کہ وہ اپنی ذاتی فوج کے دو سو سپاہیوں کے ساتھ ایک رضا کار کی حیثیت میں

میرمدن کے ساتھ آیا ہے۔ معظم علی کے نزدیک اس کا یہ جذبہ قابل قدر تھا اور اس نے

شوکت بیگ سے غماط ہو کر کہا: "مرزا صاحب! آپ بنگال کے اُمراء کے لیے ایک

بہت اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ درازاب تو حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں آجماں

خبرات کا احساس تک باقی نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے جواب دیا: "اجتماعی خطرے کا مجھے بھی کچھ زیادہ احساس نہیں تھا۔"

میں نے صرف آپ کی تقلید کی ہے۔ جب مرشد آباد پر حملہ ہوا تھا اور میں نے یہ سنا تھا کہ آپ

نے اپنے محلے کے چند رضا کاروں کے ساتھ مرہٹوں کی ایک منظم فوج کے دانت کٹے کر دیئے

کے والد کے نہایت دوستار تعلقات میں ہے۔



چند ہفتے جنگل اور مرہٹہ افواج کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتیں رہیں، پھر مرہٹہ سپہ سالار جانوجی نے ایک شدید حملہ کے بعد جنگل کی فوج کو مینا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جنگل کی فوج اب مینا پور کو اپنا مستقر بنا کر اڑیسہ کی شمالی سرحد کے آس پاس مرہٹوں کے اکادمی حملہ روکنے پر اکتفا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار یاں ہی کر رہی تھی۔ پھر اچانک ایک دن یہ اطلاع آئی کہ مرہٹوں کے ساتھ بعض افغان سرداروں کے ساز باز کے باعث بہار کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے علی درودی خاں نے مرہٹہ سپہ سالار جانوجی کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر کے شکر کو واپس بلا لیا۔ فوج کا کوئی سپاہی یا افسر اڑیسہ کا صوبہ اس طرح جانوجی کے حوالے کر دینے پر خوش نہ تھا۔ لیکن شوکت بیگ کے لیے یہ خبر انتہائی ناقابل برداشت تھی۔ میرمدن نے اسے شروع سے چند خفیہ قیدیوں کی نگرانی سونپ رکھی تھی اور اسے انتہائی کوشش کے باوجود کسی مولی لڑائی میں بھی اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ لشکر کی واپسی کی خبر سننے ہی انتہائی غم و غصہ کی حالت میں میرمدن کے خیمے میں داخل ہوا اور اس پر برس پڑا۔ میر صاحب میں یہاں مکھیاں مارنے نہیں آیا تھا۔ میرے آدمی گھر جا کر میرا مذاق اڑاتے گئے۔ میرمدن سکڑا۔ میرے خیال میں تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کوئی سالار اشد ضرورت کے بغیر ناخبر بہ کار رضا کار کو کسی مہم پر نہیں بھیج سکتا اور تمہیں معلوم ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ اکادمی جھڑپوں میں ہم نے صرف نہایت آزمودہ کار دستے بھیجے تھے۔ اگر باتان عدو جنگ شروع ہو جاتی تو تمہیں یقیناً اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔

مستمعل خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: آپ نے مجھے بلایا ہے؟

ہاں۔ مجھے تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بہار کے ہندوش

تھے، تو میرے دل میں بھی اپنے مزاحمتی کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر ایک دفعہ جب مرزا حسین بیگ ہمارے یہاں تشریف لائے اور انھوں نے آپ کے شاندار کارنامے کی بے حد تعریف کرنے کے بعد مجھے بھی تبلیغ کی تو میرا خیال پختہ ہو گیا۔ ہمارا گھر ڈھاکے سے پندرہ میل دور ہے۔ مرزا صاحب اپنے خطوط میں بار بار یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ ہمارے مکان کے گرد ایک مضبوط فیل اور ایک گہری خندق کا ہونا ضروری ہے اور میں نے اپنی کچھ کے مطابق مرزا صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

رات کے وقت جب معظم علی کو تنہائی میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا: بھائی جان! مجھے تو مرشد آباد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے؟

یوسف نے جواب دیا: فرحت کی شادی اس مہم کے اختتام تک کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ مرزا حسین بیگ نے اڑیسہ کے حالات کی اطلاع ملتے ہی شوکت بیگ کے والد کو لکھا تھا کہ افضل فوج کے ساتھ اڑیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے فرحت کی شادی ملتوی کر دی جائے شوکت بیگ غالباً مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔ یہ میرمدن کے ساتھ آگیا ہے۔

مستمعل نے سوال کیا: آپ اس سے کب متعارف ہوئے؟

اس نے خود ہی ڈھاکہ میں تلاش کیا تھا۔ ایک دن یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے مرزا حسین بیگ نے لکھا ہے کہ میں آپ سے ملوں۔ شوکت بیگ اچھا آدمی ہے۔ ایک دن یہ مجھے اپنے گھر بھی لے گیا تھا۔ ان کا خاندان بہت با اثر ہے اور میرمدن کے ساتھ اس

حالات کے پیش نظر اڈیس کے متعلق جانچی کے ساتھ تصفیہ کر چکے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مرہٹے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہیں گے۔ بہار کے جنوب مغربی علاقوں کو ان کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کے لیے سراج الدولہ کی نگاہ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ اب اڈیس کی بجائے بہار کی جنوب مغربی سرحد کا آخری قلعہ تھارا مستقر ہوگا۔ وہاں اس وقت تک اطراف کی کئی بستیائیں مرہٹہ لیڈروں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا: میرے صاحب! میں اس مہم میں معظم علی کا ساتھ دوں گا! میرمن نے جواب دیا: نہیں، میں ایک رضا کار کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتا۔

شوکت بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا: میں آپ کے سامنے ملت اٹھتا ہوں کہ جب تک معظم علی اس مہم سے فارغ ہو کر گھر نہیں جاتا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ معظم علی نے کہا: میں آپ کی ضد کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر جانچی کے ساتھ کوئی ٹھکانہ ہو چکی ہے تو اس علاقے میں کسی باقاعدہ جنگ کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جنگل میں بکھرے ہوئے لیڈروں اور ہڈیوں سے چٹنے کے لیے ہمیں انتہائی تجربہ کار سپاہیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں آپ کی بہادری کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں نا تجربہ کار رضا کاروں کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اب گھر جانا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ آپ جنگلوں میں ہمارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے وہاں جنگل کے لیے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

شوکت بیگ نے قدرے برہم ہو کر کہا: میں آپ کا شکور گزار ہوں کہ آپ میری جان کو اس قدر قیمتی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں دشمن کے ساتھ لڑنے کی نیت سے آیا ہوں! پھر وہ میرمن کی طرف متوجہ ہوا: "میر خیال ہے کہ ایک رضا کار کی حیثیت میں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ معظم علی مجھے اپنا ساتھی بنانے سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ی جنگل میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ آخر آپ

میری جان ان سپاہیوں سے زیادہ قیمتی کیوں سمجھتے ہیں جو جنگ میں شہید ہو چکے ہیں؟ میرمن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "اگر تمہارا بھی فیصلہ ہے تو میں منع نہیں کرتا۔ معظم علی اسے اپنے ساتھ لے جاؤ!"

مستم علی نے جواب دیا: "بہت اچھا۔ لیکن میں نے فوجی تربیت آپ سے ماہل کی ہے اور میرے افسر اور سپاہی اکثر شاکی رہتے ہیں کہ میں نظم و ضبط کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اس لیے جب تک یہ میری نمان میں ہیں انھیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ انھیں کسی ترجیحی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔"

میرمن نے شوکت بیگ کی حرفت دیکھا اور وہ بولا: "جناب میں جانتا ہوں کہ میں سیر و سیاحت کے لیے نہیں آیا۔"

تھوڑی دیر بعد جب محمود علی، یوسف اور افضل کو شوکت بیگ کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔

اگلے روز علی الصباح دھڑلہ دار معظم علی کی قیادت میں کوہج کے لیے تیار کھڑے تھے اور محمود علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا: "مستم! شوکت بیگ کا خیال رکھنا۔ اگر غرضاً اسے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہم مرزا حسین بیگ کو مدد دھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"



چند ماہ بعد معظم علی پھر ایک دور افتادہ قلعے میں مقیم تھا، اس عرصہ میں دشمن کے ساتھ اس کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ لیکن دور دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں مرہٹے ایک جگہ سے مار کھا کر بھاگتے تو دوسری جگہ کسی دوسری بستی پر حملہ کر دیتے۔ معظم علی اپنی فوج کے باقاعدہ سپاہیوں اور افسروں سے کام لینا جانتا تھا، لیکن شوکت بیگ اور اس کے رضا کار ساتھیوں کی رفاقت اس کے لیے ایک سرگرمی تھی۔ وہ انھیں قلعے کی حفاظت فوج کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن شوکت بیگ ہر خطرناک مہم میں اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا کرتا تھا۔

کچھ سزاؤ کی رات کے وقت معظم علی کو قلعے سے میں میل دور دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اسی وقت پانچ سو سواروں کو تیار کیا۔ شوکت بیگ نے حسب معمول سنا جانے پر امرار کیا اور اس دفعہ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس مہم میں معظم علی کو احساس ہوا کہ یہ سادہ دل و نوجوان حماقت کی حد تک بہادر ہے۔ اس لڑائی میں شوکت بیگ یہ ثابت کر چکا تھا کہ گولوں کی بادش میں ہی وہ سینہ تان کر کھڑا ہو سکتا ہے اور پھر جب دشمن کے سپاہی شکست کھا کر جنگل میں بھاگ رہے تھے تو وہ معظم علی کے احکام کا انتظار کیے بغیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ جن سپاہیوں نے اسے جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا وہ شام کے وقت معظم علی سے یہ کہہ رہے تھے: "یہ عرض اتفاق ہے کہ یہ نوجوان زندہ واپس آگیا ہے۔"

جب شوکت بیگ کئی میل مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آیا تو اس نے معظم علی سے کہا: "میں نے سات آدمی اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں لیکن انفس کو یہ ا گھوڑا اٹھ گیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "دیکھو شوکت! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تم بہادر ہو لیکن تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ آئندہ تم نے ایسی حریت کی توبہ مجبوراً نہیں تھے میں بند رکھنا چاہتا ہوں گا۔ تمہارے آٹھ آدمی بلاوجہ مارے گئے ہیں۔"

شوکت نے جواب دیا: "لیکن ان آٹھ آدمیوں میں سے ہر ایک کم از کم دو مرہٹوں کو ساتھ لے کر رہا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر وہ آٹھ آدمی زندہ رہتے تو یقیناً اس سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے۔"

شوکت بیگ نے کہا: "یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ لیکن آئندہ کے لیے میں محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اس لڑائی میں تمہاری کارگزاری دیکھنے کے بعد اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو تو میں آج ہی تمہیں واپس بھیج دیتا۔"

اس واقعہ سے چند ماہ بعد معظم علی کو قلعے کے جنوب میں تیس میل دور مرہٹوں کے ایک لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اپنی دو تہائی فوج قلعے میں چھوڑ کر باقی سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ آٹھ دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سو قیدی تھے۔ فوج کا ایک فہر اسے قلعے کے دروازے پر ملا اور اس نے مغموں کے لیے کہا: "جناب مرزا شوکت بیگ زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔"

معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: "کہاں ہیں وہ۔ وہ زخمی کیسے ہوئے۔؟ جواب کیوں نہیں دیتے۔؟ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

انفرنر نے جواب دیا: "وہ اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہمارا کہا نہیں ملا۔ کل میں شمال کی طرف چند بستیوں میں مرہٹوں کے لوٹ مار کی اطلاع ملی تھی۔ نائب کمانڈر نے اسی وقت دو سو سوار روانہ کر دیئے۔ مرزا شوکت بیگ اس مہم میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ ہم نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔"

تم سب بوقت ہو۔

معظم علی یہ کہہ کر بھاگتا ہوا قلعے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ شوکت بیگ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس کے سینے، گردن اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فوجی طبیب کے علاوہ چند انفرنر اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ معظم علی نے کمرے میں داخل ہو کر شوکت بیگ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر طبیب کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: "بڑے زیادہ شدید تو نہیں؟"

طبیب نے جواب دیا: "بہت شدید ہیں۔"

معظم علی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے سالاروں کی طرف دیکھا اور کہا: "میں"

نے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے اور اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم میں سے کس کی حفاظت کا نتیجہ ہے؟

ایک سالہ نے جواب دیا۔ ہم سب نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر میں احتیاطاً ڈیٹھ سو پاسی لے کر ان کے پیچھے گیا تھا۔ رہنے میں دیکھتے ہی جھاگ نکلتے۔ ہم نے کوئی پانچ میل ان کا تعاقب کیا اس کے بعد جنگل زیادہ گنجان تھا اور میں نے سپاہیوں کو پاسی کا حکم دیا۔ لیکن یہ موٹوں کا بیچا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں مجبوراً ان کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور چیخ چیخ کر انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اچانک گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ان کی آن میں ہمارے پچیس آدمی گر پڑے اس کے بعد مرہٹے مقابلہ کرنے کی بجائے جنگل میں غائب ہو گئے۔ یہ بری طرح زخمی تھے۔ آپ ان کے آدمیوں سے پوچھ سکتے ہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کاش آپ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت ہوتی کہ اگر یہ زبردستی قتلے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انہیں کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے!

معلم علی ڈھال سا جو کہ شوکت بیگ کے بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ تم نے بہت بڑا کیا۔ اب میں مرشد آباد واپس جا کر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

شوکت بیگ نے آنکھیں کھولیں اور کہتے ہوئے کہا: آپ کے ساتھی بے قصور ہیں انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن کا بیچا کیا تھا۔

معلم علی نے پامید ہو کر طبیب کی طرف دیکھا اور ملتی جلتی بیجے میں کہا: آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں!

طبیب نے جواب دیا: آپ اطمینان رکھیے میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔

شوکت بیگ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

شام تک شوکت بیگ پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد معلم علی انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں قلعے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ وہ قصور میں کبھی مرزا حسین بیگ اور کبھی فرحت اور اس کی والدہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہے تھے: تم نے شوکت کو تنہا کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ جب ڈھاکہ کی فوج واپس آ رہی تھی تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟ وہ مذمت کے ناکارہ مل برداشت بوجھ تلے پیا جا رہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار اس قسم کی دعائیں نکل رہی تھیں: میرے مولیٰ! اگر تیری بارگاہ میں میری کوئی دعا قبول ہو سکتی ہے تو میں تجھے شوکت کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ میں مرتے دم تک فرحت کا خیال اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میں غلوں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اس میں تمام وہ خوبیاں ہیں جو فرحت کے رفیق حیات میں ہونی چاہئیں، وہ فرحت کو خوش رکھ سکتا ہے اور فرحت کی خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی تنہا ہے۔

طبیب شوکت کے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے معلم علی کے قریب پہنچ کر کہا: وہ اب ہوش میں ہے اور آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔

معلم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شوکت بیگ کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اسے شوکت بیگ کا چہرہ بے حد مد نظر آتا تھا۔ اس نے مفہوم لیجے میں کہا: شوکت اب کیا حال ہے؟

شوکت نے ایک مفہوم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا: میرے دوست آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کی حکم برداری کی۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

شوکت بیگ! مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہارا زہر دھنا ضرور آتا ہے۔

ایک دن میرے ابا جان نے مرزا حسین بیگ کے سامنے میری تعریف کی تو انھوں نے کہا۔  
- بنگال میں صرف ایک فوجان پیدا ہوا تھا اور اس کا نام معظم علی تھا۔ پھر ہماری سنگی ہو گئی اور  
اس کے چند ہی ہفتے بعد تم واپس آ گئے۔

میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جب ڈھاکہ کی فوج اڑیسہ کی طرف کوچ کی  
تیار کر دی تھی تو میرے ابا جان کو حسین بیگ کا خط ملا جس میں انھوں نے یہ لکھا تھا کہ  
افضل عاظمی پر جا رہا ہے۔ مرہٹے ہماری قوم کے ہر فوجان کو اڑیسہ کے میدانوں میں وکار رہے ہیں  
اس لیے میری خواہش ہے کہ جگہ کے اختتام اور افضل بیگ کی واپسی تک شادی ملتوی  
کر دی جائے۔ انھوں نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے جن دوستوں کا شادی کے موقع  
پر ہونا ضروری ہے وہ سب عاظمی پر جا چکے ہیں۔ میں اسی وقت سیدھا میرے مکان کے پاس پہنچاؤ  
انھیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ میرے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی۔ میں  
مرزا حسین بیگ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بنگال کے کسی فوجان سے کم نہیں ہوں۔ میری  
یہ خواہش تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر میں کسی آدمی کی بجائے صرف میرے بہادر و کارناموں کا  
ذکر ہو۔ میں ہر میدان میں تم سے چند قدم آگے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ  
میرا انجام نہ دے سکا۔ میں کوشش کے باوجود ان لوگوں کی صف میں گھراؤ ہو سکا۔ جنھیں  
لڑائی کے بعد داؤد حسین کا ستمی سمجھا جاتا ہے۔ تم ہر میدان میں مجھ سے آگے تھے اور میں یہ  
محسوس کرتا تھا کہ میری حیثیت ایک تاشانی سے زیادہ نہیں۔ اس وقت اگر مجھے کسی بات کا  
انوس ہے تو وہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک بہترین دوست اور ساتھی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔  
مرزا حسین بیگ دوست کہتے تھے کہ بنگال نے صرف ایک فوجان پیدا کیا اور وہ معظم علی ہے۔  
معظم علی نے کہا۔ "بنگال کے ہزاروں فوجان مجھ سے بہتر ہیں اور تم ان میں سے ایک ہو۔"  
شوکت بیگ نے کہا۔ "معظم علی مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہم ایک دوسرے  
کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے لیکن میری منزل اب قریب آ چکی ہے۔ اس وقت

شوکت نے کہا۔ "آپ مجھے ہمیشہ خطرے کے سامنے جانے سے روکنے کی کوشش  
کیا کرتے تھے، مجھے اس بات سے چڑھ چکی تھی۔ میں کہیں سے بے حد ضدی ہوں۔ میں ہمیشہ  
یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ آپ شاید مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"  
"نہیں شوکت! مجھے صرف اس بات کا ڈر تھا کہ تمھاری عزت میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔"  
شوکت نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ ہائی آدمیوں کے مقابلے میں  
بہتر جان اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر تم باقاعدہ فوج کے سپاہی ہوتے تو تمھیں یہ کہنے کی ضرورت  
پیش نہ آتی۔ لیکن تم ایک رضا کار کی حیثیت میں آئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ صحیح سلامت  
اپنے گھر واپس جاؤ۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمھاری شادی ہونے والی ہے اور ایک ایسے غافل  
کی فکر سے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم تندرست  
ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤ اور جدا مجھے مرزا حسین بیگ کے سامنے شرمسار نہ رہو۔"  
شوکت بیگ نے کہا۔ "میں شاید گھر واپس نہ جاسکوں۔ لیکن آپ جب مرزا حسین بیگ  
سے ملیں تو ان سے یہ ضرور کہیں کہ میری موت ایک سپاہی کی موت تھی۔ میں اس بات کا شرم  
کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سپاہی بننے کا شوق بھی نہ تھا اور یہ شوق صرف تمھاری وجہ سے پیدا  
ہوا۔ میں کہیں میں ہی اپنے والدین سے سنا کرتا تھا کہ میری سنگی مرزا آباد کے ایک معزز خاندان  
کی لڑکی کے ساتھ ہو گئی۔ اس کے بعد بڑا ہو کر میں نے یہ سنا کہ ایک عزیز خاندان  
کے لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت کی ہے اور شاید وہ اس  
کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ پھر تمھاری قید کے زمانے میں  
مرزا صاحب ہمارے ہاں آئے تو وہ بات پر تمھارا تذکرہ کرتے تھے اور مجھے بار بار یہ  
احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس زمانے میں ہر فوجان کے لیے سپاہی بننا لازمی  
ہے اور میں تمھیں دیکھ کر بغیر تمھارے متعلق اپنے دل میں ایک رفاقت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔"

گھر مرزا حسین بیگ یہاں موجود ہوتے تو میں ان سے یہ کہتا کہ میں نے معظم علی بننے کی کوشش کی تھی اور میری حماقت تھی۔

انسان اپنی زندگی میں عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ایک دن وہ تھا جب تمہارا نام میرے نزدیک ایک گالی تھا۔ معظم علی برا نہ مانا۔ اب مجھے یہ باتیں کہتے ہوئے بھیک محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات سے چڑھتی کہ تم مرزا حسین بیگ کے پڑوس میں رہتے ہو اور مجھ کا ہر آدمی تمہاری تعریفیں کرتا ہے۔ میں نے آج تک فرحت کو نہیں دیکھا لیکن جو کچھ اس کے متعلق میں نے اپنی ماں اور بہنوں سے سنا تھا وہ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ایسی جگہ کا شریک حیات بننا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ مجھے یہ بات گوارا نہ تھی، کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جانتی ہو جو مجھ سے بہتر اوصاف کا مالک ہو۔ فرحت کے رشتے سے مرزا حسین بیگ کا انکار میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی اور میرے لیے اس شکست کا سب سے زیادہ ناقابل برداشت پہلو یہ تھا کہ میرے مقابلے میں ایک عزیز خاندان کے لڑکے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اپنے والدین کی باتوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ فرحت کے والدین تمہاری طرف مائل ہیں۔ پھر جب تم لا پتہ ہو گئے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرے راستے سے ایک پہاڑ ٹھٹ گیا ہے۔ لیکن فرحت کے ساتھ ملگنی ہو جانے کے بعد بھی میری خوشنما رہی تھی۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے معظم علی نہیں بن سکا گا۔ پھر ہماری شادی کی تاریخ طوی کرنے کے متعلق مرزا صاحب نے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے بے حسی، بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیا جا رہا ہے جب میں گھر سے دوازا ہوا تھا تو میرے عرا تم یہ تھے کہ میں کسی دن فرحت کے پرچم لہراتا ہوا واپس آؤں گا۔ اور فرحت، عزت اور ناموری کے سینکڑوں تاج فرحت کے قدموں پر ڈھیر کر دوں گا۔ تم میری حماقتوں پر منہ ہو گے۔

معظم علی نے کہا: "نہیں شوکت! میں جانتا کہ تمہارے سینے میں ایک نبایت حسین

دل ہے۔ لیکن کاش اس سے پہلے میں تمہیں یہ بتا سکتا کہ میں جس فرحت کو جانتا ہوں، وہ ان لڑکیوں سے مختلف ہے جو اپنے رفیق حیات کا دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتی ہیں۔"

شوکت بیگ نے کہا تم اسے جانتے ہو اور تم اس سے محبت کرتے ہو؟  
معظم علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کہا: "شوکت خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ تمہارے لیے ہے اور میں اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں تندرست ہوتے ہی گھر بھیج دوں گا۔"

شوکت بیگ نے کہا: "میرے دوست ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے یہ باتیں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں، صرف اس لیے کہ میں کہ میرے دل پر یہ ایک بوجھ تھا کہ میں ایک ایسے آدمی کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور رقابت کے جذبات رکھتا تھا جس کے ساتھ مجھے محبت کرنی چاہیے تھی۔ معظم علی! تم انسان نہیں ایک فرشتہ ہو۔ کاش اس وقت افضل کی بہن یہاں موجود ہوتی اور اسے میں یہ کہہ سکتا کہ میں تمہارا مستقبل ایک بہتر انسان کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ شوکت بیگ نے یہ کہہ کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ معظم علی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے اور شوکت بیگ کے ہونٹوں پر ایک سکرا ہٹ کھیل رہی تھی۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پر شوکت بیگ کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سانس اکھٹکی تھی۔ معظم علی نے طبیب کو آواز دی طبیب نے اگر شوکت بیگ کی بخش دیکھی اور اس نے منوم لیجے میں کہا: "ان کا وقت آچکا ہے۔ اس کے بعد وہ دیر تک جانکی کی حالت میں پڑا رہا اور رات کے پچھلے پہر جب قلعے سے باہر کسی درخت پر کوئل کی آواز صبح کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ شوکت بیگ اپنا سفر حیات ختم کر چکا تھا۔

ماں سے کہا: امی جان! میری رخصت منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

ماں نے مغموم لہجے میں کہا: میرا خیال تھا کہ سراج الدولہ اور میرمدن تھیں مرشد آباد میں کوئی عہدہ دے دیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا: امی جان! میرا دل جانا ضروری ہے۔ میں نے میرمدن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائی یوسف کو ڈھاکہ سے یہاں بلا لیں اور انھوں نے میری یہ بات مان لی ہے۔

ماں نے کہا: بیٹا! میں ایک عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر جا کر تھارے رشتے کے متعلق کچھ کہوں۔ ابھی فرحت کی ماں مجھ سے مل کر گئی ہے اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ جج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مرزا صاحب فرحت کے رشتے کے متعلق ہمارے طرف سے سلسلہ جنبانی کے منتظر تھے۔ میں نے کہا: بہن میں تو ہر روز معظم کے باکو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا کرتی تھی، لیکن انھیں حوصلہ نہیں ہوا۔ اب اگر آپ تیار ہیں تو میں ابھی محلے میں مٹھائی تقسیم کرواتی ہوں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں جج سے مرزا صاحب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔

معظم علی نے جھپکے اور شرماتے ہوئے کہا: امی جان فرحت کیسی ہے؟

ماں نے جواب دیا: فرحت چند ہفتوں سے کچھ بیمار تھی۔ لیکن اب بالکل ٹھیک ہے۔ چند دن بعد معظم علی سرحدی قلعے میں پہنچ چکا تھا۔

○  
علی دردی خاں کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ انگریزوں کی تجارتی کمپنیاں قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ عریض قسمت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مال تجارت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے

○  
طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد شوکت بیگ کو سپردِ خاک کیا جا چکا تھا اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ معظم علی نے شوکت بیگ کے والد اور مرزا حسین بیگ کے نام خطوط لکھ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

اگلے دن معظم علی، علی الصباح ایک ہزار سوار لے کر مرہٹوں کے قعاقب میں روانہ ہوا اور چند مہینے سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں امن کا بیجا کرتا رہا۔ جب وہ اس ہم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو قیدی تھے۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ سال وہ سرحد کے اہم مقامات پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے اور مرہٹوں کے ستائے ہوئے لوگوں کی ویران سیوتوں کو دوبارہ آباد کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے میرمدن کے نام درخواست لکھ کر ایک ماہ کی رخصت لی اور مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

مرشد آباد پہنچنے ہی اسے معلوم ہوا کہ علی دردی خاں بستر مرگ پر ہے اور سراج الدولہ نے میرمدن اور سلطنت کے چند اور بڑے عہدیداروں کو مرشد آباد بلا لیا ہے۔ مرزا حسین بیگ کے متعلق اسے یہ اطلاع ملی کہ وہ چند ہفتے قبل ایک جہاز پر حج اور مقامات مقدسہ کی زیارت کی نیت سے روانہ ہو چکے ہیں۔

معظم علی نے گھر میں اپنی چھٹی کے پانچ دن گزارے تھے کہ علی دردی خاں اپنی مکمل آہنا اور مرشد آباد کے باشندے یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنگال کا وہ دفاعی حصار ٹوٹ چکا ہے جسے وہ اپنی آزادی اور بقا کی سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے۔ مرشد آباد کی مساجد میں علی دردی خاں کے لیے مغفرت اور بنگال کے نئے حکمران سراج الدولہ کے لیے کامیابی اور کامرانی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

علی دردی خاں کی وفات کے تین دن بعد معظم علی نے میرمدن سے جسے ڈھاکہ سے بلار بنگال کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی تھی، ملاقات کی اور اس کے بعد گھر واپس آکر اپنی



ساتھ سازباز کرنے لگے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی اور اس نے مسند حکومت پر بیٹھے ہی سب سے پہلے ایٹلٹھیا کینی کی طرف توجہ کی۔ انگریز تاجر حکومت بنگال کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قلعہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے نئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن فورٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔

معظم علی چند ماہ سے مغربی سرحد پر اپنا مورچہ سینھلے ہوئے تھا۔ اسے انگریزوں کے متعلق سراج الدولہ کے عزائم کا علم ہوا تو اس نے میرمدن کو ایک خط لکھا کہ اب سرحدی علاقوں کو کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا موقع دلایا جائے۔

چند مہینوں تک انہیں کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا اور وہ سخت بے چین رہا۔ پھر ایک دن اسے میدانِ چھکے فوجدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے چار دن بعد اسے میرمدن کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ہم انگریزوں کو ایک عبرتناک شکست دے چکے ہیں لیکن تمہیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اس کامیابی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ انگریزوں کے خلاف ہم نے ایک لڑائی جیتی ہے لیکن بنگال کو ان کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے ہمیں شاید ایسی کئی اور جنگیں لڑنی پڑیں اور ان جنگوں سے ہم اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سرحدی علاقے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہوں۔ تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور تم نے ہر مرحلے پر اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ جب تک انگریزوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوتی تم بنگال کے

مغربی دروازے پر پہرہ دیتے رہو اور میں تم جیسے سمجھدار نوجوان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑنے والے سپاہی کی نسبت خاموشی سے پہرہ دینے والے سپاہی کا کام بسا اوقات زیادہ صیر آدمی ہوتا ہے۔

چند مہینے اور گزر گئے اور معظم علی کو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ سراج الدولہ انگریزوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مرزا حسین بیگ حج سے واپس آگئے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ تم چند دن کے لیے گھر آؤ۔ اس نے میدانِ پور کے فوجدار کو ایک ماہ کی رخصت کے لیے درخواست بھیجی، لیکن اس نے جواب میں لکھا کہ "موجودہ حالات میں تمہیں ایک دن کیلئے بھی چھٹی دینا ممکن نہیں۔ نواب سراج الدولہ نے مجھ سے پانچ ہزار سوار دو مہینوں کے اندر اندر مرشد آباد بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے انہوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی تاہم یہ سالار کے خط سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ عنقریب انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ مدت اور انتظار کرو۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کی چھٹی دے دوں گا۔ فی الحال پانچ ہزار سواروں کی تعداد پوری کرنے کیلئے تمہارے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی اپنے تمام فالتو سپاہی میرے مرشد آباد روانہ کر دو اور اپنے پاس صرف اتنے آدمی رکھو جو قلعے اور سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اشد ضروری ہوں۔"

معظم علی نے یہ خط ملتے ہی پانچ سو سپاہی قلعے کی حفاظت اور تین سو اس پاس کی چھوٹی چھٹی چوکیوں کی نگرانی کے لیے روک لیے اور باقی فوج کو اپنے ایک تجربہ کار انسٹرکٹر کے کمان میں دے کر مرشد آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا۔



چند مہینے معظم علی کو مرشد آباد کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی اور وہ سخت بے چین رہا۔

میں حملہ کر کے ہمارے بیشتر آدمی قتل کر دیئے۔ میرے باقی ساتھی ادھر ادھر بھاگ گئے تھے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

معظم علی نے ایک عرصہ اس طرف متوجہ ہو کر کہا: "عبدالرحمن! معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے بڑے پیلے پر مشتمل شہر شروع کر دی ہے۔ مجھے شاید اس مہم میں چند دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں قلعے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہوگی۔ تم اسی وقت تمام چکیوں کے سپاہیوں کو یہ حکم بھیج دو کہ وہ قلعے میں جمع ہو جائیں۔ اگر مرہٹوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔ ہمیں باہر سے کسی فوری کمک کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ اگر مرہٹے آگے بڑھ آئے تو یہ قلعہ ہمارا آخری سہارا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی تین سو سواروں کے ہمراہ قلعے سے باہر نکل گیا۔

سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے والے مرہٹوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی، وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سرحدی علاقے کی حفاظت فوج کی دفاعی طاقت کا اندازہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ علی الصباح قلعے سے چند میل دور مرہٹوں کے چند دستوں کے ساتھ معظم علی کے سپاہیوں کی جھڑپ ہوئی اور وہ معمولی مقابلہ کے بعد چندہ میں لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد اسے چند میل دور مرہٹوں کے ایک اور دستے کی اطلاع ملی اور اس نے چاروں طرف سے گھیر ڈال کر انہیں متقیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

مرہٹوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر سرحد کے لوگ اپنی بستیاں خالی کر رہے تھے لیکن معظم علی کی طرف سے بردت جنابی کارروائی کے باعث ان کے حوصلے بندھ گئے اور وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ایک شام کو پچاس مرہٹے ایک بستی کو لوٹے میں مصروف تھے۔ معظم علی خبر ملتے ہی وہاں پہنچا اور اس نے تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے پیچھے سے بیشتر مرہٹے بستی کے چوہدری کے پانچ میٹوں کے علاوہ دس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے جن کا

ایک دن اسے نمود علی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ: "مجھے سراج الدولہ نے اپنے محافظ دستوں کا سالار اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔ یوسف اور افضل بھی محافظ فوج کے سالار بنا دیئے گئے ہیں۔ ہمیں آٹھ پہر کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم ملا ہے اور انشاء اللہ غفر میرے تم پر سونگے کہ ہم بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا چکے ہیں۔" اس کے بعد چند دن اور گزر گئے اور معظم علی کو جنگ کے حالات کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک روز رات کے تیسرے پہر معظم علی قلعے کے اندر اپنی قیام گاہ کی چھت پر گری فینڈ سو رہا تھا۔ ایک پہر ملا نے اسے جگایا اور یہ اطلاع دی کہ مرہٹوں نے سرحد کی ایک چوکی پر اچانک حملہ کر کے تیس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ معظم علی جلدی سے بیچے اترے۔ چند سپاہی جو سرحد کی چوکی سے بھاگ کر آئے تھے قلعے کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظم علی ان سے حملے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایک پہر ملا بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ دروازے کے باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہماری چوکی پر بھی مرہٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

معظم علی نے تین سو سواروں کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر پہر ملا کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اگر تم اسے پہچانتے ہو تو اسے اندر آنے دو۔"

"جی میں اسے پہچانتا ہوں۔" پہر ملا یہ کہہ کر اسی طرح بھاگتا ہوا واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک آدمی ننگلواتا ہوا قلعے کے صحن میں داخل ہوا۔

معظم علی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا: "تم زخمی ہو؟"

"جی میں قلعے سے ایک میل دور گھوڑے سے گر پڑا تھا۔"

"تم کس چوکی سے آئے ہو؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"جی میں شمال کی تیسری چوکی سے آیا ہوں۔ مرہٹوں نے ہم پر بے خبری کی حالت

جرم صرف یہ تھا کہ وہ مرتبوں کے ہاتھوں چند لڑکیوں کی بے حرمتی خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔

معظم علی نے رات بھر اس بستی میں قیام کیا۔ صبح ہوئی تو اس نے اس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: "چوروں اور ڈاکوؤں کے سامنے بیڑوں کی طرح بھاگنے والوں کو بچانا کسی فوج کا کام نہیں۔ فوج کی مدد صرف ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے جو بہادری کی طرح جینا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ان چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اپنی بستیوں میں رضا کاروں کی فوج تیار کرو۔" پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم جیسے خوشخود دزدوں کے ساتھ جیٹی قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمہیں ان لوگوں کے رحم و کرم پہنچوڑتا ہوں۔ جن کے جوان بیٹوں اور بھائیوں کی رد میں انتقام کے لیے پکار رہی ہیں اور میں ان سے یہ کہوں گا کہ وہ تمہیں کسی انسانی سلوک باستی نہ سمجھیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے دوسرے ساتھی اس طرف آئیں تو انہیں اس بستی کے باہر درخت کے ساتھ تھاری لاشیں لٹکتی نظر آئیں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب معظم علی اس بستی سے رخصت ہوا تو مقامی لوگ گاؤں سے باہر تیس مرتبوں کے گلوں میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکا چکے تھے۔

چند دن تک مختلف مقامات پر درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس بات کا ثبوت دیتی رہیں کہ سرحد کا محافظان علاقوں سے گزر رہے۔

قریباً بیس دن کے اندر سرحدی علاقوں میں مکمل امن قائم کرنے کے بعد معظم علی واپس سپناؤ اس نے قلعے میں داخل ہوتے ہی اپنے قائم مقام سے سوال کیا۔ "مرشد آباد یا میدناپور سے کوئی اطلاع آئی ہے؟"

جی نہیں! قائم مقام نے جواب دیا:



دو دن بعد میدناپور سے ایک فوجی افسر جس کا نام ہاشم خاں تھا، تیس سواروں کے ہمراہ معظم علی کے پاس سپنا اور اس نے میدناپور کے فوجدار کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا "تم خط ملتے ہی قلعے کی گمان ہاشم خاں کے حوالہ کر کے میدناپور پہنچ جاؤ۔ میں چند اہم معاملات کے متعلق تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے خط پڑھنے کے بعد ہاشم خاں سے سوال کیا۔ "مرشد آباد سے جنگ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہے؟"

ہاشم خاں نے جواب دیا: "جنگ کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن مرشد آباد سے ایک خاص اہمچی میدناپور کے فوجدار کے پاس لیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے لیکن اس کی آمد کے متوڑی دیر بعد فوجدار نے مجھے اس طرف روانہ کر دیا اور میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ اہمچی کیا خبر لایا تھا۔ فوجدار نے اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ آپ فوج میدناپور پہنچ جائیں!"

معظم علی نے کہا: "اگر وہ تاکید نہ کرتے تو مجھے میری طرف سے تاخیر نہ ہوتی۔ میں دہاں پہنچ کر مرشد آباد کے حالات معلوم کرنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔"

قریباً آدھ گھنٹہ بعد معظم علی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ چار فوجان اس کے ساتھ تھے۔ وہ قلعے سے صرف چار کوس دور گیا تھا کہ اسے ایک سرسبز سوارا پنی طرف آنا دکھائی دیا جب ان کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو معظم علی کے ایک ساتھی نے کہا: "جناب وہ عبداللہ خاں معلوم ہوتا ہے۔"

معظم علی نے متوڑی دور آگے جا کر گھوڑا روکا اور آنے والے سوار کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ عبداللہ خاں نے قریب آکر کسی تمہید کے بغیر سوال کیا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں میدناپور جا رہا ہوں۔" معظم علی نے جواب دیا: "تم گھر کے حالات سناؤ!"

عبداللہ خاں معظم علی کی فوج کے پیاس سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد میں اس کا

مگر بھی معظم علی کے پڑوس میں تھا۔ قریباً تین ماہ سے وہ رخصت پر تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گردن جھکا کر معظم علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے عبداللہ؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے گردن ادا پر اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

”کیا ہوا عبداللہ؟“ معظم علی نے مضطرب ہو کر دوبارہ سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”میں بہت بری خبر لایا ہوں آپ

میں تاپور کی بجائے سیدے مگر جائیں۔ مرشد آباد لٹ چکا ہے!“

معظم علی گھوڑے سے کود پڑا اور عبداللہ کو دونوں باندوں سے پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے

چلتا۔ خدا کے لیے بھ جلدی بناؤ کیا ہو رہا ہے؟“

عبداللہ خاں نے بڑی مشکل سے اپنی چیٹیں مضبوط کرتے ہوئے کہا: ”آپ کے ابا جان

اور یوسف شہید ہو چکے ہیں۔ افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام

واقعات کی اطلاع مل چلی ہوگی۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں

کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔“

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی

موت کا یقین کر سکتا تھا۔ لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔

اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا: ”سراج الدولہ کہاں ہیں؟ ہمیں شکست کیسے ہوئی؟“

”سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد

آگئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔“

یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین

نہیں کر سکتا۔“

”ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ ہم اپنے نذرانوں کے ہاتھوں مارے

گئے ہیں۔ میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔

میر جعفر نے فوج کے افراد کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی

وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ میں جنگ میں شریک تھا اور غلاری اور طن فروشی کا منظر میں

نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارا تو پنچاز خاموش تھا۔ ہمارے بیشتر سوار میدان سے

دور کھڑے تھے۔ سراج الدولہ کے مشی بھر جاں نثار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گرے تھے

اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ ہماری توہیں اچانک آگ برساہیں گی۔ ہمارے سوار

اچانک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور ان کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم

تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں

کے سامنے یوسف اور افضل کو گرگرم توڑتے دیکھا تھا اور آپ کے ابا جان جب انہوں سے

چوہر ہو کر مرشد آباد پہنچے تھے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ سراج الدولہ انہیں محل میں اپنے ساتھ

لے گئے تھے۔ پھر رات کے وقت جب وہ مرشد آباد چھوڑ رہے تھے تو آپ کے ابا جان کو

گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ اسی رات کے وقت انہوں نے دم توڑ دیا تو محل کے لوگوں نے مجھ

سے کہا کہ میں آپ کو اطلاع دوں۔“

معظم علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: اب ہمیں میدان پور جانے کی

ضرورت نہیں۔ تم واپس قلعے میں چلے جاؤ۔ میری منزل مرشد آباد ہے۔ عبداللہ تھا کیا

ارادہ ہے؟“

”میں آپ کے ساتھ ہوں!“ اس نے جواب دیا۔

مرشد آباد کی طرف چند منازل طے کرنے کے بعد معظم علی نے یہ خبر سنی کہ سراج الدولہ

قتل ہو چکا ہے۔ میر جعفر نے لاڈ کلا لوبی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے اور

مرشد آباد میں سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔

## نواں باب

ایک رات جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی معظم علی اور عبداللہ خان اپنے محلے کی سنان گلی میں داخل ہوئے۔ عبداللہ خان کا گھر پہلے آتا تھا۔ معظم علی نے اس کے مکان کے دروازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا: عبداللہ اب تم اپنے گھر جا کر آرام کرو اور میرا گھوڑا بھی لے جاؤ۔

عبداللہ خان نے معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ اپنے مکان کی طرف چل دیا۔

تائیک اور سنان گلی میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد معظم علی نے اپنے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے صابر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق میں ایک کر رہ گئی۔

صحن کی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی وہ چند تانے توخت کے بعد دیوار پر چڑھا اور صحن میں کود پڑا۔ مردار صحن کا صحن تارک تھا اور گلی کی طرح یہاں بھی ایک بالشت پانی جمع ہو چکا تھا۔ معظم علی سامنے کی دیوار کے ایک کھلے دروازے سے گزرنے کے بعد رہائشی مکان کے صحن میں داخل ہوا۔ اسے نئی منزل میں کوئے کا ایک کرہ روشن نظر آیا۔ کرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھلی تھیں۔ روشن کرے کی طرف قدم اٹھاتے وقت معظم علی کی انگلیں ٹکڑا رہی تھیں۔ یہ وہ گھر تھا جہاں ہر وقت مرست کے قبضے اس کا استقبال کیا کرتے تھے۔ بجلی چمکی

اور اسے بالائی منزل قبرستان سے زیادہ آواز اور سنان دکھائی دی۔ اس نے نوکر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں ایک کر رہ گئی۔ پردہ سنی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور برآمدے سے گزرنے کے بعد کمرے کے کمرے میں داخل ہوا۔ چند تانے وہ بے حس و حرکت کمرے کے درمیان کھڑا ہوا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا رنگ پیچہ زرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ عورت جس کی صحت پر ٹپوس کی جوان لڑکیاں رشک کرتی تھیں، اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک سن رسیدہ عورت اس کے بستر کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی وہ معظم علی کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

”معظم! میا تھا لکھڑا چک رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سسکیوں اور سسکیوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ معظم علی! امی جان! امی جان! کتا ہوا آگے بڑھا۔ ماں نے ہاتھ پھیلا دیئے اور اس نے بستر کے قریب دوڑا نوکر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ آہستہ معظم علی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلتے جبین ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے کہا: میرے بیٹے! میرے دل تم اس طوفان میں آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم مزداد آگے۔ میں صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تمہارے ابا جان کو بھی تمہارا انتظار تھا لیکن تم د آگے اور صفت ہم میں سے کسی کا بھی انتظار نہ کر سکا۔“

معظم نے چند سسکیاں لیں اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگایا۔ معظم نے گردن اٹھائی اور اپنا دوسرا ہاتھ ماں کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا: امی جان آپ کو بگا رہے۔ میں طیب کو بلاتا ہوں۔ صابر کہاں ہے؟

ماں نے کہا: صابر ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ کچھ دنوں سے نہیں سہا اور طیب کٹنے

کا بننا بہت تیز ہے۔ میں حکیم کو بلاتا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔“ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے سامنے بیٹھے رہو۔“  
”تو میں صابر کو بھیجتا ہوں۔“

”حکیم دوا دے کر گیا ہے بیٹا اب وہ اور کیا کرے گا۔ تم میری بات تو سن لو۔ اصل میں کھلی کے دائیں سرے پر آخری کھونٹے کے بالکل ساتھ تمہاری امانت دہن ہے۔ وہ نکال لینا۔ وہ تمہارے کام آنے والی چیز ہے۔ میں آج صابر کو بتانے کا ارادہ کر رہی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم آگئے۔ جب وہ تماشائی لینے آئے تھے تو میں ڈرتی تھی لیکن تمہارے ابا جان کا خیال صبح تھا۔ اگر میں اسے مکان کے اندر چھپانے کی کوشش کرتی تو وہ ضرور تاش کر لیتے۔ انہوں نے ایک ایک کونے کی تلاشی لی تھی۔ شاید انہیں شک تھا کہ سراج الدولہ تمہارے آبا کو کئی چیز دے گیا ہے۔ ظالم تمہاری کتلیں تمہارے گئے ہیں مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن حکیم احمد خان نے کہا یہ مر رہی ہے اسے تنگ نہ کرو۔ میرے جھگڑا بیٹا، میرن ان کے ساتھ تھا۔ وہ حسین بیگ کے گھر بھی گئے تھے۔ وہ بستر پر چڑھا تھا۔ فرحت کی ماں نے میرن کو برا بھلا کہا اور اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ فرحت آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔“

معظم علی غصے کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ کے انگادوں کی طرح سرخ تھیں۔

ماں نے کہا۔ ”بیٹا اب اس ملک میں عورت اور شرافت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مرشد آباد پر خدا کا ترنازل ہو چکا ہے۔ حسین بیگ کو علی دودی خاں کے در پر سلام کرتے تھے افضل اور آصف، سراج الدولہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آج میرے جیسے ذلیل انسان کے ہاتھوں ان کی ماں اور بہن کی عورت محفوظ نہیں۔“

معظم علی کے کانپتے ہوئے بونٹوں سے کرب ایڑا آواز نکلی۔ ”امی جان میں اس سے

کی ضرورت نہیں۔ حکیم احمد خان ہر روز یہاں آتے ہیں۔ آج شام کے وقت بھی مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ معتم میرے ساتھ دودھ کو دہکاتے ہیں۔ وہ برسوں ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تھے۔ تمہارے آبا اور دوست کی بندوبست اور نواریں لے گئے ہیں۔ پڑوسی اب ہمارے گھر کے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اگر وہ حمیدہ کو یہاں بھیجتیں تو میں شاید اب تک تمہارا منتظار نہ کر سکتی۔ صابر کے سوا ہمارے سب لوگ غور و خوض ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ میری طرح حسین بیگ بھی بستر پر پڑا ہوا ہے لیکن فرحت صبح شام مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہتی ہے۔ بیٹا! ہماری طرح ان کا گھر بھی بڑبڑ چکا ہے۔“

”امی جان میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ عبداللہ خاں مجھے راستے میں ملا تھا۔“  
ماں نے کہا۔ ”یوسف اور فضل پلاسی کے میدان میں دفن ہیں۔ کاش میں موت سے پہلے وہاں جاسکتی۔ حسین بیگ وہاں جانا چاہتا تھا لیکن اسے حکم ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔ میرے جھگڑنے اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی ہے۔ وہ یہاں سے ہجرت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ۔“

”امی جان جب آپ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھہریں گے۔“

ماں نے عمر رسیدہ عورت کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”حمیدہ تم نے مجھے دواؤں سے آرام نہیں کیا ہے۔ جاؤ ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ۔“

حمیدہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن باہر جھانکنے کے بعد مڑ کر بولی۔ ”بارش تمہیں ملے گی۔ میں گھر جاتی ہوں۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لیں۔“

حمیدہ کمرے سے نکل گئی اور معظم کی ماں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ ”بیٹا اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ مجھ سے بہت کچھ کہنا ہے۔“

معظم کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ماں کی بنس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”امی جان آپ

خواب سرا رک گیا اور اس نے مجھے ایک چھٹی سی تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا: یہ خواب صاحب نے بھیجی ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ تھیلی میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ تمہارے آبا جان راستے میں بیہوش ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ہوش آیا تو انھوں نے اصرار کیا کہ میں وہ تھیلی جس میں بیش قیمت میرے تھے پسے پاس رکھنے کی بجائے اسٹبل میں دفن کر دوں گا۔ اس وقت میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے وہ تھیلی تمہاری کتابوں کی الماری میں رکھ دی۔ آدھی رات کے قریب وہ چل بسے۔ آخری وقت وہ مجھے بار بار یہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً ہجرت کر جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ تم یہاں رہ کر کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ صبح کے وقت حکیم احمد خاں، مرزا حسین بیگ اور پڑوس کے چند غریب لوگوں کے سوا ان کے جنازے میں کوئی نہ تھا۔ حسین بیگ کی طبیعت بہت خراب تھی، حکیم احمد خان نے انھیں روکا لیکن وہ جنازے میں شامل ہونے پر بضد تھے۔ اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ ان کے گھر کی تماشائی لی گئی ہے اور میں نے تمہارے لیے ان سیروں کی حفاظت کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ رات کے وقت میں نے انھیں دفن کر دیا۔ ان کے ساتھ میرے زیورات بھی دفن ہیں۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ اگر تم زائے تو میں صابر کو بتا دوں گی لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ میرے دل سے ایک بوجھ اتر چکا ہے۔ جب تم کھری کے بائیں سرے پر آخری کھونٹے کے ساتھ زمین کھود گے تو تمہیں ایک صندوقچی ملے گی۔ صندوقچی کے اندر ایک چڑے کی تھیلی ہے جس میں وہ میرے اور میرے زیورات ہیں۔“

معظم خاموش تھا۔ اسے جواہرات اور اثروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تصور میں کبھی اپنے بھائی کو میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرتا اور کبھی باپ کو نزع کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ افضل کے متعلق سوچتا اور زندگی کی ہر شے اسے بے حقیقت اور بے معنی نظر آنے لگتی۔

نیا دہ نہیں سن سکتا۔ میں سن سے ان تمام مظالم کا بدلہ لوں گا۔  
ہمیں معظم تم میرے ساتھ دعوہ کر دو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ تمہارے باپ کو تے وقت بھی خوف تھا کہ تم جوش میں آ کر اپنی جان پر کھیل جاؤ گے اور پھر دنیا میں ہمارا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میرے بعد یہیں سے کہیں دور چلے جانا اور وہ امانت مفرد نکال لینا، تمہارے کام آئے گی اور شاید تم اس سے حسین بیگ کی بھی مدد کر سکو۔ وہ میرے بہت قیمتی ہیں اور میں نے اپنے زیور اور چند اثروں بھی ان کے ساتھ دفن کر دی ہیں لیکن کسی کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے!!

معظم علی نے پوچھا: وہ میرے کہاں سے آئے؟

بیٹا تمہارے آبا جان زخمی ہو کر سراج الدولہ کے ساتھ مرشد آباد پہنچے تھے۔ محل کے ایک پیر میار نے مجھے اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچا، ان کی حالت بہت خراب تھی۔ سراج الدولہ اور شاہی طبیب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ زخم بہت خطرناک ہیں اور اس حالت میں سفر کی وجہ سے ان کا بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ سراج الدولہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہتا تھا کہ میں نے انھیں منع کیا تھا لیکن کسی حالت میں بھی میرا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یوسف کی لاش کو بھی سپرد خاک ہر نہ کبھی۔ یکے میں شام تک وہیں رہی لیکن ان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ رات کے وقت جب سراج الدولہ نے مرشد آباد چھوڑنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے پیر میار کو حکم دیا کہ انھیں گھر پہنچا دیا جائے اور جب وہ ان کی چارپائی اٹھانے لگے تو سراج الدولہ کی ماں نے اپنا ہار ان کے سر سے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکا کر دیا۔ اس نے کہا: میری بہن یہ انعام نہیں خراج ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے تمام خزانے بھی محمد علی خاں کی وفاداری کا صلہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں نے اس کا حق قبول نہ کیا۔ جب ہم محل سے نکلے تو خواب سرا ہمارے ساتھ تھا۔ سپاہی تمہارے آبا جان کو گھر چھوڑ کر چلے گئے لیکن



ماں نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "میرے لئے میرے بیٹے کو دشمن سے بچانا۔ اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں۔" آہستہ آہستہ معظم کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔

"امی جان! امی جان!" معظم علی نے گھبرا کر کہا۔

ماں نے آنکھیں کھولیں اور مکملی بازو کمر معظم علی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر پڑ گئیں۔

"امی جان! معظم علی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

ماں کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ پھر اس نے ایک کپکپی کے بعد دو تین گہرے سانس لیے اور اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو تکیے پر گر پڑے۔

"امی! امی! معظم علی اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکی تھی۔

معظم علی دیر تک سکے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اب تک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ "یہ نہیں ہو سکتا یہ ایک خواب ہے۔" امی! امی! وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی بنیٹیں ٹٹول رہا تھا۔ اسے گہری نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔



پچھلے پیر چراغ نہما رہا تھا لیکن اس نے اٹھ کر تیل ڈالنے یا نوکر کو آواز دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کے دل میں کسی کو دیکھنے یا کسی کے ساتھ بات کرنے کی خواہش نہ تھی۔ ماضی اور حال کے واقعات کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھیں

ماں نے کہا۔ "بیٹا تمہاری غیر حاضری میں فرحت تمہارے متعلق پوچھا کرتی تھی۔ وہ کتنی شوخ تھی لیکن اب اس کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ حسین بیگ کی بیماری کے باوجود ہر روز میرے پاس آتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے بھی میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اس نے حمیدہ کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔ میں سمجھا کرتی تھی کہ وہ مغزور ہیں لیکن انھوں نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ کاش تم اس احسان کا بدلہ دے سکو۔ بیٹا مجھے اپنے باپ کے پاس دفن کرنا!"

معظم نے کہا۔ "نہیں امی جان آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ماں مسکرائی، لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے آنسوؤں اور آہوں سے زیادہ کرب انگیز تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "بیٹا یوسف جیسے بیٹے کی موت کے بعد کوئی ماں اور تمہارے آبا جیسے شہر کی موت کے بعد کوئی بیوی زندہ نہیں رہ سکتی۔ بیٹا پرکھو، تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟ تم تو یہاں سے بہت دور تھے۔ میرے جعفر کو تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے!"

معظم علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "امی جان مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

ماں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر معظم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "بیٹا میں خدا سے دعا کرتی تھی کہ موت سے پہلے صرف ایک لمحے کے لیے تمہیں دیکھ لوں۔ پھر میں خوشی سے جان دے دوں گی۔ لیکن اب تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ مجھے یقین نہیں ہو جاتا ہے کہ تمہیں ان دردوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ بیٹا اگر تمہیں کوئی خطرہ ہے تو خدا کے لیے میان نہ ٹھہرو!"

معظم علی نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "امی جان میری رگن میں میرے غور باپ کا خون ہے۔ اگر مرشد آباد بیٹریوں سے بھر جائے تو بھی میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"



زیادہ خراب ہو تو میں اطلاع دینا۔ میں نے صابر سے بھی کہا تھا۔  
معظم علی نے جواب دیا۔ ”وہ رات کے وقت اپنے گھر چلی گئی تھی اسے امی جان  
نے بھیجا تھا۔“

”آپ کب آئے تھے؟“  
”میں آدھی رات کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت امی جان کی حالت یاز  
تشویش ناک نہیں تھی۔ وہ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہیں لیکن پھر لپٹا ہوا مجھے  
اب بھی ان کی موت کا یقین نہیں آتا لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔ چند دنوں کے  
اندرازدہ رکتی ناقابل یقین باتیں ہو چکی ہیں۔ یوسف اور افضل کی موت پر کسے یقین آسکتا  
ہے۔ فرحت کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ افضل اور یوسف مجھے کتنے عزیز تھے اور ان کی  
موت کے میرے لیے کیا معنی ہیں؟“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تمہارے ابا جان اب کیسے ہیں؟“

”شام کے وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن آدھی رات کے قریب خیر  
نیز آگئی تھی اور اب ان کی حالت کچھ بہتر ہے۔ نماز کے وقت مجھے امی جان نے کہا تھا  
کہ میں چچی جان کا پتہ کروں۔ اب میں جاتی ہوں۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔“  
معظم علی نے کہا۔ ”فرحت امی جان تمہاری بہت احسان مند تھیں اور میں بھی  
میشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔“

”لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا لال رہے کہ میں آخری وقت ان کے پاس نہ  
تھی۔“ یہ کہہ کر فرحت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن  
دہیز سے باہر پاؤں رکھتے ہوئے وہ رکی اور مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
”ابا جان کہتے تھے کہ آپ کا یہاں آنا خطرناک ہے۔ وہ ہر اچھے آدمی کو گرفتار کر

وہ نیم خوابی کی حالت میں اپنے والدین، اپنے بھائی اور اپنے دوستوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھی  
وہ مکتب کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا اور کبھی فوج کے جوائن کے ساتھ فوج  
سپرٹری کی مشق کر رہا تھا۔ پھر جب وہ مانی کے سپنوں کی دنیا سے نکل کر حال کی تعین کا سامنا  
کرنا تو اس کا دل نفرت اور حسرت سے بھر جاتا۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور وہ نیم خوابی  
کی حالت میں آنکھیں بند کیے کبھی دلکش اور کبھی بھیاںک پسینے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے  
سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے کانوں میں ہلکی سی سیکیوں کی آواز آنے  
لی تاہم وہ برستور آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ہاتھ کی انگلیاں اس کی پیشانی  
کو چھونے لگیں۔ پھر کسی نے خفیف اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”معظم! معظم!“  
معظم نے مڑ کر دیکھا اور اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکی گھبرا کر  
ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”کون! فرحت؟“

فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے جواب دینے کی بجائے سر  
جھکا دیا۔

معظم علی نے کہا۔ ”امی جان اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔“

فرحت نے اپنی اور معنی کے ساتھ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ میں  
انہیں دیکھ چکی ہوں۔ میں کافی دیر سے یہاں کھڑی تھی۔ آپ شاید سو رہے تھے۔ میں ڈر گئی  
تھی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور اسے اس نظم، محراور ریا کی تائید دینا  
ایک روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر  
کہا۔ ”فرحت میں بہت سخت جان ہوں۔“

فرحت نے کہا۔ ”حمید کہاں گئی؟“ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ اگر ان کی طبیعت

رہے ہیں۔

معظم علی نے کہا: ”آپ فکر کریں۔ اب میرے لیے کوئی بات خطرناک نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن آپ کو احتیاط ضرور کرنی چاہیئے!“

”مجھے یقین ہے کہ افضل کی بہن مجھے خطرے سے بھاگنے کا مشورہ نہیں دے گی۔“

”نہیں، میں آپ کو بیڑیوں کا مقابلہ کرنے سے منع نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں

کہ آپ ان کے نزعے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔“

”اب سارا جنگل بیڑیوں کے نزعے میں اچکا ہے۔“

فرحت کچھ اور کسے بغیر باہر نکل گئی۔

ایک ستارہ جسے اس نے ہمیشہ آسمان کی بلندیوں پر دیکھا تھا اس کے ظلمت کدہ

میں نور کی کرنیں بکھیرنے کے بعد روپوش ہو چکا تھا۔ معظم علی کچھ دیر دروازے میں کھڑا صحن

کی طرف دیکھتا رہا۔ فرحت، مرزا حسین بیگ کی بیٹی، آصف اور افضل کی بہن اس کے گھر

آئی تھیں۔ وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کر چکا تھا۔ لیکن سادہ حیات کے وہ تہا

جو کسی اس کے تصور سے لرز اٹھتے تھے۔ اب خاموش تھے۔ آرزوؤں، انگوں اور دلوں کا

وہ منہ کدہ جسے اس نے فرحت کی خیالی تصویروں سے آباد کیا تھا ویران ہو چکا تھا۔



برآمدے کے دوسرے کونے میں صابر اپنے بستر پر گہری غنیمت سو رہا تھا۔ معظم علی

نے آگے بڑھ کر اسے جگایا۔ صابر بدحواسی کی حالت میں اٹھا اور بے اختیار معظم علی سے

پوچھ گیا: ”بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی اس کی

سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور پھر جب اس نے سنبھل کر اپنی تباہی کی داستان

سنانے کی کوشش کی تو معظم علی نے کہا:

”صابر مجھے سب معلوم ہے۔“

صابر نے کہا: ”آپ کی امی جان بیمار ہیں۔ چلیے وہ اس کمرے میں ہیں۔“

معظم علی نے کہا: ”وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔“

صابر چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا معظم علی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بھاگتا

ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں اور معظم علی دیوان خانے کے

برآمدے میں محلے کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حسین بیگ لاشی بیٹھا ہوا مکان

کے اندر داخل ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا اور کمزوری کے باعث اس کی ٹانگیں

لوٹھڑا رہی تھیں۔ افضل اور فرحت کے باپ کی یہ حالت معظم علی کے لیے ناقابل برداشت

تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر آگے بڑھا اور حسین بیگ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے

لگا لیا۔

معظم علی نے کہا: ”چچا جان آپ کو بخار ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیئے تھا!“

حسین بیگ نے جواب دیا: ”بیٹا! اب مجھے قبر میں ہی آرام مل سکتا ہے۔ حسین بیگ

کچھ دیر برآمدے کے فرش پر معظم علی کے پاس بیٹھا رہا لیکن محلے کے لوگوں نے اسے مجبور

کر کے کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد جب معظم علی کی والدہ کا جنازہ اٹھایا جانا

تھا حسین بیگ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن معظم علی نے کہا: ”چچا جان! اس حالت میں

آپ کو جنازے کے ساتھ نہیں جانا چاہیئے۔ آپ گھر جا کر آرام کریں۔“

محلے کے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر حسین بیگ کو سہارا دیا اور وہ بادل نخواستہ اپنے

اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اپنی والدہ کو سپرد خاک کرنے کے بعد معظم علی اپنے گھر جانے کی بجائے مرزا حسین بیگ

کی حویلی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ غنیمت منزل کے ایک کمرے میں لیٹے ہوئے تھے،

فرحت اور اس کی والدہ ان کے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے معظم علی

کی آمد کی اطلاع دی۔ فرحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا تو فرحت کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معظم علی، حسین بیگ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا: "معظم علی! ہمیں ایک دوسرے کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم پر کیا گزری ہے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تم توجہ نہ دو اور تمہاری ہمت ہمارا آخری سہارا ہے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تھلا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے کئی دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں تمہارے گھر کھانا بھیج رہا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہیں بیٹھ کر کچھ کھاؤ۔"

"چچا جان مجھے جھوک نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر چند نوالے کھاؤ۔" پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ "عابدہ! خادمہ سے کو ان کے لیے کھانا لے آئے۔"

"میں خود لاتی ہوں۔" حسین بیگ کی بیوی یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے کھانا لا کر معظم علی کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ معظم علی نے حسین بیگ کے دوبارہ اصرار کرنے پر بادل ناخواستہ ایک نذر اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا کہ چانک ایک نوکر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "میر میرن آیا ہے اور اس کے ساتھ مسلح سپاہی ہیں۔"

میر میرن، میر جعفر کا بیٹا تھا اور مرزا حسین بیگ اور معظم علی کے لیے اس کی آمد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مرزا حسین بیگ بستر سے اٹھا اور اپنی لاشی پکڑ کر دھڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ معظم علی نے جلدی سے اٹھ کر ایک بازو پکڑ لیا۔ وہ دلیا خانے کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ نیچے صحن میں میر میرن بیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ دکھائی دیا۔ میر میرن اپنی عمر کے لحاظ سے کافی موٹا تھا۔ اس کے چہرے سے غرور، عیاری، بے حیائی اور سفاکی

مترشح تھی۔ وہ مرزا حسین بیگ اور معظم علی کو دیکھ کر آگے بڑھا اور برآمدے کی میز صوفیوں کے قریب پہنچ کر بولا: "تمہارا نام معظم علی ہے؟"

معظم علی کی خاموشی پر مرزا حسین بیگ نے جواب دیا: "ہاں ان کا نام معظم علی ہے۔ میر میرن نے حکایت سے حسین بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بوڑھے تم خاموش رہو!"

معظم علی نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر انگارہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا: "تم کیا چاہتے ہو؟"

میر میرن نے آگ بگولا ہو کر کہا: "بدقیض ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم مرشد آباد کیوں آئے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "مرشد آباد میرا گھر ہے۔"

میر میرن نے بوجھا: "کیا میدان پور کے فوجدار نے تمہیں دہاں حاضر ہونے کا حکم نہیں بھیجا تھا؟"

میدان پور کے فوجدار نے مجھے دہاں بلایا تھا لیکن اس نے مجھے پلاسی کی جنگ کے حالات نہیں بتائے تھے۔"

"اور اب تمہیں پلاسی کی جنگ کے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔"

"ہاں۔"

میر میرن نے کہا: "ہم تم سے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں۔"

"وفاداری کا حلف! میرے جعفر کے لیے؟" معظم علی نے تن کر کہا۔

میر میرن نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: "یہ وقت تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم کسی اور کے

لئے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "وفاداری کا حلف سنگینوں کے پہرے میں نہیں لیا جاتا۔ میں



نے دونوں ہاتھوں سے کوڑے کا ایک سرا پھڑایا۔ دو سپاہیوں نے فرحت کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ان کی گرفت میں بے بس ہو کر چلا رہی تھی۔ تم کہتے ہو، تم بزدل ہو! ایک آدمی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شیر بن گئے ہو۔

میر میرن نے پے در پے معظم علی کو چند اور کوڑے لگائے اور جب اس نے بیہوش ہو کر گر گئی تو اس نے سپاہیوں سے کہا: اسے قید خانے لے چلو۔ پھر وہ آگے بڑھ کر حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ تم بوڑھے ہو اور آماجہان نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم پر سختی نہ کی جائے لیکن اب ہمارے دشمنوں کے لیے بنگال میں کوئی جگہ نہیں میں تمہیں سکم دیتا ہوں کہ تم ایک ہفتہ کے اندر اندر بنگال کی حدود سے نکل جاؤ۔

معظم علی کو ہوش آیا تو وہ ایک تنگ داریک کو ٹھہری میں پڑا ہوا تھا۔ دوسل سپاہی اس کے سر پر کھڑے تھے اور ایک تھیلہ پانی کی باٹی سے پرا میگو میگو کر اس کے زخموں پر ڈال رہا تھا۔ معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پانی مانگا۔ ایک سپاہی نے کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کے گھرے سے پانی کا ایک پیالہ بھر کر اسے دیا۔ معظم علی نے پانی پینے کے بعد سپاہیوں کی طرف دیکھا اور سوال کیا: میں کہاں ہوں؟ ایک سپاہی نے جواب دیا: تم مرشد آباد کے قید خانے میں ہو۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی جا چکے تھے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی کرب کی حالت میں منہ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔

قید و بند کی صعوبتیں اس کے لیے نئی نہ تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی قیدہ چکا تھا لیکن اس کا المناک پہلو یہ تھا کہ اسے اس سلطنت کا باہمی قرار دیا جا چکا تھا جس کی آزادی کے لیے اس کا باپ اس کا بھائی اور اس کے دوست شہید ہو چکے تھے آٹھ

یہ لمنے سے انکار کرتا ہوں کہ میر جعفر بنگال کا علماں ہے:

”سپاہیو!“ میر میرن پوری قوت سے چلایا: تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اسے گرفتار کرو!“  
”شہر! حسین بیگ نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دو تین قدم آگے بڑھ کر میر میرن سے مخاطب ہوا۔“ میر میرن خدا سے ڈرو۔ معظم علی کا باپ اور بھائی اپنے خون سے تمہارے باپ کی غداری کی قیمت ادا کر چکے ہیں۔“

میر میرن نے انتہائی غضب کی حالت میں آگے بڑھ کر حسین بیگ کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ برآمدے کی میز چیموں پر گر پڑا۔

ان کی ان میں معظم علی نے یکے بعد دیگرے میر میرن کے منہ پر دو گھونے رسید کیے میر میرن تورا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔

سپاہیوں نے تواریں سونت لیں لیکن میر میرن چلایا۔ خبردار! میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔“

چند سپاہی تواریں پھینک کر معظم علی پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میر میرن کے حکم سے معظم علی کو صحن کے ایک درخت کے ساتھ بانڈھ دیا گیا۔ میر میرن نے اس کی قبضہ نوچ کر پھینک دی اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا لے کر کہا: تمہارے مجھے باغیوں کی سزا موت نہیں۔ تمہاری مزایا ہے! کہو اب دفا داری کا حلف اٹھاتے ہو یا نہیں؟“

جب معظم علی پر کوڑے برساتے جا رہے تھے تو مرزا حسین بیگ نے اٹھ کر مداخلت کی کوشش کی۔ لیکن ایک سپاہی نے اپنی توار کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اچانک فرحت کمرے سے نکلی اور بھاگ کر معظم علی اور میر میرن کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ میر میرن نے کوڑا اٹھ کر کہا تو وہ آگے بڑھ کر معظم علی کے لیے ڈھال بن گئی۔ میر میرن نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی تو اس

چکا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سامنے میز سے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھنے کے بعد کہا۔ "معظم علی تمہارے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ تم میدانِ پور کے فوجدار کا حکم ملنے پر دوہاں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد آ گئے تھے۔ تمہارے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا اور تمہارے خلاف تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے گرفتاری کے وقت میر میرن پر حملہ کیا تھا۔ یہ تینوں الزامات بے حد سنگین ہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے پہلے اپنے دائیں بائیں اور پچھے ان پیریلوں کی طرف دیکھا جو بیچ تواریں لیے کھڑے تھے اور پھر کرسی عدالت کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس عدالت میں آپ مجھ سے زیادہ بے گیس ہیں۔ اس لیے میں صفائی پیش کر کے آپ کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ مجھے سرحدی قلعے سے میدانِ پور روانہ ہوتے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے جس حکومت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ختم ہو چکی ہے اور اب میدانِ پور کا فوجدار یا تو مرشد آباد کے حالات سے بے خبر ہے یا وہ ایک ایسی حکومت کا نمائندہ ہے جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد مرشد آباد میں ایسے لوگ مجھ سے وفاداری کا حلف لینا چاہتے تھے جن کے ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ مجھ پر تیسرا الزام یہ ہے کہ میں نے میر میرن پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میر میرن میرے نزدیک بنگال کے جائز حکمران کا بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا بد زبان اور بد اخلاق آدمی تھا جس نے میری قوم کے ایک ایسے بزرگ پر ہاتھ اٹھایا تھا جس کے نوجوان بیٹے بنگال کی آزادی کے لیے اپنا خون پیش کر چکے ہیں۔ میرا اصلی جرم یہ ہے کہ میں نے بنگال میں جہم لیا اور پھر ایک سپاہی کی حیثیت میں اس قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا، جس کے امراء سے چند محمول میں فروخت کرنے کے لیے تیار تھے۔"

دن بعد اس کی کوٹھڑی میں تین اور قیدی دھکیل دیئے گئے۔ یہ تینوں بنگال کی فوج کے بڑے بڑے افسر تھے اور ان کی زبانی معظم علی نے ان سے حسین بیگ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی گرفتاری کے دوسرے روز مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے اور حکومت نے ان کی جائز ضبط کر لی ہے۔ ایک افسر نے معظم علی کو بتایا کہ ان کے ساتھ تیس اور آدمی گرفتار ہوئے ہیں اور ابھی مزید گرفتاریوں کی توقع ہے گذشتہ چند دنوں میں مرشد آباد کا قید خانہ بھر چکا ہے اور اب قیدیوں کو دوسرے شہروں میں بھیجنے کی تجویز پر غور ہو رہا ہے۔ قید ہونے والوں میں صرف حکومت کے باغی ہی نہیں بلکہ وہ متمول لوگ بھی ہیں جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ میر جعفر کو بڑی بڑی رقعات پیش نہیں کر سکے۔ میر جعفر اپنے انگریز سرپرستوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں مرشد آباد کا خزانہ ان کے حوالے کر چکا ہے اور اب لارڈ کلاؤ کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لیے اس نے بنگال کے امراء کو بے تحاشا نوٹا فروغ کر دیا ہے۔ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔

معظم علی کو مرشد آباد کے قید خانے میں اڑھائی بجے گزر گئے۔ ایک دن قید خانے کا دروازہ چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "معظم علی آج تمہارا مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔"

معظم علی تنگی تو اردوں کے پہرے میں اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا اور دار و لقمہ کے ساتھ چل دیا۔

کوٹھڑی دیر بعد وہ قید خانے کے ایک کسادہ کمرے میں کھڑا تھا اور اس کے سامنے عدالت کی کرسی پر میر جعفر کے خاندان کا ایک فوجی افسر میر ناصر رونق افروز تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار اور فوجی افسر بیٹھے تھے۔ میر ناصر، اڑیسہ کی بعض زبانوں میں معظم علی کے ساتھ وہ

## دسواں باب

ایک رات اچانک معظم علی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، اندر بھاگتے ہوئے کہا: "آپ باہر آئیں!"

معظم علی باہر نکلا تو چار مسلح سپاہیوں کے علاوہ قید خانے کا داروغہ اور میر ناصر دلاڑ کے سامنے کھڑے تھے۔ میر ناصر نے کہا: "معظم علی میں تمہیں کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہوں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے تو تمہیں بیڑیاں پہننے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

معظم علی نے سوال کیا: "آپ کو میرے وعدے پر اعتبار آجائے گا؟"

"ہاں" میر ناصر نے جواب دیا۔

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

معظم علی نے داروغہ کی طرف دیکھا اور کہا: "میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بے بس ہیں۔ لیکن اگر قید خانے سے باہر میری نظر انتظار کر رہا ہے تو آپ کو کسی جھگ کے بغیر یہ بات کہہ دینی چاہیے۔"

داروغہ کی بجائے ناصر نے کہا: "میں آپ کو صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نیک ارادے سے یہاں آیا ہوں۔"

میر ناصر نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی سے بہت تنگ آپکے ہو۔ یہ جگہ ایسی قیدیوں کے لیے مزدوں نہیں تم اپنی صفائی میں کچھ کرنا چاہتے تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں ایک ایسی عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا انسانیت کی توہین سمجھتا ہوں جو مجھ سے زیادہ بے بس ہے۔ میر جعفر کو اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ میں آپ کی زبان سے اپنے متعلق ان کا حکم سننے کے لیے تیار ہوں۔"

میر ناصر کچھ دیر گردن جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر چند سطور لکھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تمہارے جرائم نہایت سنگین ہیں لیکن تمہارا خاندان کی عمدہ شہزادہ کے پیش نظر تم کو سات سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

لم علی نے ایک کرب اگیز مسکراہٹ کے ساتھ میر ناصر کی طرف دیکھا اور میر ناصر نے اپنی گردن جھکا لی۔

معظم علی نے شرک قید خانے کے داروغہ کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ داروغہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے منہ پھیرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا: "اے اے لے چلا!"

رات کے وقت جب قید خانے کی کوٹھڑی میں معظم علی کے ساتھی گہری نیند سو رہے تھے وہ سر سوجن کر اُمتانی اکسار کے ساتھ یہ دعا مانگ رہا تھا: "میرے مولیٰ مجھے ہمت دے کہ میں اس آزمائش میں پورا اتر سکوں۔"

اٹھ بیٹنے اور گند گئے۔ اس عرصہ میں معظم علی کے ساتھی کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے اور ہر وقت وہ قید خانے سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔

ہوئے۔ دیوان خانے کے قریب ایک روشن کمرے کے سامنے پہنچ کر سپاہی رک گئے اور میرزا ناصر اور معظم علی کمرے میں داخل ہوئے۔ میر قاسم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرزا ناصر نے کہا۔ "یہ معظم علی ہے!"

میر قاسم نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بیٹھے جاؤ!"

معظم علی کو کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک قیدی کا بوسیدہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ میر قاسم کچھ دیر بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالاخر اس نے کہا: "معظم علی میں تمہارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور میں نے قید خانہ کے دارمذ کو بہتیت کی سچی کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے مجھے انسوس ہے کہ جو لوگ سونے میں تولے جانے کے قابل تھے وہ قید خانے میں سڑ رہے ہیں۔ بنگال کو مزید بتا ہی سے بچانے کی اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اسے میر جعفر کی حکومت سے نجات دلانی جائے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس تباہی کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن ہم غلط فہمی اور غلط اندیشی میں مبتلا تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ میر جعفر حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے بعد ایک اچھا حکمران ثابت ہوگا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی حکومت بنگال کے لیے ایک لعنت ہے۔ وہ ایک کولہو ہے جس سے انگریز بنگال کے عوام کا خون پخوڑنے کا کام لے رہے ہیں۔ اس نے بنگال کے بہترین اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔ بنگال کے امر اور کوڑی کوڑی کے محتاج جو کہ میاں سے ہجرت کر رہے ہیں۔ میں نے فوج کے محب وطن فوجیوں سے بات چیت کی ہے۔ وہ میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور میرے ساتھ تعاون کے لیے ان کی پہلی شرط یہ ہے کہ میں تم جیسے لوگوں کو قید سے راکڑ کرنے کی کوشش کروں۔"

معظم علی نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا: "میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پہلے آپ کو انگریز کے ساتھ لڑنا پڑے گا اور انگریز کے ساتھ لڑنے کے لیے فوج کے

معظم علی نے کہا: "موجودہ حالات میں اگر اس ملک میں نیکی کا تصور باقی رہ گیا ہے تو یہ ایک معجزہ ہے۔ بہر حال میں اس بخوبی کی حالت میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ چلیے!"

معظم علی، میرزا ناصر کے ساتھ قید خانے کے پچھلے کمرے سے باہر نکلا تو دو سپاہی ہتھیار اٹھائے سامنے کھڑے تھے اس نے جواب طلب نگاہوں سے میرزا ناصر کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا: "آپ گھبراہٹ نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے دعوے پر اطمینان ہے لیکن اگر آپ غلطی کر نہیں تو آپ کی جگہ میں میر جعفر کی قید کا مظہر مول لیتے کے لیے تیار نہیں یہ آدمی ہمارا پیچھے آئیں گے اور آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں بہترین نشانہ باز ہیں۔"

معظم علی نے میرزا ناصر کے ساتھ چلنے کے بعد اچانک سوال کیا: "میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ انہیں یہاں سے کتنی دور نشانہ بازی کا حکم دیا جائے گا؟"

میرزا ناصر نے جواب دیا: "معظم علی گھبراؤ نہیں۔ تمہیں میر قاسم نے بتایا ہے۔"

میر قاسم کون، میر جعفر کا داماد؟

ہاں۔ میں اکثر ان سے تمہارا ذکر کیا کرتا تھا۔ آج انہوں نے تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر تم عقلندی کا ثبوت دو تو مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے نتائج تمہارے حق میں برے نہیں ہوں گے۔"

معظم علی نے کہا: "اگر میر قاسم یہ سمجھتا ہے کہ قید میں رہ کر میر جعفر کی حکومت کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں تو اسے ایسی ہی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے یہیں سے واپس لے جائیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ میر قاسم کو تمہارے استقلال نے متاثر کیا ہو اور بنگال اور میر جعفر کے متعلق

اب اس کے خیالات بھی وہی ہوں جو تمہارے ہیں۔"

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد معظم علی اور میرزا ناصر قاسم کے عالی شان مکان میں داخل

میر قاسم نے مایوس ہو کر کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تمام عمر قید خانہ میں رہنا پسند کرتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں چھوٹے قید خانے سے نکل کر بڑے قید خانے میں نہیں آنا چاہتا۔"

میر قاسم نے کچھ سوچ کر کہا: "رض کر اگر میں اپنی ذمہ داری پر تھیں قید سے آزاد کروں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں موت ملتے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اب مجھے بنگال کی آب و ہوا اس نہیں آئے گی۔"

میر قاسم نے کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر کمرے میں بیٹھنے کے بعد کہا: "اگر اب تمہیں واپس قید خانے میں بھیج دیا جائے تو کیا میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں کسی اور پر ظاہر نہیں ہوں گی؟"

"ہاں! اور اگر آپ واقعی میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں تو قید خانے میں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی پھر جس دن مجھے یہ معلوم ہوگا کہ آپ انگریزوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے قید سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔"

میر قاسم نے سوال کیا: "اگر تمہیں اس وقت آزاد کر دیا جائے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں بنگال میں نہیں رہوں گا۔"

"جاؤ تم آزاد ہو!"

معظم علی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اور وہ مسرت اور استعجاب کے طے بے جذبات کے ساتھ میر قاسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میر قاسم نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا: "میری طرف کیلکھی ہے"

چند افراد کا تعاون کافی نہیں۔ اس کے لیے عوام کو بیدار اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔"

میر قاسم مسکرایا: "موجودہ حالات میں انگریز کے ساتھ لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لارڈ کلاؤ خود میر جعفر سے تنگ آچکا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "اور اب وہ میر جعفر کی جگہ آپ کو گدڑی پر بٹھانا چاہتا ہے؟"

میر قاسم نے جواب دیا: "میں تمہیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر ہم میر جعفر کو گدڑی سے اتارنے کے لیے تیار ہو جائیں اور لارڈ کلاؤ کو یہ احساس دلا سکیں کہ اُمّار، سپاہی اور عوام ہمکے ساتھ ہیں تو وہ میر جعفر کا ساتھ دینا پسند کرے گا۔"

معظم علی نے کہا: "تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو میر جعفر کی نسبت زیادہ کار آمد سمجھتا ہے؟"

میر قاسم نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تم ایک ذہین آدمی ہو تم جانتے ہو کہ موجودہ حالات میں ہم اس قابل نہیں کہ انگریز کے ساتھ ٹکرائے سکیں لیکن میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ اگر مجھے حکومت کا موقع ملا اور تمہارے جیسے لوگوں نے میرا ساتھ دیا تو میں بہت جلد ایک ایسی طاقت منظم کر سکوں گا جو اس ملک کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر سکے۔"

"معظم علی مسکرایا: "آپ انگریزوں کی سرپرستی میں اقتدار کی مندر پر بیٹھ کر ان کے خلاف لڑنے والی فوج منظم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ لارڈ کلاؤ آپ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوگا۔ دیکھیے میں آپ سے صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں اس ہمہ میں آپ کا ساتھ دوں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میر جعفر کی حکومت پر مطمئن ہو؟"

"میں کسی ایسی حکومت پر مطمئن نہیں ہو سکتا جسے لارڈ کلاؤ کی سرپرستی حاصل ہو۔ میں

ایک سوراخ میں دوبارہ اٹھ ڈالنے کی غلطی نہیں کروں گا۔"



ہو۔ میں کہتا ہوں تم آزاد ہو۔ اگر تم یہ جانتا چاہتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں آزاد کیا ہے تو سنو۔ پلاسی کی جنگ کے بعد میں نے تم جیسے کئی نوجوانوں کو بغاوت کی مزا پاتے دیکھا ہے اور میں ہمیشہ اپنے دل کو یہ تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا کہ ہمارے خاندان کے دشمن ہیں لیکن آج بنگال پر ہمارا خاندان نہیں بلکہ انگریز حکمران ہے۔ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ الیٹ انڈیا کمپنی کا ایک معمولی کلرک میر جعفر کی نسبت زیادہ اختیارات کا مالک ہے اگر آج سے چند ماہ قبل کوئی شخص تمہاری طرح میری طرف گستاخ نگاہوں سے دیکھتا تو میں اس کی آنکھیں نکل لیتا لیکن اب ہم ہر ذات کے عادی ہو چکے ہیں۔ الیٹ انڈیا کمپنی کے ادنیٰ ملازم ہمیں آواز سے کر بانے کی بجائے انگلی کے اشاروں سے بلاتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم ایک قیدی کے لباس میں بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہو۔ کاش میں بھی اسی طرح لاڈ ڈکلاؤ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا۔ تم جانتے ہو۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں انگریزوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتا لیکن یاد رکھو! جب کبھی موقع آئے گا ہم ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔

پھر وہ میرا صبر کی طرف متوجہ ہوا۔ "ناصرا تم نے شرط جیت لی ہے۔ انھیں لے جاؤ اور میرے نوکرین سے کہو انھیں نیا لباس اور گھوڑا دے دیں۔ انھیں مرشد آباد کے باہر پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

گھر سے باہر نکلتے وقت معظم علی، میر قاسم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا کہ میرے سے باہر نکل کر اس نے میرا صبر سے سوال کیا: "آپ نے میر قاسم سے کون سی شرط جیتی ہے؟" میرا صبر نے جواب دیا: "میر قاسم کا خیال تھا کہ آپ قید سے رہائی کی امید پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور میری لئے اس کے خلاف حق انھوں نے مذاق میں کہا تھا کہ اگر معظم علی مجھے دیکھتے ہی میرے پاؤں پر بڑگر پڑا تو میں تمہیں دس اشتریاں انعام دوں گا اور میں نے یہ کہا تھا کہ جس معظم علی کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا تھا وہ

اور ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکاسکتے ہیں۔" مقبولی دیر بعد معظم علی نے کہا: "میں اپنی رہائی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ میر جعفر اور میر مرین کو جب میرے متعلق معلوم ہوگا تو آپ لوگ کیا جواب دیں گے؟"

میر جعفر اور میر مرین ان دونوں انگریزوں کے لیے روپیہ جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے اور پھر میر قاسم اتنے بے اختیار نہیں کر اپنی غنی سے ایک قیدی بھی رہا نہ کر سکیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ فرزند مرشد آباد سے نکل جائیں اور بلند و بلند بنگال کی سرحد عبور کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دو دن بعد یہ خبر مشہور کرنی پڑے کہ ایک خطرناک قیدی کو چھانسی دے دی گئی ہے۔ میر قاسم کے سپاہی آپ کو شہر کے باہر چھوڑ آئیں گے۔"

معظم علی نے کہا: "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں یہاں سے تنہا جاؤں۔ میرے ساتھ سپاہی دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ میری طرف متوجہ ہوں گے۔ میرا تنہا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں شہر چھوڑنے سے پہلے چند منٹ کے لیے اپنی گھر جانا چاہتا ہوں۔"

میرا صبر نے کہا: "جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کا گھر نیلام ہو چکا ہے اور اب وہاں کوئی اور رہتا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "میں اپنے نوکر کو تلاش کیے بغیر نہیں جاسکتا۔ محلے میں میرے کئی دوست ہیں شاید انھیں اس کا پتہ ہو۔ میرے لیے وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر میں پکڑا گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ نے قید سے نکالا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

میرا صبر نے کہا: "اگر نوکر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے تو میں آپ کو نہیں روک سکتا لیکن آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بہت سے قیدیوں کو رہا کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

”میں پوری احتیاط کر دوں گا۔ اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرزا حسین بیگ مرشدآباد سے ہجرت کرنے کے بعد کہاں گئے تھے؟“

”میں ان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ کھنوی کی طرف جا رہا تھا اور قافلے میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو لکھنؤ سے آگئے مگر وہ دہلی اور حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ میرزا ناصر نے کہا: ”آپ یہیں ٹھہریں۔ میں آپ کے لیے نئے لباس اور گھوڑے کا انتظام کرتا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”اگر بار خاطر ہو تو مجھے ایک خیر کی بھی ضرورت ہے۔“

میرزا ناصر نے کمرے سے باہر نکلے ہوئے جواب دیا: ”میں آپ کو خیر کے علاوہ بندوق اور سپتول بھی دے سکتا ہوں۔“

○

قریباً ایک گھنٹہ بعد معظم علی ایک فوجی افسر کا لباس پہنے اپنے محلے کی ایک سنان گلی میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

”عبداللہ خان! دروازہ کھولو۔“

مکان کا دروازہ کھلا اور معظم علی نے جلدی سے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا: ”عبداللہ! میں معظم علی ہوں۔“

عبداللہ خاں چند ثانیے سکے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں معظم علی نے اپنا گھوڑا اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیا۔

عبداللہ بے اختیار اس سے پٹ گیا اور بولا: ”مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”باتوں کا وقت نہیں، یہ بتاؤ کہ صابر کہاں ہے؟“

”صابر آپ کے مکان میں رہتا ہے۔ آپ کی گرفتاری کے بعد حکومت نے آپ کا مکان یلام کر دیا تھا۔ اب وہاں ایک فوجی افسر مقیم ہے اور صابر اس کے پاس نوکر ہے۔ مرزا حسین بیگ ہجرت کے وقت صابر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے کہا: میں مرتے دم تک اس مکان میں معظم علی کا انتظار کروں گا۔“

معظم علی نے کہا: ”تھیں معلوم ہے کہ مکان کے مرزا نہ تھے میں اس وقت صابر کے ساتھ اور کون ہوگا؟“

”وہاں اگر کوئی ہمان نہیں تو ایک اور نوکر ضرور ہوگا۔“

’مکان کی چھت سے ایک عورت نے آواز دی: ”یہ کون ہیں؟“

’ایک دوست میں: ”عبداللہ نے جواب اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ قید خانے سے اس وقت باہر کیسے نکلے؟“

معظم علی نے کہا: ”ان باتوں کا وقت نہیں۔ تم اسی وقت تین چار قابل اعتماد دوستوں کو بلاؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔“

مختصری دیر بعد معظم علی عبداللہ کے علاوہ اپنے محلے کے چار اور نوجوانوں کے ساتھ جنہوں نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھے تھے، اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر کرا۔ چاند کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ دیوار پیمانہ کھن میں داخل ہوا۔

میں اصل کے سامنے دو آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے معظم علی دیے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف بٹھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ عبداللہ اور اس کے باقی ساتھی صحن میں داخل ہوئے اور معظم علی کے اشارے پر اصل کے سامنے سونے والوں کی کھاٹوں کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔

معظم علی نے ایک کھاٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک قوی بیگل فوجان لٹا ہوا تھا۔ عبداللہ نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر جگایا اور ہاتھ سے اس کا منہ بند کرتے ہوئے

کہا۔ "تھاری خیر می میں ہے کہ تم خاموش رہو۔"

اپنے گرد مسلح آدمی دیکھ کر اس نے مزاحمت کی کوشش نہ کی اور منظم علی کے ساتھیوں نے اسے منہ میں اچھی طرح پکڑا ٹھونس کر اسے چارپائی کے ساتھ جکڑ دیا۔

اس کے بعد منظم علی نے دوسرے آدمی کو جگایا اور اس کے منہ پر مٹا دیکھتے ہوئے کہا۔ "صابر خاموش! ڈرو نہیں، میں منظم علی ہوں۔"

اور صابر کی حیران بے بس اور خاموش نگاہیں ایک تانیہ کے اندر اندر ہزاروں سوالات کر چکی تھیں۔ منظم علی نے کہا۔ "صابر میرے ساتھ آؤ اور باقی سب یہیں ٹھہریں ہم ابھی آتے ہیں۔" صابر کچھ کہے بغیر منظم علی کے ساتھ اسٹبل میں داخل ہوا۔ کھلے دروازوں کے راستے چاند کی روشنی اسٹبل کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کھری پر دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے منظم علی نے کہا۔ "صابر تم جلدی سے گھوڑوں پر زین ڈالو۔"

اس کے بعد وہ کھری کے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور آخری کھونٹے کے قریب بیٹھ گیا۔ جب صابر گھوڑوں پر زین ڈالنے کے بعد اس کے پاس آیا تو وہ خنجر سے زین کھود رہا تھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"صابر میں چوری کر رہا ہوں۔"

"چوری! کس چیز کی چوری؟"

"میں اپنے گھر میں اپنے مال کی چوری کر رہا ہوں۔ تم گھوڑے باہر لے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

صابر گھوڑے کی باگ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد منظم علی اپنی لٹن میں ایک چھوٹی سی تھیلی دبلے باہر نکلا تو اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا۔ یہ کیا ہے؟

"یہ ہمارا زادراہ ہے۔ آؤ اب چلیں!"

کوئی آدھ گھنٹہ بعد محلے سے باہر منظم علی اور صابر گھوڑوں پر سوار ہو کر عبداللہ اور دوسرے دوستوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

عبداللہ نے آئندہ ہو کر سوال کیا۔ آپ کی منزل کہاں ہے؟

منظم علی نے جواب دیا۔ میں ایک ایسا سافر ہوں جس کی کوئی منزل نہیں۔ میں مرزا حسین بیگ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر مکھنوں میں زلے تو میں دلی جاؤں گا۔ اگر وہاں بھی زلے تو مجھے حیدر آباد جانا ہوگا۔ اس کے بعد خدا معلوم مجھے کن کن شہروں اور بستیوں کی خاک چھانی پڑے۔

عبداللہ خاں نے کہا۔ میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ آپ کی گرفتاری کے کوئی سچے بیٹے بعد اکبر خاں یہاں آیا تھا وہ دو دن میرے پاس ٹھہرا تھا اور جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر خدا نے مجھے توین دی تو میں ایک فوج لے کر مرشد آباد آؤں گا اور منظم بھائی کو قید سے نکالوں گا۔

منظم علی نے سوال کیا۔ تم نے اس سے مرزا حسین بیگ کے متعلق پوچھا تھا؟

"ہاں۔ لیکن مرزا حسین بیگ کے متعلق وہ بھی بے خبر تھا اور اس نے یہ کہا تھا کہ میں مکھنوں جا کر انہیں تلاش کروں گا اور اگر وہ مل گئے تو انہیں اپنے گھر لے جانے کی کوشش کروں گا۔"

صابر نے کہا۔ اکبر خاں مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے جواب دیا کہ میں مرتے دم تک اپنے آٹا کا انتظار کروں گا۔

گھوڑے پر سوار ہوتے وقت منظم علی نے عبداللہ اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔ آپ لوگ میرے گزار ہونے کے متعلق محلے کے کسی اور آدمی سے ذرا شک نہ کریں۔ میر جعفر کے آدمیوں کو اگر اس کا علم ہو گیا تو وہ یقیناً ہمدردی بھیجیں گے۔

نام دلاور خاں تھا۔ سالار دن شہر کے محلوں اور گلیوں میں حسین بیگ کو تلاش کے بعد شام کو تھکاوٹ اور تھکاوٹ سے زیادہ مایوسی سے نڈھال ہو کر وہ گھر آتا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ بیروں کی پھیلی کمرے کھول کر تکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ صابر کے سوا کسی کو اس کی دولت کا علم نہ تھا۔ اپنے خزانے کا سب سے چھوٹا میرا فروخت کرنے کے بعد معظم علی کو یہ انظار ہو چکا تھا کہ وہ ملک کے چند امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہے لیکن اس دولت کے ساتھ مافی کی تلخ یادیں و البتہ تھیں۔

ایک امیر آدمی کے لباس میں اسے مکھنوں کے رؤسا، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ دس دن کی پیہم جستجو کے بعد ایک دوپہر وہ مکھنوں کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ آدمی اس کے سامنے آکر اچانک رکا اور اس کی طرف بغور دیکھنے کے بعد معظم علی اعظم کہتا ہوا لپٹ گیا۔

”آپ شیر علی ہیں؟“ معظم علی نے قد سے توقف کے بعد کہا۔

”ہاں“ اس نے مغموں لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے آسانی سے نہیں پہچانو گے۔ مجھے یہاں مرشد آباد کے کئی آدمی ملے ہیں لیکن ایک دو کے سوا مجھے کوئی نہیں پہچان سکا اور تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ تم قید سے کب رہا ہوئے اور یہاں کب آئے؟“ میں کوئی دس روز سے یہاں ہوں اور مرزا حسین بیگ کو تلاش کر رہا ہوں۔ شاید آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو؟“

شیر علی نے جواب دیا۔ ”مرزا صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

ایک تائید کے لیے معظم علی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ بھٹی پٹی آنکھوں سے شیر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ ”میں نے ان سے ایک ماہ بعد مرشد آباد سے ہجرت کی تھی۔ مکھنوں

علی الصباح معظم علی اور صبر نے ایک برساتی ندی کے کنارے گھوڑوں سے اتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب امٹ پڑا۔ یہ آنسو ایک لمحے ہوئے مایوس اور بے بس انسان کی آخری پوچھی تھی جسے وہ اپنے وطن کی خاک پر پھیلا کر رہا تھا۔ معظم علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جزا اور سزا کے مالک میری برصیب قوم کو چند افراد کی بد اعمالیوں کی سزا نہ دیے۔ ہمیں ان ملت فزوشوں سے نجات دلائجنہوں نے تیرے بندوں کو تیری رحمت سے مایوس کر دیا ہے!“



آپ مرزا حسین بیگ کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ — وہ مرشد آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے مکھنوں آئے تھے۔ شاید یہاں ان کے کوئی رشتہ دار تھے۔ آپ کسی ایسے آدمی کا پتہ دے سکتے ہیں جو بلائی کی جنگ کے بعد مرشد آباد سے ہجرت کر کے مکھنوں میں آباد ہوا ہو؟“ یہ وہ سوالات تھے جو معظم علی مکھنوں میں چند دن قیام کے دوران سیکڑوں آدمیوں سے پوچھ چکا تھا لیکن کہیں سے اسے تسلی بخش جواب نہ ملا۔

مکھنوں پہنچ کر معظم علی نے دو دن ایک محلے میں گزارے۔ تیسرے دن اس نے اپنی پھیلی سے ایک میرا نکالا اور باہر سواترئی کے عوض مکھنوں کے ایک جبری کے پاس فروخت کر دیا، اسی شام اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اس کے بعد اس کا مولیٰ یہ تھا کہ نہ صبح سویرے اٹھتا اور اپنے نیکے کے نیچے سے جا برات کی پھیلی نکال کر اپنی کمر میں باندھ لیتا اور پھر محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد حسین بیگ کی تلاش میں نکل جلتا زیورات اس نے ایک صندوق میں بند کر دیئے تھے اور اس کی حفاظت صابر کے سپرد کر دی تھی۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کے لیے اس نے ایک اور نوکر رکھ لیا تھا جس کا

شیر علی کا لباس اس کی مغلی اور تنگ دستی کا آئینہ دار تھا۔

مغظم علی نے پوچھا۔ یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟

شیر علی نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔ جب میں مرشد آباد سے آیا تھا تو میرے پاس کچھ روپیہ تھا۔ یہاں ایک ساتھی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم بنارس چل کر کوئی کاروبار شروع کریں بنارس جا کر میں تجارت میں نفع کمائے کی بجائے اپنی رہی پونجی بھی گنوا بیٹھا اور اب کسی ملازمت کی تلاش میں ہوں لیکن یہاں ایک بوڑھے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“

مغظم علی نے کہا۔ آپ کو ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پہلے میرے

ساتھ 1

”کہاں؟“

”میرے مکان پر۔“

لیکن میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

مغظم علی نے جواب دیا۔ ”میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔“

لیکن اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو ممکن ہے میں آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔“

”لیکن تجارت کے لیے سرمے کی ضرورت ہے؟“

”سرمے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بہت

کچھ ہے۔“

شیر علی نے کہا۔ ”میں اپنی خاطر آپ کو تجارت کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ ایک

سپاہی ہیں اور اپنے تجربے اور ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ادھ کی فوج میں بہترین

عہدہ حاصل کر سکتے ہیں۔“

مغظم علی نے کہا۔ ”چچا شیر علی خدا کے لیے فوج کی ملازمت کا ذکر نہ کیجیے۔ میں یہ

فیصلہ کر چکا ہوں کہ باقی عمر ان نام نہاد حکمرانوں کے لیے تلوار نہیں اٹھاؤں گا، جنہوں نے

پہنچ کر مجھے چند ایسے آدمی ملے جو مرشد آباد سے مرزا صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے تھے مجھے ان کی زبانی پتہ چلا کہ مرزا صاحب ادھ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بیمار ہو گئے تھے اور ایک بستی کے زمیندار نے انھیں اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کے ایک ماسٹر زاد بھائی رہتے تھے اور میرا خیال تھا کہ مرزا صاحب ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب میں نے انھیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پلاسی کی جنگ سے چند ماہ قبل لکھنؤ سے ہجرت کر کے دکن جا چکے ہیں۔ پھر میں نے اس بستی کا رخ کیا جہاں مرزا صاحب کے ٹھہرنے کی اطلاع ملی تھی لیکن وہاں پہنچ کر گاؤں کے زمیندار سے یہ خبر سنی کہ وہ چار دن موت و حیات کی کھش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئے تھے اور انھیں گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ گاؤں کے زمیندار نے مجھے ان کی قبر بھی دکھائی تھی۔“

مغظم علی نے کہا۔ لیکن ان کے ساتھ ان کی بیوی اور لڑکی بھی تھیں؟

”انھیں گاؤں کے زمیندار نے چند دن اپنے پاس مہمان رکھا تھا۔ اس کے بعد رنگال سے تارکان وطن کا ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا۔ وہ اس قافلے کے ساتھ شامل ہو گئیں اس قافلے میں بعض آدمی لکھنؤ اور فیض آباد اور بعض اگرہ اور دلی جانے والے تھے۔ میں نے لکھنؤ واپس آ کر پتہ کیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان کے ساتھ دو لڑکے بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ سے اپنے عزیزوں کا پتہ کرنے کے بعد دلی یا حیدر آباد جا چکی ہیں۔ کیونکہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد ان دونوں شہروں میں ہیں۔“

مغظم علی نے سوال کیا۔ آپ کو مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی کا نام معلوم ہے؟

”ہاں، ان کا نام ارشد بیگ تھا۔“

”آپ کو دہلی میں ان کے کسی رشتہ دار کا نام معلوم ہے؟“

”نہیں۔“

بن چکا تھا :

گئے جنگل میں غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہی شام کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اداس اور مغموم فضا میں معظّم علی اور دلادراخاں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں پر سوار رہتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کبھی کبھی کوئی گیدڑ، خرگوش، بہرن یا بیڑیا گھنے درختوں سے نمودار ہوتا اور پگڑنڈی عبور کر کے دوسری طرف دوپوش ہو جاتا۔

ایک چھوٹی سی ندی عبور کرنے کے بعد معظّم علی نے اپنے مساتھ سے کہا: ”یہاں سے تھوڑی دور آگے دائیں ہاتھ ایک اور پگڑنڈی آئے گی جو اکبر خاں کے گاؤں کو جاتی ہے۔ ذرا خیال رکھنا اگر ہم اس پگڑنڈی سے آگے نکل گئے تو ساری رات جنگل میں بھٹکتے رہیں گے۔“

دلادراخاں نے جواب دیا: ”جناب بھٹکنے کے لیے یہ جنگل موزوں معلوم نہیں ہوتا اس سے تو یہ بہتر تھا ہم کچھ لیستی میں رک گئے ہوتے۔“

معظّم علی نے کچھ کہنے کی بجائے ایڑ لگا کر اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ کوئی آدھو میل چلنے کے بعد اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک پگڑنڈی دکھائی دی اور اس نے اپنا گھوڑا موڑتے ہوئے کہا: ”اب ہم پہنچ گئے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک ٹیلہ ہے۔ ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ہم ایک بھیل کے کنارے کنارے تھوڑی درجائیں گے۔ اس کے بعد ایک بڑا ٹیلہ آئے گا جسے عبور کرنے کے بعد ہم جنگل سے نکل کر اکبر خاں کے گاؤں کے کھیتوں میں داخل ہو جائیں گے۔“

دلادراخاں کچھ کہے بغیر معظّم علی کے پیچھے ہولیا۔ تنگ پگڑنڈی پر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے کے قریب پہنچے ہی گھوڑوں نے ٹھٹھک کر کان بکھرے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ معظّم علی اور دلادراخاں پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ انھیں کسی بکرے کی میا ہٹ سنائی دی۔ دلادراخاں نے اطمینان کا سانس

قلم کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔“

معظّم علی نے دوپٹے اور کھنڈ میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں وہ صبح سے شام تک فرحت اور اس کی ماں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ رات کے وقت جب کبھی شیری علی کو اس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہتا: ”معظّم اگر تمہارے پاس قارون کا خزانہ ہو تو بھی ہمیں بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی کام منرو کرنا پڑے گا۔“ معظّم علی جواب دیتا: ”ہاں چچا جان میں سوچ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو بہت جلد کسی کام پر لگا دیا جائے گا۔“

ایک رات تیسرے پہر شیری علی سو رہا تھا۔ معظّم علی نے اسے جگایا اور کہا: ”چچا شیری علی میں کچھ عرصہ کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ دلادراخاں میرے ساتھ جائے گا اور صابر آپ کی خدمت میں رہے گا۔ یہ لیجیے اس قبیلے میں پانچ سواشرنیاں ہیں۔ میری غیر حاضری میں آپ کے اخراجات کے لیے یہ کافی ہوں گی۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ شیری علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

”میرا مقصد فرحت اور اس کی دالوہ کو تلاش کرنا ہے۔ میں پہلے فیض آباد جاؤں گا۔ اس کے بعد روہیلکھنڈ ایک دومت کے پاس جاؤں گا۔ پھر مگن ہے مجھے اگرہ؛ دلی اور حیدر آباد کی خاک چھانی پڑے۔“

شیری علی نے کہا: ”اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“

”نہیں اس عمر میں آپ کے لیے اتنا طویل سفر ٹھیک نہیں۔ میری واپسی تک آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ میں کون سا کاروبار شروع کرنا چاہیے۔“

تھوڑی دیر بعد معظّم علی اور دلادراخاں گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے اور شیری علی اور صابر مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ دلادراخاں کوئی چالیس برس کا ایک دراز قامت، قوی ہیکل آدمی تھا اور چند دنوں میں معظّم علی کا قابل اعتماد ساتھی

لیتے ہوئے کہا: اگر کسی روٹے سے بھرے ہوئے برے کے آواز نہیں تو ہم کسی بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں:

”جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں اس پاس کوئی بستی نہیں اور ایسے جنگل میں برے اپنے روٹے سے پھرنا پسند نہیں کرتے۔“ معظم علی نے یہ کہہ کر گھوڑے کا گلاڑی بدھوا اس گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں لیکن ٹیلے کی چوٹی سے کوئی بیس قدم دور پہنچ کر آگے بڑھنے کی بجائے پھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ معظم علی نے مڑ کر دیکھا تو دلا درخان کا گھوڑا بھی اٹلے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معظم علی اپنی بندوق سنبھال کر گھوڑے سے اتر پڑا اور دلا درخان نے اس کی تقلید کی۔

معظم علی نے کہا: ”تم گھوڑے سنبھالو۔ معلوم ہوتا ہے انھیں کسی درندے کی بو آگئی ہے۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔“

دلا درخان نے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں۔ معظم علی نے گھنے جنگل میں ادھر ادھر دیکھا اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹیلے سے آگے ایک چھوٹی سی جھیل تھی اور گلاڑی جھیل کے کنارے ایک نصف دائرہ بنانے کے بعد دوسری جانب درختوں میں غائب ہو جاتی تھی۔ جھیل کے کنارے درخت نسبتاً کم تھے۔ برے کی کرب اگیز جینیں بدستور سناں دی رہی تھیں۔ غم نے پیچھے مڑ کر دلا درخان کو اشارہ کیا اور وہ اچھلتے کودتے بدکتے ہوئے گھوڑوں کو کھینچتا آگے بڑھا۔

معظم علی نے کہا: اگر میں غلطی پر نہیں تو عنقریب ہم کسی شکاری سے ملنے والے ہیں۔ برا جھیل کے کنارے پگڈنڈی کے پاس جی کسی درخت کے نیچے بندھا ہوا ہے اور شیر یا چیتا بھی کہیں اس پاس چکر کاٹ رہا ہے۔ اب شام ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے یہاں سے جلد نکل جانا بہتر ہے۔ تم گھوڑوں کو جھیل کے ساتھ ساتھ رکھو اور میں جنگل کی طرف رہوں گا۔

دلا درخان نے گھوڑوں کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا: ”خدا کی قسم میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن اس برے کی ہرج مرج کے ساتھ میرا ایک سیخون خشک ہوا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی بھوت نہیں تو آپ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں!“

ٹیلے سے نیچے اترتے ہی معظم علی کو اپنے دائیں ہاتھ گھنی جھاڑیوں میں پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک درختوں کے درمیان پھیلی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں اسے ایک شیر دکھائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے اپنی بندوق سیدھی کی۔ شیر ایک ثانیہ کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک خوفناک گرج کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ معظم علی نے گولی چلا دی۔ زخمی درندے نے دو تین ہلٹیاں کھائیں اور پھر پوری قوت سے آخری جست لگا کر معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر ڈھیر ہو گیا۔

معظم علی ایک لمحہ کے لیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اپنے تھیلے سے بارود نکال کر بندوق بھرنے لگا۔ ابھی وہ اس سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے پیچھے جھاڑیوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو بھوت سا جو کر رہ گیا۔ ایک شیر نے کوئی پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ سے نمودار ہوئی اور دھاڑتی ہوئی معظم علی کی طرف بڑھی۔ معظم علی کے لیے بندوق بھرنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے بندوق پھینک دی اور جلدی سے توار نکال کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا پاؤں ایک درخت کی جڑ کے ساتھ ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل کی فضا بندوق کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ معظم علی جو ایک ثانیہ قبل موت کا جیسا تک چہرہ دیکھ رہا تھا، اٹھا تولے نہف چار قدم کے فاصلے پر شیشی دم توڑتی دکھائی دی۔ پھر اسے ایک دلکش آواز سنائی دی: ”آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔“

معظم علی جواب دینے کی بجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک درخت



ساتھ شامل ہو گئے۔ جھیل کی طرف دلا درخاں کی چیخ دیکر سانی دے رہی تھی۔ درختوں اور چھاڑیوں سے نکل کر انھیں ایک دلچسپ منظر دکھائی دیا۔ دلا درخاں کنارے سے چند قدم دور جھیل کے اندر وحشت زدہ گھوڑوں کی باگیں پکڑے انھیں بے تحاشہ گالیاں دے رہا تھا۔ ایک دیہاتی جس نے ایک ہاتھ سے بکرے کا رستہ پکڑ رکھا تھا، کنارے پر بھڑکے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک گھوڑے نے اچانک جھیل کر دلا درخاں کے ہاتھ سے ہلک چڑائی اور چند قدم دور نکل گیا۔ دلا درخاں کو اس پریشانی کی حالت میں دیہاتی کی ہنسی بے ناگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”اے یار تم عجیب بیوقوف ہو۔ جھلا یہ ہنسنے کی کوئی بات ہے خدا کے لیے اس بکرے کو یہاں سے لے جاؤ یہ بیوقوف جانور اسے بھی شیر سمجھتے ہیں۔“

دیہاتی نے توقعہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اے نہیں گھوڑے، بکرے کو شیر نہیں سمجھتے بلکہ انھیں بہت سمجھ کر ڈر گئے ہیں۔“

دلا درخاں کو انتہائی بے بسی کی حالت میں بھی بھوت کہنا ناپسند نہ تھا۔ دو دیہاتی کو جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ اس کی توجہ معظم علی اور دوسرے آدمیوں کی طرف مبذول ہوگئی اور اس کا سارا غصہ جاتا رہا اس نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ ٹھیک ہیں نا؟“

معظم علی نے جواب دیا: میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہم نے دو شیر مار لیے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ تم باہر آ جاؤ۔“

دلا درخاں نے آدھہ ہو کر کہا: ”داہ جی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیر سے ڈر کر پانی میں گھس گیا تھا۔ خدا کی قسم یہ گھوڑے نہیں گدے ہیں۔ اگرچہ کبھی ایسا وقت آیا تو میں انھیں سنبھالنے کی بجائے شیر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تیرنا آتا ہے ورنہ آپ کو میری لاش بھی ملتی۔“

کی آڑ سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور فاتحانہ انداز سے آگے بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔ ”جہان جان! وہ قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلتا اور اپنی بندوق پھینک کر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ لیٹ گیا۔“

اکبر۔ ”تم... تم اتنی جلدی جان ہو گئے؟“  
اکبر نے کہا۔ ”جہان جان شیر مارنے کے بعد آپ کو اس قدر بے پروا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ شیرنی آپ کے سر پر اچکی تھی۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”میں بندوق بھر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بروقت پہنچ گئے۔ میں نے بکرے کی چیخیں سن کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ جنگل میں کوئی شکاری موجود ہے۔“  
اکبر خان نے کہا۔ ”اس جوڑے نے ہمارے کئی مویشی ہلاک کیے ہیں۔ اس لیے میں نے آج بکرہ بڑھوایا تھا۔ جب آپ ٹیلے سے نیچے اتر رہے تھے میں نے شیر کو آپ کی تاک میں جلتے دیکھا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ کوئی مسافر راستہ بھول کر اس طرف آنکلا ہے میں آپ کو خبردار کرنے کی نیت سے نیچے اتر لیکن آپ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو چکے تھے، پھر میں بندوق کی آواز سن کر اس طرف بھاگا تو یہ شیرنی نظر آئی۔ میں مرشد آباد گیا تھا آپ تیدے سے کب رہا ہوئے؟“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”اکبر ہم اس جنگل سے نکل کر اطمینان کے ساتھ باتیں کریں گے۔“

”چلیے، اکبر خان نے کہا۔ یہ آپ کا ساتھی کون ہے۔ میں نے اسے جھیل کے کنارے بدحواس گھوڑوں سے زور آزمائی کرتے دیکھا ہے۔“  
”وہ میرا نوکر ہے۔“

دو اپنی بندوقیں اٹھا کر پل پڑے۔ راستے میں اکبر خان کے تین اور ساتھی ان کے



اکبر خاں نے اپنی منہی ضبط کرتے ہوئے کہا: "نہیں بھائی اس طرف تھمیل کا پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اگر تمہیں تیرا نہ آتا تو بھی ڈوب جانے کا خطرہ نہ تھا۔"

معظم علی نے کہا: "دلا درخاں اب تم شور مچانے کی بجائے باہر نکل آؤ تو گھوڑے خود بخود ہمارے پاس آئیں گے۔"

"نہیں جناب! جب تک یہ کبرا کنارے پر کھڑا ہے۔ یہ باہر نہیں نکلیں گے۔"

"بھئی تم باہر تو نکلو!" دلا درخاں نے بدل ہو کر گھوڑوں کی لگائیں چھوڑ دیں اور خود پانی سے باہر نکل آیا جب وہ کنارے پر پہنچا تو گھوڑے بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ دلا درخاں نے کہا: "خدا کی قسم میرا جی چاہتا ہے کہ ان دونوں کو گوئی مار دوں!"

اکبر خاں کے اشارے پر دو آدمیوں نے گھوڑے پکڑ لیے اور یہ لوگ جھیل کے کنارے کنارے پگڑی پیل دیئے۔ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جنگل میں گیدڑوں، میٹھویوں اور دوسرے وحشی جانوروں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم علی، اکبر خاں کے ان گنت سوالات کے جواب میں اسے اپنی قیاد رہائی کی داستان سناتا رہا تھا۔ جب اس نے اپنی مرگدشت ختم کی تو اکبر خاں نے کہا: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ پہنچ گئے ہیں تو میں ذرا وہاں آتا۔"

"لکھنؤ میں میرا قیام بہت مختصر تھا۔ میں دہلی سے فیض آباد چلا گیا تھا اور فیض آباد سے اودھ کے چند شہروں کی خاک چھاننے کے بعد تمہارے پاس آیا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تمہیں مرزا صاحب کے متعلق کچھ معلوم ہو۔"

اکبر خاں نے مفوم لمبے میں کہا: "کاش مجھے کچھ معلوم ہوتا۔ میں نے مرشد آباد سے واپسی پر لکھنؤ میں انھیں تلاش کیا تھا۔ اب اگر آپ دہلی، آگرہ اور حیدر آباد جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

معظم علی نے سوال کیا: "تمہارے بھائی جان کا کیا حال ہے؟"

"بھائی جان کوفت ہوئے قریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ ہمارے علاقے پر مرہٹوں نے حملہ کر دیا تھا اور وہ لڑائی میں مارے گئے تھے۔"

چند مہینے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اکبر خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "اکبر مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان نے ایک بہادر کی طرح جان دی تھی۔ ان کے جسم پر تین گولیوں کے اور پانچ توار کے زخم تھے۔"

معظم علی نے پانچ دن اکبر خاں کے گھر قیام کیا۔ اس کے بعد جب اس نے آگرہ اور دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر خاں نے اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن معظم علی نے کہا: "اکبر خاں تم اب اپنے علاقے کے سردار ہو۔ تمہارا گھر رہنا ضروری ہے۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، لیکن تم میرے ساتھ جا کر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان میں آپ کی خاطر نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ مجھے آگرہ اور دہلی دیکھنے کا شوق ہے۔ میں حیدر آباد بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں چچا جان کے ہوتے تھے میری غیر حاضری بہت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی۔"

معظم علی نے کچھ سوچ کر جواب دیا: "بہت اچھا اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو پھر تیار ہو جاؤ۔ ہم پرسوں صبح یہاں سے رواز ہو جائیں گے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں بالکل تیار ہوں۔ تمہارے روزرات کے کچھ پیر اکبر خاں نے معظم علی کو جگایا اور کہا: "بھائی جان! تمہیں اب صبح ہونے والی ہے۔"

معظم علی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں کی قطار دکھائی دی۔ اکبر خاں کا چچا چند سوچاؤ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی نے اکبر خاں سے سوال

کیا یہ سب آدمی ہمارے ساتھ جائیں گے؟  
 ”چچا جان تو میں آدمی بھیجنے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی شکل سے انہیں اٹھ آدمی لے جانے پر رضا مند کیا ہے۔“  
 اکبر خاں کے چچا نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں زیادہ آدمی لے جانے چاہئیں۔“  
 اکبر خاں نے کہا۔ ”چچا جان ہم دلی دیکھنے جا رہے ہیں، دلی لوٹنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔“

”برخودار! دلی لوٹنے کے لیے تمہیں یہاں سے آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ اگر تھل قلعہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دو کہ میں دلی لوٹنے آیا ہوں تو وہیں سے تمہیں ہزاروں مددگار مل جائیں گے۔ تمہیں راستے میں اپنی حفاظت کے لیے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ اکبر خاں کا خیال رکھیں۔ یہ اٹھ آدمی جنہیں میں آپ کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ ہمارے قبیلے کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ خطے کے دقت آپ ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“  
 قصوری دیر بعد گیارہ آدمیوں کا یہ قافلہ گادوں سے باہر نکل رہا تھا۔

## گیارہواں باب

دلی تک سفر کے دوران میں معظم علی کے تمام خیالات فرحت پر مرکوز تھے۔ وہ راستے کے پر رونق شہروں سے مایوس ہو کر نکلتا تو اپنے دل کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا کہ فرحت آگے کسی بستی میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پھر جب اسے بستی کے لوگوں سے مل کر مایوسی ہوتی تو اس کی نگاہیں فرحت کو راستے کے جنگلوں اور سیلابوں میں تلاش کرتیں۔ کبھی کوئی قافلہ نظر پڑتا تو وہ قریب جا کر پوچھتا: آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ سدا کا کوئی آدمی تو نہیں؟ مسافر اس کی باتوں پر مسکراتے اور ہنستے گزر جاتے، پھر وہ اکبر خاں سے کہتا۔ اکبر شاید یہ دیوار ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس قافلے میں نہیں ہوں گی لیکن اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے دلی پہنچ کر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن میں خود قریب میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ اب تو ہمارے امیدیں میری زندگی کا آخری سہارا بن چکی ہیں۔ مجھے انہوں سے کہیں خواہ مخواہ اپنے ساتھ لاکر پریشان کیا۔  
 اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا: بھائی جان آپ کو خدا کی رحمت سے مایوسی نہیں ہونی چاہیئے۔

ایک شام دلی سے دو منزل اور دو ایک چھوٹی بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کا چودھری ایک شریف النفس راجپوت تھا۔ اس نے انہیں اپنے پاس قہر لیا جب معظم علی نے اسے یہ بتایا کہ میں اپنے بھروسے ہوئے عزیزوں کی تلاش میں دلی جا رہوں۔ تو وہ رسیہ

میزبان نے کہا: ”برخوردار مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ لوگ اس شان و شوکت کے ساتھ دلی گئے تو آپ کے بانی عز و شایہ تمام عمر آپ کو تلاش کرتے رہیں۔ دلی پر اب مرہٹوں کا راج ہے۔ وہاں آپ کا لباس، آپ کے گھوڑے اور آپ کے ہتھیار آپ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ پھر اگر آپ مرہٹوں کی نگاہ سے بچ کر شہر میں داخل ہو جائیں تو بھی ہزاروں آدمی وہاں آپ کے لیے سروردی کا باعث ہوں گے۔ دلی میں اگر آپ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو آٹھ دس آدمی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ جب آپ شہر میں داخل ہوں تو کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو کہ آپ بہت امیر ہیں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”میں راستے میں دلی کے حالات سن چکا ہوں اور اتنے آدمیوں کو وہاں لے جاؤں میں بھی قلعہ بندی نہیں سمجھتا۔ میرا ارادہ ہے کہ انھیں اگلی منزل سے واپس کر دوں گا یا راستے کی کسی بستی میں چھوڑ دوں گا اور اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس ٹھہرا سکیں تو بہت نوازش ہوگی۔“

میزبان نے جواب دیا: ”میرے پاس آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت جگہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی اپنا گھڑا یہیں چھوڑ دیں۔ میرے گاؤں سے کل اناج کے چند پھکڑے دلی جا رہے ہیں اور اگر آپ ایک عام دیہاتی کا لباس پہننا پسند کریں تو میں آپ کو ان کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”مجھے ننگے پاؤں چلنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں سرت ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میرے بانی ساتھی میری دالپی تک یہاں رہیں گے۔ پھر وہ اکبر خاں کی طرف متوجہ ہوا: ”اکبر خاں تم اگر واپس نہیں جانا چاہتے تو تمہیں چند دن یہاں رہنا پڑے گا۔ میں صرف دلا در خاں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اکبر خاں نے ہنسنے کہا: ”نہیں بھائی جان میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔“

آپ دلا در خاں کو میرے نوکرؤں کے ساتھ چھوڑ دیں۔“  
معظم علی نے جواب دیا: ”نہیں اکبر خاں یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔“  
اکبر خاں نے میزبان کی موجودگی میں معظم علی کے ساتھ بحث کرنا پسند نہ کیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہ لوگ ایک چھوٹی سی حویلی کے صحن میں سو رہے تھے۔ اکبر خاں نے آواز دی: ”بھائی جان!“

”کیا ہے اکبر؟ تمہیں نیند نہیں آتی؟“ معظم علی نے اپنی چارپائی پر کھڑے بدستے ہوئے کہا!

”نہیں بھائی جان! میں سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جانا چاہتے۔“

”اکبر اگر دلی کے حالات ٹھیک ہوتے تو میں یقیناً تمہیں ہی ساتھ لے جاتا۔“  
دلی کے حالات تو کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ پھر وہاں جانے میں اگر آپ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔“

معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: ”اکبر تمہیں یہاں ٹھہرانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ سو میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے دلی لے جانا خطرناک ہے اور یہ چیز میں تھا کہ حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کی حفاظت کر

اکبر خاں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا: ”وہ کیا چیز ہے بھائی جان؟“

”ابھی بتاتا ہوں: یہ کہہ کر معظم علی نے اپنی قمیص کے نیچے کمر کے ساتھ بندی ہوئی تھیلی اتاری اور اکبر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”یہ لو!“

اکبر خاں نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اٹھ آگے بڑھا کر تھیلی پکڑ لی اور پوچھا: ”اس میں کیا ہے؟“

”ہمیرے“ معظم علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”اس قبیلی کو اپنی کمرے ساتھ باغھ لو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔“

اکبر خاں نے کہا۔ ”اگر یہ پچ پچ میرے ہیں تو یقین رکھیے کہ اب آپ کی داپسی ملک مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی نیند نہیں آئے گی۔“

اکبر یہ تمھاری نیند سے زیادہ قیمتی نہیں۔ اب آرام سے سو جاؤ اور دیکھو اگر مجھے زیادہ دلی ٹھہرنا پڑا تو میں دلاور خاں کو واپس بھیج دوں گا۔ پھر تمھارے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم یہاں ٹھہرنے کی بجائے گھر چلے جاؤ اور میں اگر زندہ رہا تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔



تیسرے دن معظم علی اور دلاور خاں گاڑی بانوں کے لباس میں دلی پہنچے۔ شہر کے ناگوں پر مرہٹہ سپاہی باہر سے آنے والے ہر سفید پوش کی تلاش لیتے تھے اور اس کی جیب سے جو کچھ نکلتا تھا وہ جتنی مرہٹہ سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا۔ بسا اوقات شہر میں داخل ہونے والوں کو اپنے اہلے پڑوں کے بدلے کسی مرہٹہ سپاہی کا بوسیدہ لباس زیب تن کرنا پڑتا تھا لیکن شہر میں غلہ، سبزی اور ایندھن سپنانے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ معظم علی نے جامع مسجد سے تنہوڑی دو ایک سرائے میں قیام کیا اور تنہوڑی دیر بعد بازاروں، گلیوں اور خانقاہوں میں فرشت اور اس کی ماں کی تلاش شروع کر دی۔ انے سرائے کے مالک کے توسط سے چند منادی کرنے والوں کو بلایا اور انھیں مرشد آباد سے مرزا حسین بیگ کے کسی شناسا کا سراغ لگانے کے کام پر لگا دیا۔

دلی میں قیام کے دوران میں معظم علی نے مسلمانوں کی زبان حالی کے جو مناظر دیکھے۔ انتہائی دلخیز تھے۔ نام نہاد شہنشاہ کی حکومت لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ امر ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ لال قلعہ سے باہر بیڑوں اور ریزوں کی بادشاہت تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں مرہٹہ سپاہیوں کے گھوڑے دوڑتے

تھے۔ شہنشاہ کے تمام احکامات مرہٹہ فوج کے سردار کی خواہشات کے مطابق ہوتے تھے۔ دلی سے آگے مرہٹوں کی جارحیت کا سیلاب لاہور، ملتان اور سرسند کا رخ کر رہا تھا۔ مغربی ہندوستان، بھڑیا خصلت انسانوں کے لیے ایک وسیع شکار گاہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کے وہ دفاعی قلعے جو اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کیے تھے، ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔ دروازہ شدوں اور بستیوں کے لوگ اپنے شہنشاہ اور اس کے وڈیوں اور امیروں کے پاس فراریوں لے کر آتے لیکن دلی پہنچ کر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ لال قلعہ کے حکمین ان سے زیادہ مجبور، ان سے زیادہ بے بس اور مظلوم ہیں۔ ستم رسیدہ انسانیت کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی۔ انسانیت اور شرافت کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مسلمان چھپ چھپ کر مسجدوں اور بزرگان دین کی خانقاہوں میں دعائیں کرتے تھے۔ علامتے دین احمد شاہ اہل بیت کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے۔ ”مرہٹوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اب آپ اس ملک کے مظلوم انسانوں کا آخری مہارا ہیں۔“

معظم علی اٹھ دن دلی میں سرگرداں رہا۔ اس عرصہ میں اسے مرشد آباد کے کسی آدمی نے جنھوں نے مرزا حسین بیگ کے ساتھ ہجرت کی تھی لیکن اس سے زیادہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ علالت کے باعث راستے کی ایک بستی میں رک گئے تھے۔

ایک شام معظم علی دن بھر کی جستجو کے بعد سرائے میں پہنچا تو اس کے کمرے میں ایک عمر رسیدہ آدمی دلاور خاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور خاں نے اٹھ کر کہا۔ ”جناب یہ مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار ہیں۔“ معظم علی کا دل دھڑکنے لگا۔

عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ ”مرزا حسین بیگ ہمارے در کے رشتہ دار تھے آج میں نے جامع مسجد میں یہ اعلان سنا کہ آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں۔“

معظم علی کا دل بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔ ”مرزا صاحب وفات پا چکے ہیں۔ میں کے بال بچوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہے؟“

جودت کی آنکھوں اور طوفانوں سے لڑ سکتا ہو۔ ہم تاریک رات کے مسافریں اور ہمیں روشنی کے ایک سینار کی ضرورت ہے۔



دو دن پیدل سفر کرنے کے بعد معظم علی دوبارہ اپنے ساتھیوں سے جاملا اور چوتھے روز یہ لوگ حیدرآباد دکن کا رخ کر رہے تھے۔ کوئی چھ منزلیں طے کرنے کے بعد گیارہ آدمیوں کے اس قافلے کے ساتھ چھ سو اوروں شامل ہو گئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ ہم دلی چھوڑ کر نظام کی فوج میں ملازمت حاصل کرنے کے ارادے سے دکن جا رہے ہیں۔ راستے کی بسیتوں سے معظم علی کو یہ اطلاع ملی کہ قریباً اڑھائی سو مسافروں کا ایک قافلہ ایک ہفتہ قبل اس راستے سے گزرا ہے۔ راستے میں معظم علی کے نئے ساتھی اس سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ اکبر خاں انھیں مرعوب کرنے کے لئے یہ بتا چکا تھا کہ معظم علی جنگال کی فوج کا ایک بہت بڑا انسفرہ چکا ہے۔

کئی دن کے سفر کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی ایک دوپہر ایک پہاڑی ندی کے کنارے سستانے کے لیے رکے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ درختوں کی چھاؤں میں آرام کرنے کے بعد وہ کوچ کی تیاری کر رہے تھے کہ انھیں سامنے پہاڑی کے عقب سے کہیں دو درندہ قوت کے دھماکے سنائی دیئے۔ وہ جلدی سے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ پہاڑی کی چوٹی سے تھوڑی دور درہ معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو روکنے کے لیے کہا اور خود گھوڑے سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کی اڑلیتا ہوا آگے بڑھا۔ اب اسے درندہ قوت کی آواز کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی چیخ دیکھ رہی سنائی دے رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر اسے ایک تنگ وادی دکھائی دی۔ وادی کے دائیں طرف ایک پہاڑی کے دامن میں قریباً اڑھائی سو آدمیوں کا ایک قافلہ مرہٹوں کے گھیرے میں آچکا تھا قافلے کے محافظ اور حملا آور پتھروں اور درختوں کی آڑ سے ایک دوسرے پر گولیاں برس رہے تھے۔ معظم علی نے

عمر سیدہ آدمی نے جواب دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کے نوکر نے ابھی مجھے ان کے گھر کی تباہی کے واقعات سنائے ہیں۔ اگر ان کے بال بچے اب کو کھنڈ میں نہیں ملے تو آپ کو حیدرآباد جانا چاہیے۔

معظم علی نے کہا۔ "مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدرآباد جا چکے ہیں۔ لیکن ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ میں ان کا پتہ کرنے کے بعد حیدرآباد چلی گئی ہوں لیکن میں نے سنا تھا کہ مرزا صاحب کے کئی عزیز دلی میں بھی ہیں۔ آپ کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو زیادہ قریبی ہو لیکن ہے وہ یہاں آئے ہوں۔" عمر سیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "یہاں مرزا صاحب کے خالو کے دوڑکے رہتے تھے۔ بڑے کا نام عبدالجبار تھا اور چھوٹے کا نام عبدالکیم تھا۔ عبدالجبار کوئی چار سال قبل فوت ہو گیا تھا اور عبدالکیم اور اس کے خاندان کے باقی افراد ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ دکن میں وہ کہاں رہتے ہیں۔ بہر حال حیدرآباد سے یقیناً آپ کو ان کا سراغ مل جائے گا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں اس سرائے کی بجائے میرے پاس ٹھہریں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیکن اب میرے یہاں ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں انشاء اللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

اگلی صبح دلی سے روانہ ہوتے وقت معظم علی نے لال قلعے کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا کی۔ "مولائے کریم! میری قوم کی بے بسی تیری رحمت کو پکار رہی ہے۔ ہمیں ان افراد کی بد اعمالیوں کی مرزا دے جن کی حیرت دہشتوں کے باعث ہماری عزت و آزادی کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ لال قلعہ کی دیواریں اس دہلے عظیم کی راہ دیکھ رہی ہیں جو ہماری عزت اور بقا کے دشمنوں سے روکنے کی ہمت رکھتا ہو۔ یہ باموسی اور بے بسی ہماری میراث ہے اور آج ہمیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے

بند قین پھینک کر تواریں نکال لیں اور ان کا پیچھا کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کے اندر میدان خالی ہو چکا تھا اور مرہٹے وادی کے شیب کے گھنے جنگل میں روپوش ہو چکے تھے۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کو گھوڑے لانے کا حکم دے کر بھاگتا ہوا معظم علی کے پاس پہنچا۔ قافلے کے محافظ اب اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ معظم علی کچھ دیر ان کے ساتھ بائیں کرنے کے بعد قافلے کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر سرخ و سفید رنگ کا ایک ادھیڑ عمر آدمی پتھر کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "تھوڑی دیر پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ خدا اگر ہمیں ان ظالموں سے بچانا چاہتا ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے آسمان سے فرشتے بھیج سکتا ہے اگر آپ فرشتے نہیں تو میں آپ سے متعارف ہونا چاہتا ہوں۔ میرا نام فخر الدین ہے اور میں اس قافلے کے ساتھ حیدر آباد جا رہا تھا۔"

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میرا نام معظم علی ہے اور یہ میرے دوست اکبر خاں ہیں اور ہماری منزل بھی حیدر آباد ہے۔ ہمیں انوس ہے کہ ہر وقت پتہ پہنچ سکے روز اتنی جائیں ضائع نہ ہوتیں۔" فخر الدین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: "تم شہیدوں کی قبریں کھودنے کا انتظام کرو اور زخمیوں کو ایک جگہ جمع کرو۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا: "آپ کے باقی آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ اس پہاڑی کے پیچھے اپنے گھوڑے لینے گئے ہیں۔" قافلے کی عورتیں اور بچے کھنڈر و زخموں اور بھاڑوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ دوڑکیاں بھاڑوں سے باہر نکلیں اور بھاگتی ہوئی فخر الدین کی طرف بڑھیں۔ بڑی لڑکی جس کے ہاتھ میں بندوق تھی فخر الدین کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گئی اور دوسری جس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوئی تھی "ماہوں بانا"

زمین پر دھڑکتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا۔ حملہ آوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ تھی لیکن قافلے کی طرف سے لڑنے والے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔ معظم علی مڑ کر بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور اس نے کہا: "اس پہاڑی کے پیچھے وادی میں ایک قافلہ گھرا ہوا ہے، تم میں سے دو آدمی گھوڑوں کے پاس رہیں۔ اکبر خاں تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ اس چوٹی سے ذرا نیچے پتھروں اور بھاڑوں کی آڑ میں چھپے رہو۔ میں باقی آدمیوں کے ساتھ دائیں طرف سے چکر کاٹ کر دوسری پہاڑی پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بندی سے ہماری گولیاں حملہ آوروں کے لیے کافی پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے بدحواسی کی حالت میں پیچھے ہٹیں گے لیکن تمہاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اس پہاڑی کی طرف نہ آسکیں۔ تمہاری گولیوں سے پریشان ہو کر اگر وہ وادی کی بائیں طرف پسا ہونے کی کوشش کریں تو سمجھ لینا کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اگر تم نے انھیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہماری تعداد بہت کم ہے تو ممکن ہے کہ وہ چند منٹ کے اندر اندر پسا ہو جائیں اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ کے بعد قافلے کے ساتھ آدمی ہلاک اور گیارہ زخمی ہو چکے تھے اور مرہٹے ان پر ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے، اچانک ان کے عقب میں پہاڑی کی چوٹی سے گولیوں کی بوجھاڑ آئی اور سات آدمی گر پڑے۔ مرہٹے بدحواس ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ پھر دوسری پہاڑی کے دامن سے اکبر خاں اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلائیں اور چھ آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ مرہٹے اپنے دونوں طرف پہاڑیوں کو خطرناک سمجھ کر وادی کے درمیان سٹپے لگے۔ قافلے کے محافظ حیران ہو کر اپنے دائیں اور بائیں دونوں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بلند آواز میں چلایا: "تم کیا دیکھ رہے ہو، اب حملے کا وقت ہے۔ دشمن پسا ہو رہا ہے۔ قافلے کے محافظوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور دشمن پرانہ تھکنا نعرہ لگ کر شروع کر دی۔ پھر چند آدمیوں نے

ہموں جان !! کہتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار فخر الدین کے ساتھ لپٹ کر سکیا  
لینے لگی۔ معظم علی نے بڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور وہ بدعاس ہو کر اپنا نقاب درست کرنے لگی  
معظم علی نے دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کی تاہم چند ثانیے ایک حسین  
اور دلکش تصویر اس کی نظروں کے سامنے پھرتی رہی۔

فخر الدین نے چھوٹی لڑکی سے کہا: "بلقیس! بیٹی جاؤ اپنی ماں کے پاس بیٹھو اور  
عطیہ کو بھی تسلی دو کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ خدا نے ہمارے مدد کے لیے فرشتے بھیج  
دیئے ہیں۔"

"فرشتے؟" بلقیس نے حیران سی ہو کر کہا: "فرشتے کہاں ہیں؟"  
فخر الدین نے مسکرا کر معظم علی اور اکبر خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب  
دیا: "یہ فرشتے نہیں تو اور کیا ہیں؟"

بلقیس نے حیران اور شکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھا  
اور اس کی نگاہیں اکبر خاں کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اکبر خاں اسے پچ ایک  
فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی بہن کی طرف بڑھی اور فخر الدین نے معظم علی  
کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ان کا باپ فوت ہو چکا ہے۔ انہیں نہیں  
دلی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ان دونوں دلی میں داخل ہونا معمولی بات نہیں لیکن خوش قسمتی  
سے پونا کے ایک ہندو تاجر کے ساتھ میرے کاروباری تعلقات تھے اور اس نے مرہٹہ  
حکومت سے میرے لیے پرواز راہ داری حاصل کر کے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ ہماری  
خوش قسمتی تھی کہ دلی سے واپسی پر راستے میں ہمیں یہ توفیق مل گیا۔ یہ لوگ شمال کے شہروں  
سے تلاش روزگار کے لیے حیدرآباد جا رہے تھے۔ چلیے رنجیوں کو دیکھیں؟"

معظم علی شام سے پہلے ایک منزل اور طے کرنا چاہتا تھا لیکن قافلے کی حفاظت  
کے خیال سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

رات قدرے خشک تھی۔ غشاہ کی ناز کے بعد قافلے کے پڑاؤ میں جگہ جگہ الاؤ محل  
رہے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان کے گرد جمع تھے۔ چند مسلح  
آدمی پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں ایک چھوٹے سے  
خیمے کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں اور خیمے سے چند قدم دور فخر الدین، معظم علی، اکبر خاں اور  
چند آدمی ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک آدمی نے کہا: "حیدرآباد پہنچ کر ان مٹیوں اور ہواؤں کا کیا بنے گا جن کے  
سرپرست لڑائی میں مارے جا چکے ہیں؟ ہم سب کو مل کر ان کا بوجھ اٹھانا چاہیے؟"  
فخر الدین نے کہا: "آپ میں سے کسی کو ان کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔  
حیدرآباد میں ان کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہوگی۔"

فخر الدین سے چند سوالات پوچھنے پر معظم علی کو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تاجروں  
کے ایک بائرا اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور چند سال قبل دلی سے ہجرت کر  
کے حیدرآباد دکن میں آباد ہو چکا ہے اور اس کا تجارتی کاروبار دکن سے میسور اور کرناٹک  
تک پھیلا ہوا ہے۔

جب معظم علی نے فخر الدین کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت  
بیان کی تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "آپ پریشان  
نہ ہوں۔ اگر آپ کے عزیز حیدرآباد میں ہیں تو میں وہاں پہنچنے ہی ان کا یہاں کر دوں گا جیسا کہ  
میں آپ میرے مہمان ہوں گے۔"

مختصری دیر بعد چند آدمی الاؤ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس چلے گئے  
اور باقی وہی الاؤ کے قریب سو گئے۔ فخر الدین دیر تک معظم علی سے باتیں کرتا رہا۔ پتہ  
بنگال کے حالات زیر بحث آنے اور معظم علی نے میر جعفر کی کٹھ پتلی حکومت کے



مستقل اپنے آثارات بیان کیے اس کے بعد اودھ، روہیکھنڈ اور دہلی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ بالاخر دکن کا ذکر کیا اور غفر الدین نے کہا: ”دکن ان دنوں شمال اور مشرق سے ہجرت کرتے والے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ دہلی کی قدیم شان و شوکت اب آپ کو حیدرآباد میں دکھائی دے گی لیکن میں دکن کے مستقبل کے متعلق زیادہ پر امید نہیں بلکہ ناکام کی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اثر و رسوخ اب دکن کے دربار میں بھی پہنچ چکا ہے۔ دوسری طرف مرہٹے بڑی تیزی سے منظم ہو رہے ہیں اور وہ صرف دکن پر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بیرونی خطرات کا سامنا کرنے کے لیے دکن کے پاس وسائل کی کمی نہیں لیکن نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد گزشتہ چند سال میں اس کے بیٹوں کی خانہ جنگی نے مسلمانوں کے اس عظیم دفاعی حصار کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس وقت یہ کشاکش ہے کہ دکن کی عثمانی سازشوں کا بالاخر نتیجہ کیا ہوگا لیکن میں جس شخص کی کامیابی سے ڈرتا ہوں وہ میر نظام علی ہے۔ اس نے اپنے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ لڑایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جس دن دکن کی حکومت اس کے ہاتھ میں آئے گی وہ قوم کے لیے بنگال کے میر جعفر اور کرناٹک کے محمد علی والا جاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ وہ انگریزوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں جنوب کے مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس بھی نہیں ہوں۔ ہمارے پڑوس میں ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے۔ اگر میرے اندازے غلط نہیں تو ہم بہت جلد گیدڑوں اور بھیڑیوں کی شکار وگا ہوں میں ایک شیر کی گرج سنیں گے۔ میں ایک ایسے آدمی سے مل چکا ہوں جو ایک بیدار مغز سیاستدان بھی ہے اور ایک اولوالعزم سپاہی بھی!“

اکبر خان، جو معظم علی کے قریب بیٹھا اٹکھ رہا تھا۔ اچانک چونک اٹھا۔ ”جی وہ کون ہے؟“

”آپ اسے نہیں جانتے لیکن اگر وہ چند برس زندہ رہا اور قدرت نے اس کی مدد کی تو وہ جنوب کے مسلمانوں کا آخری محاذ ثابت ہوگا۔ اس کا نام حیدر علی ہے اور اس وقت وہ میسور کی فوج کا ایک افسر ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب انگریز اور مرہٹے اسے اپنا ایک طاقت ور اور خطرناک حریف سمجھیں گے۔ ابھی جب آپ مجھے بنگال میں اپنی سپاہیانہ زندگی کے واقعات سن رہے تھے تو میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی دن آپ کی آخری منزل میسور ہوگی۔ میں اس سے دوبارہ مل چکا ہوں اور یقین کیجیے کہ میں اپنی زندگی میں کسی اور شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ آپ کی طرح وہ ان طالع آزمادوں کو شک کا بدترین سمجھتا ہے جو انگریزوں کے ساتھ اپنا سیاسی مستقبل وابستہ کر چکے ہیں۔“

معظم علی نے کہا: ”اگر اس کے عوام اس قدر بلند ہیں تو ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو اپنے برمن کا سر کاٹ کر دشمن کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔“

پاس ہی نیچے نیچے اندر عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں دن بھر کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں عطیہ نے کہا: ”امی جان! ماموں جان ساری رات باہر بیٹھے رہیں گے؟“

”وہ آجائیں گے بیٹی۔ تم اب سو جاؤ!“

بلقیس نے ذرا آگے مرک کر عطیہ کے کان میں کہا: ”آپا جان آپ نے فرشتے دیکھے ہیں؟“

”نہیں۔ لیکن تمہیں اس وقت بیٹھے بیٹھے فرشتوں کا خیال کیسے آیا؟“

”اس لیے کہ میں نے آج فرشتے دیکھے ہیں۔ دو فرشتے۔ ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور اس وقت وہ ماموں جان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ دیکھیے اُدھر! یہ کہتے ہوئے بلقیس نے نیچے کے دروازے کا پردہ اٹھا دیا۔

ماں نے کہا: ”پگلی اب آرام سے سو جاؤ۔ انھوں نے ہماری جان بچائی ہے اور



تم ان کا مذاق اڑا رہی ہو۔

”میں مذاق نہیں کرتی امی جان! ماموں جان کہتے تھے وہ فرشتے ہیں۔“  
”انھوں نے بالکل درست کہا۔ اگر یہ لوگ خدا کی رحمت کے فرشتے بن کر نہ آتے تو اس وقت ہماری لاشیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔“



اگلی صبح یہ قافلہ دہاں سے روانہ ہوا۔ کوئی چار کوس چلنے کے بعد یہ لوگ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ چند زخمی گھوڑوں پر سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ فخر الدین کی درخواست پر گاؤں کے زمیندار نے معقول کرائے پر سات میل گاڑیاں میا کر دیں۔ زخموں کے علاوہ قافلے کی چند عورتیں اور بچے جو گھوڑوں پر طویل سفر کرنے سے تنگ آئے تھے بیل گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ایک گاڑی میں فخر الدین کی بہن اور بھانجیاں بیٹھ گئیں۔ گاؤں کے لوگوں سے استفسار پر معظم علی کو یہ معلوم ہوا کہ مرہٹہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں یہ لوگ کہیں باہر سے آئے ہیں اور وہ دن قبل اس گاؤں سے دس کوس شمال کی طرف ایک چھوٹے سے شہر کوٹ چکے ہیں۔ اگلے منزل پر ایک زخمی نے جس کی حالت بہت نازک تھی دہ توڑ دیا۔ اس کے دو دن بعد ایک اور زخمی چل بسا۔

حیدر آباد پہنچتے پہنچتے معظم علی قافلے کے ہر بچے اور بوڑھے کی نگاہ میں ایک بڑے بن چکا تھا۔ مسلح آدمی اسے اپنا کمانڈر تصور کرتے تھے۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے وہ ایک سعادت مند میثا اور نوجوانوں اور کمسن بچوں کے لیے وہ ایک شقیق بھائی بن چکا تھا۔ بلقیس کبھی کبھی گاڑی کا پردہ سرک کر اکبر کی طرف دیکھتی اور عطیہ کے کان میں کہتی: ”اپا جان وہ یقیناً گسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کبھی کبھی وہ پیدل چلنے کے بہانے گاڑی سے کود پڑتی اور پھر بتوری دور بھاگنے کے بعد فخر الدین سے کہتی ماموں جان“

میں گھوڑے پر سواری کروں گی اور فخر الدین کے ذکر اسے گھوڑے پر سوار کرا دیتے۔ پھر وہ اکبر خاں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتی۔ حیدر آباد بھی یہاں سے کتنی دور ہے؟ آپ نے ہمایوں کا مزار دیکھا ہے؟ لال قلعہ اور جامع مسجد دیکھی ہے؟ ماموں جان کہتے تھے کہ آپ شیر کا شکار کھیلا کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے ابھی بھی مارا ہے؟ ایک دن اس نے بڑے بھولے پن سے کہا: ”بھلا یہ درست ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟“

اکبر خاں اس سوال پر ہنس پڑا اور بقیس کا معصوم چہرہ حیلے سے ممتا اٹھا۔ ”کیا بات ہے اکبر؟“ معظم علی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ یہ پوچھتی ہے میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں؟ معظم علی نے کہا: ”اس میں اس کا قصور نہیں۔ ام جکل دلی کا ہر شیر آدمی یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“

بلقیس کو اکبر خاں کی ہنسی اور اس سے زیادہ معظم علی کی مداخلت پسند نہ آئی اور اس نے مڑ کر ایک نوکر کو آواز دی۔ ”یہ گھوڑا سنبھالو میں گاڑی بڑھاتی ہوں۔“ جب وہ گھوڑے سے اتر کر گاڑی پر سوار ہو رہی تھی تو عطیہ نے بڑھ کر کہا: بس گھوڑے کی سواری کا شوق پورا ہو گیا؟

بلقیس کچھ دیر مزہ بسور کر بیٹھی رہی۔ بالاخر اس نے کہا: ”اپا جان وہ دونوں گنوار ہیں!“ عطیہ ہنس پڑی لیکن ماں نے ڈانٹ کر کہا: بڑی بد زبان ہو تم!“ صفوڑی دیر بعد عطیہ نے اس کے کان میں کہا: ”چریل سچ بتا دیا کیا بھائی تم نے اس سے؟“

”میں نے اسے کیا کہا تھا!“

”اچھا تمہارے بادشاہ سلامت کو بلا کر یہ کہوں کہ حکم عالیہ خفا ہو کر بیل گاڑی پر“

سوانہ ہو گئی ہیں۔

”امی جان! بقیس نے احتجاج کے لمحے میں کہا: ”اپا جان مجھے گالیاں دیتی ہیں۔“

ماں نے کہا: ”عطیہ چھوڑو اسے تنگ نہ کر دو۔“



حیدر آباد پہنچ کر معظم علی نے فخر الدین کی جوشن و شوکت دیکھی وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ دو منزلہ رہائشی مکان کے ساتھ اس کا جہان خانہ اس قدر وسیع تھا کہ وہاں بیک وقت سو مہمان ٹھہر سکتے تھے۔ جہان خانے کے ساتھ اس کا وسیع دفتر تھا جہاں آٹھ دس منشی کام کرتے تھے۔ وہ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ اسلحہ، بارود، ریشم، صندل اور گرم مسلے کی تجارت کرتا تھا۔ گلی کی دوسری طرف ایک وسیع حویلی میں اصبطل اور گدام تھے۔ جب یہ قافلہ حیدر آباد پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ فخر الدین کا ایک نوکر چند گھنٹے پہلے گھر پہنچ کر اس کی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔ اس کے نوکر جہان خانے کی نجی منزل میں قافلے کے لوازمات بچوں، عورتوں اور بے سہارا آدمیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر چکے تھے۔ معظم علی اور اکبر خاں کو بالائی منزل میں جگہ دی گئی اور ان کے نوکر فخر الدین کے نوکروں کے ساتھ دوسری حویلی میں چلے گئے۔ قافلے کے بانی لوگ حیدر آباد میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو رخصت پکے تھے۔

رات کے وقت اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد فخر الدین نے معظم علی سے کہا: ”اب آپ آرام سے سو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ علی الصباح آپ میرے علاوہ جس دوسرے آدمی کو پہنے دیکھیں گے، وہ مرزا حسین بیگ کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔“

معظم علی نے کہا: ”لیکن حیدر آباد بہت بڑا شہر ہے۔ آپ اتنی جلدی کیسے پتہ لگا لیں گے؟“

فخر الدین نے جواب دیا: ”آپ اطمینان رکھیں۔ میرے پاس ڈیڑھ سو نوکر ہیں اس

کے علاوہ میں ابھی شہر کے کو توڑال اور فوج کے چیدہ چیدہ افسروں کے پاس چلتا ہوا، اگر مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار حیدر آباد میں ہیں تو انہیں تلاش کرنے کے لیے ایک رات کافی ہے۔“

تھکا دہ سے چور ہونے کے باوجود معظم علی کو دیر تک نیند نہ آئی۔ پھر صبح جب اس کی نیند کھلی تو سورج کافی اوپر آچکا تھا۔ کمرے میں دوسرے بستر پر اکبر خاں ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ فخر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: ”مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار مل گئے ہیں وہ صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے بھی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے، میں نے جگنا مناسب نہ خیال کیا۔ اب چلیے وہ نیچے بیٹھک میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

میری نیند اس قدر اہم نہ تھی، معظم علی نے شکایت کے لمحے میں کہا: ”انھوں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟“

فخر الدین نے مفہوم لمحے میں جواب دیا: ”انھیں مرزا حسین بیگ کے بچوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

معظم علی ایک تانیے کے لیے لٹے ہوئے مساذکی طرح فخر الدین کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے افسوس ہے۔ فخر الدین نے کہا: ”چلیے!“

معظم علی، فخر الدین کے ساتھ نیچے، ترکر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔ تین عربیہ آدمی اور پانچ فوجی قایلین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ معظم علی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ معظم علی نے یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کے سامنے قایلین پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”میرا خیال تھا کہ مرزا حسین بیگ کے بچے حیدر آباد پہنچ گئے ہوں گے۔ مرشد آباد چھوٹے کے بعد وہ کھنکھنی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کی تلاش میں لکھنؤ پہنچا تو وہاں سے ان کے رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے۔ مرزا صاحب کے متعلق مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا میں

سی تھی جس کے سامنے کوئی منزل یا راستہ نہ ہو۔ اسے حیدر آباد کی پردہ نشین محلیاں اور بازار سنان نظر آتے تھے۔ فخر الدین، مرزا حسین بیگ کی بیوی اور صاحبزادی کا پتہ دینے والے کو پانچ سو اشرافیاں انعام دینے کا اعلان کر چکا تھا اور شہر میں منادی کرنے والے گلی گلی گھوم رہے تھے لیکن فرحت اور اس کی ماں کا کوئی مراءغ نہ ملا۔

اکبر خاں کے لیے حیدر آباد کا پردہ نشین شہر ایک بہت بڑا عجائب گھر تھا وہ صبح سویرے اٹھتا اور کسی نوکر کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ اسے حیدر آباد کی فوجی تربیت گاہ میں نو جوان افسروں کی نیزہ بازی، شہسواری اور چوگان کے کھیل بہت پسند تھے کبھی وہ فخر الدین کے اصطبل میں جاتا اور کسی شوخ اور تند گھوڑے پر سوار ہو کر سر کے لیے چلا جاتا۔ اسے معظم علی کے رنج و کرب کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن معظم علی کے ساتھ بیکار بیٹھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اکثر یہ کہتا۔ "بھائی جان! آج فلاں جگہ نیزہ بازی ہو رہی ہے۔ آج فلاں میدان میں فرج کے افسر چوگان کھیل رہے ہیں۔ آج فخر الدین کے اصطبل میں چند نئے گھوڑے آئے ہیں، چلیے آپ کو دکھاتا ہوں!"

معظم علی کبھی کبھی دل پر جبر کر کے اس کا ساتھ دیتا لیکن عام طور پر اس کا یہی جواب ہوتا۔ "اکبر تم جاؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"



ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اکبر خاں کہیں باہر گیا ہوا تھا اور معظم علی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے سامنے طویل برآمدے کا ایک سرراہشی مکان سے ملا ہوا تھا، اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور معظم علی کمرے سے ایک کرسی نکال کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دائیں ہاتھ برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھلا اور طعیں جھنجکوتہ شرباتی ہوئی آگے بڑھی۔

فیض آباد، اگر وہ روٹی کے علاوہ کئی اور شہروں میں انھیں تلاش کر چکا ہوں۔

ایک عمر سیدہ آدمی نے کہا، لکھنؤ میں ان کا رشتہ دار میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا میں مرزا صاحب کا ماموں زاد بھائی ہوں لیکن برستی سے میں پلاسی کی جنگ سے پہلے لکھنؤ چھوڑ کر یہاں آچکا تھا۔

معظم علی نے پوچھا۔ "آپ ارشد بیگ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ میں سے عبدالکرم کون ہیں؟"

دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ "میں ہوں لیکن مجھے بھی مرزا حسین بیگ کی بیوی اور روٹی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں آتے اور ہمیں نہ ملے۔" تیسرے آدمی نے معظم علی سے سوال کیا۔ "آپ محمود علی خاں کے بیٹے ہیں؟"

"جی ہاں۔" معظم علی نے معلوم کیے میں جواب دیا۔

اس نے کہا۔ "میں شوکت بیگ کا باپ ہوں۔"

معظم علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

"مجھے پلاسی کی جنگ سے چند ہفتے بعد ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ میں نے بنگال چھوڑتے

وقت مرشد آباد میں مرزا حسین بیگ کا پتہ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے اور وہاں جا کر بھی میں نے انھیں تلاش کیا تھا۔"

معظم علی نے سبب بتائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ڈھاکہ جا کر ان کا پتہ کروں گا۔"



مرزا حسین بیگ کے رشتہ داروں سے ملنے کے بعد معظم علی کی حالت اس مآز کی

”بلقیس! معظّم علی نے اس کی طرف دیکھ کر پیادے کہا۔“ میں نے تمہیں  
کل سے نہیں دیکھا۔ کہاں غائب تھیں تم؟“

بلقیس نے جواب دیا۔ ”کل آیا جان کو بخار تھا اور میں ان کے پاس تھی۔“  
اب کیسی ہیں وہ؟“

”اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ امی جان پوچھتی ہیں، آپ کی طبیعت ٹھیک  
ہے نا؟“

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”ماں جان کہتے تھے کہ آپ یہاں سے بہت جلد چلے جائیں گے؟“

”ہاں! میرا اڑوہ ہے کہیں اگلے ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔“

”نہیں آپ زجائیں! بلقیس نے منسوب کر کہا۔“ اگر آپ یہاں ٹھہریں تو آپ

کے رشتہ دو ہر دو مل جائیں گے۔ میں ہر روز یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ کے رشتہ دار آپ  
کو مل جائیں۔ امی جان اور آپا جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کرتی ہیں اور میں بھی دعا کیا  
کرتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں۔“

معظّم علی مسکرایا۔ ”بلقیس تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میرے لیے حیدر آباد ٹھہرنے  
کی دعا نہ کیا کرو۔“

”کیوں آپ کو حیدر آباد پسند نہیں؟“

”حیدر آباد بہت اچھا شہر ہے لیکن میں یہاں ایک مسافر ہوں۔“

بلقیس نے ایسے جوکر کہا۔ ”آپ کو گھریا دے گا؟“

”میرا کوئی گھر نہیں۔ معظّم علی نے جواب دیا۔“

”تو پھر آپ یہاں کیوں نہیں رہتے؟“

”میں کھنڈر چاہتا ہوں۔“

بلقیس نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ماں جان اگئے!“  
معظّم علی نے صحن کی طرف دیکھا۔ فخر الدین ایک پیراں اٹھائے سیڑھیوں کی طرف  
بڑھ رہا تھا۔ معظّم علی اٹھ کر کمرے سے دوسری کرسی نکال لایا۔ فخر الدین اور بیچا تو بلقیس ہاں  
سے چلی گئی۔

فخر الدین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”اکبر خاں کہاں ہے؟“

”جی وہ بارش سے تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے صطبل  
میں گھوڑے دیکھ رہا ہوگا۔“

”اے گھوڑوں کا بہت شوق ہے میں اسے عربی نسل کا ایک بہترین جوڑا دینا چاہتا

ہوں۔ بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ اگر آپ اسے میرے پاس چھوڑ دیں تو میں اسے چند برس میں

ایک کامیاب تاجر بنا سکتا ہوں۔ اسے گھوڑوں کی تجارت کا شوق بھی ہے۔“

”یہ شوق اسے اپنے باپ سے ملا ہے۔“

فخر الدین نے قدرے وقفے کے بعد کہا۔ ”میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا  
چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

فخر الدین نے تھوڑی دیر گردن جھکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں

حیدر آباد میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ کسی غم میں گھلے جا

رہے ہیں۔ آپ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں قدرت نے پہاڑوں کے سینے چیرنے کی

ہمت عطا کی ہے۔ زندگی سے آپ کی یہ بیزاری بڑی افسوسناک ہے۔ میں ابھی پہ سالہ

سے مل کر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے آپ کی سرگزشت

سننے کے بعد یہ کہا تھا کہ اگر ایسا نوجوان حیدر آباد کی فوج میں شامل ہونا پسند کرے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ آپ کو بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کا مستقبل بہت روشن ہوگا اور آپ اپنی اداس اور مغموم زندگی میں نئی دلچسپیاں تلاش کر سکیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا: زندگی کے ساتھ میری دلچسپیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں لیکن یہ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں آئندہ فوج کی ملازمت نہیں کروں گا۔ میرے لیے اپنے ان عزیزوں اور دوستوں کی بے مقصد قربانیوں کی یاد کافی ہے جن کا خون بنگال کی خاک میں جذب ہو چکا ہے۔

فخر الدین نے پھر تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے اور شاید آپ کو بھی عجیب معلوم ہو لیکن ہم جس درد سے گزر رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قدیم رزم درواج کی دیواریں توڑ رہا ہے۔ میری اور مجھ سے زیادہ میری ہمیشہ کی خواہش ہے کہ آپ کو ان کی بڑی لڑکی کا شریکِ حیات بنادیا جائے اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ نے ہماری جانیں بچائی ہیں بلکہ اس لیے کہ میں اپنی یتیم بھانجی کے لیے آپ جیسا نیک اور قابلِ اعتماد رفیقِ حیات تلاش کر لینا قدرت کا ایک انعام سمجھتا ہوں اور اپنی بھانجی کے متعلق اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک نیک ماں اور شریف باپ کی بیٹی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ میں اس کے لیے کسی ریاست کے مالک کا دروازہ کھٹکھٹا سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اسے اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ آپ جیسے سلیم الغفلت انسان کے ساتھ ایک جھوٹے میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے گی۔

معظم علی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فخر الدین کی طرف دیکھا اور ابدیدہ ہو کر کہا: "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے رستے زمین کے تمام پہاڑ اٹھا کر

میری گردن پر رکھ دیئے ہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ دنیا آج بھی فرشتوں کے وجود سے خالی نہیں لیکن میں اس مسئلے میں بے بس ہوں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زبان سے انتہائی دیانت دارانہ جواب بھی شرافت اور انسانیت کا مزہ نہ چھنے کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں: یہ چند برس کی بات ہے۔ میرا ایک دوست جو مجھے بھائی کی طرح عزیز تھا، لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد میری گود میں سر رکھ کر دم توڑ رہا تھا۔ اس دنیا میں اسے اپنی ایک بہن سب سے زیادہ عزیز تھی اور اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ میں اس کے مستقبل کا این بنوں۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ گڑیا کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے بھائی کی آخری خواہش پوری ہوگی لیکن کچھ عرصہ بعد میں گرفتار اور پھر مرہٹوں کی قید سے نکل کر گھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اس کے بعد دنیا میرے لیے تاریک ہو چکی تھی، پھر ایک دن ایسا ہوا جب میں اور اس لڑکی کا منگیترا ایک ہی محاذ پر مرہٹوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے کسی بات میں کم نہ تھا اور ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن چکے تھے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اس کے ہونے والے شوہر کے لیے اپنے دل میں ایک بھائی کی شفقت محسوس کرتا تھا۔ یہ نوجوان ایک لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ہمارے والدین ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے ہی تھے کہ بنگال میں انقلاب آگیا۔

فخر الدین نے متاثر ہو کر کہا اور وہ لڑکی مرزا حسین بیگ کی بیٹی تھی؟

"جی ہاں۔"

"میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد فخر الدین اٹھ کر زنا خانے میں چلا گیا اور معظم علی دیر تک وہیں

بیٹھا رہا۔ معظم علی نے عطیہ کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا۔ تاہم اس کی معمولی جھبک بھی کسی نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی تھی لیکن معظم علی کے پہلو میں وہ دل نہ تھا۔ عطیہ بہت کچھ تھی لیکن وہ فرحت نہ تھی۔

”فرحت! فرحت!“ وہ اپنے تصور میں اسے آوازیں دیتا ہوا اٹھا اور کمرے کے اندر جا کر لیٹر پر گر پڑا۔ ”فرحت! فرحت!“ تم کہاں ہو؟ کاش میری آواز تمہارے کاؤن تک پہنچ سکتی!“

اگلے روز رات کے وقت معظم علی اور اکبر خاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، فخر الدین اندر داخل ہوا اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔ ”معظم علی! حیدر آباد کی فوج میں ملازمت کے متعلق تم میری تجویز رد کر چکے ہو لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں بیکار بیٹھ کر چین نصیب نہیں ہوگا۔ اگر تم تجارت شروع کرنا چاہو تو میں تمہیں اور اکبر خاں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ شریک ہونا پسند نہیں کرتے تو میں تمہیں بڑی خوشی سے قرض حسنہ کے طور پر ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم جب چاہو مجھے واپس کر دینا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی کام میں تمہارا جی لگ جائے۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”تجارت کے متعلق میں بھی چند دنوں سے سوچ رہا ہوں لیکن ہے کہ میں یہیں سے ابتدا کر دوں اور کھنٹو جاتے ہوئے اپنے ساتھ چند گھوڑے لیتا جاؤں اور سرنے کے لیے میں آپ کو تکلیف دینا پسند نہیں کر دوں گا۔“

”لیکن سرنے کے بغیر تو تجارت نہیں ہوتی۔“

”سرا یہ میرے پاس کافی ہے۔“ معظم علی نے یہ کہتے ہوئے اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر کمرے کے ساتھ بندھی ہوئی پٹیلی نکالی اور اس میں سے ایک بیڑا نکال کر فخر الدین کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے خیال میں اس کی قیمت کیا ہوگی؟“

فخر الدین نے چراغ کی روشنی میں میرے کوالٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ ”اگر آپ کے پاس

اس قسم کے آٹھ دس اور میرے ہوں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ مکھنوں کے امیر ترین آدمی ہیں۔“

معظم علی نے کہا۔ ”اس پٹیلی میں تیس ہیرے اور میں لیکن مجھے ان کی کوئی پہچان نہیں۔ میں نے ایک ہیرا جو اس سے ذرا چھوٹا تھا، مکھنوں میں بارہ سو اٹھرنی کے عوض بیچا تھا اور اس ہیرے کو فروخت کرنے کے لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔“

”مکھنوں میں آپ کو کسی نے ٹھگ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ہیرے کے عوض مجھے آپ کو پانچ گنا زیادہ دلا سکوں گا۔“

معظم علی نے اس کے ہاتھ میں پٹیلی دیتے ہوئے کہا۔ ”انہیں بھی دیکھ لیجیے۔“

فخر الدین نے پٹیلی اپنی پٹیلی پر لٹنے کے بعد کہا۔ ”یہ ہیرے بہت قیمتی ہیں لیکن آپ نے اسے کہاں سے؟“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”یہ آبا جان کو سراج الدولہ کا آخری انعام تھا۔“

فخر الدین نے کہا۔ ”اب مجھے مہمان خانے پر پیرا لگانا پڑے گا۔ آپ نے کسی اور کو تو نہیں بیایا؟“

”نہیں۔“

”آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔“



## بارہواں باب

ایک صبح صابو شیرعلی کے لیے ناشتا تیار کر رہا تھا کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کسی نے آواز دی۔ ”صابر، صابر، صابر دروازہ کھولو!“

صابر نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو اس کے سامنے دلا درخان گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ صابر نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ ”معظم علی خاں کہاں ہیں؟“

”وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔“ دلا درخان سے صحن میں پاؤں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”صابر! کون ہے؟“ مکان کے ایک کمرے سے شیرعلی کی آواز سنانی دئی۔

”جی دلا درخان آگیا ہے۔“

شیرعلی جلدی سے باہر نکل آیا۔ صابر دلا درخان سے کئی سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ پر گھوڑے کی باگ دے کر جلدی سے آیا۔ بڑھا اور شیرعلی سے بی طلب ہو کر بولا۔ جناب خاں صاحب ارہے ہیں۔ مجھے انھوں نے یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔ وہ اپنے ساتھ اتنی گھوڑے لارہے ہیں۔ اس لیے آپ شہر سے باہر فوراً کوئی ایسا مکان کرائے پر حاصل کریں جہاں گھوڑوں کے علاوہ پندرہ بیس آدمیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہو سکے۔ خاں صاحب نے کہا ہے کہ اگر شہر کے باہر کوئی ایسی کشاہدہ چولی مل جائے جس کے اندر ایک رہائشی مکان بھی ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ اگر کرائے کی بجائے قیمت پر کوئی موزوں جگہ ملتی ہو تو خرید لیں وہ اتنی ہی قیمت ادا کریں گے۔ دہ یہ

کہتے تھے کہ گھوڑوں کی تجارت کے لیے یہیں لکھنؤ میں مستقل طور پر ایک نہایت کشاہدہ مکان کی ضرورت ہے۔“

شیرعلی نے دلا درخان سے چند سوالات پوچھے اور ناشتے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ دن کے تیسرے پہر شیرعلی، دلا درخان کے ساتھ شہر کے مغربی دروازے پر کھڑا معظم علی کا انتظار کر رہا تھا۔ عصر کی نماز کے پھوڑی دیر بعد ٹرک پر ایک قافلے کی جھلک دکھائی دی اور دلا درخان نے کہا۔ ”جناب! وہ آگئے!“

پھوڑی دیر بعد قافلہ کچھ فاصلے پر ٹرک سے اتر کر ایک کھیت میں رگ گیا اور شیرعلی اور دلا درخان تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

معظم علی، شیرعلی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اکبر خان نے اس کی تقلید کی۔ شیرعلی نے آگے بڑھ کر گرگرجی سے ان کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا اور کہا۔ ”آپ کو یہاں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ شہر کی دھڑکاہٹ طرف مصافحات کی ایک بستی میں مجھے ایک بہت کھلی چولی مل گئی ہے۔ چولی کا مالک نہایت شریف آدمی ہے اور اس نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پندرہ بیس دن کے لیے اپنے گھوڑے اور نوکر یہاں رکھ سکتے ہیں اور اس کے لیے میں کوئی کرایہ وصول نہیں کروں گا۔ اس کے بعد اگر مجھے مناسب قیمت مل گئی تو میں چولی آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا چولی کے اندر ایک چھوٹا سا دمنزل مکان بھی ہے جو بالکل نیا ہے۔ ایک طرف چند پرانی کوٹھڑیاں ہیں جو نوکروں کے کام آسکتی ہیں۔ گھوڑے اسی میں کھلے صحن میں باندھنے پڑیں گے اگر چولی کے مالک کے ساتھ ہمارا سودا ہو گیا تو گھوڑوں کے صطل تعمیر کرنے کے لیے اس میں کافی جگہ ہے۔“

معظم علی نے سوال کیا۔ ”آپ نے اس سے قیمت کے متعلق پوچھا ہے؟“

”جی ہاں میں نے پوچھا تھا لیکن وہ براہ راست آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

وہ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے شرکی دوسری طرف ایک بستی میں داخل ہوئے،  
حویلی کا مالک دروازے پر کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کے ساتھ اس کا تعارف کرایا تو  
معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ اس قدر فیاضی سے کام نہ لیتے  
تو ہمیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔"

حویلی کے مالک نے کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ جگہ کسی کام آ رہی ہے،  
یہ حویلی ایک سرائے تھی۔ پہلے یہاں کافی رونق رہا کرتی تھی لیکن اب شہر میں چند نئی سرائیں  
بن گئی ہیں اور مسافر یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ پچھلے سال جب میں نے اسے خریدا تھا تو  
یہ نہایت شکستہ حالت میں تھی۔ میں اسے مرمت کروا چکا ہوں۔ اس کے اندر کام کا صرف  
ایک مکان تھا اور اس پر میں نے بالاخانہ تعمیر کرایا ہے۔ تین چار مہینے میں نے سرائے کا  
کاروبار چلانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کبھی باہر سے کوئی بڑا قافلہ آتا تھا  
تو لوگ مجبوری کی حالت میں ایک آدھ دن کے لیے یہاں اتر پڑتے تھے لیکن اس کے بعد  
وہ شہر میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے سرائے کا کاروبار بند کر دیا۔ آپ کے کاروبار  
کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہوگی اور اگر آپ خریدنا چاہیں تو میں کوئی نفع لیے بغیر فروخت  
کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اندر باہر سے  
اچھی طرح دیکھ لیں!"

"چلیے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" معظم علی سرائے کے مالک کے ساتھ اندر داخل ہوا اور صحن  
میں کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بولا۔ یہ جگہ ہمارے کام آسکتی ہے۔  
آپ قیمت بتائیں!"

"نہیں آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔ آئیے میں آپ کو وہ مکان دکھاتا ہوں۔"  
مالک مکان کے احرا پر معظم علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ پختی منزل کے پانچ کمرے  
دکھانے کے بعد وہ اسے بالاخانہ پر لے گیا۔ وہاں تین کشتہ کردوں کے سامنے ایک باروہ

تھا اور برآمدے کے سامنے کھلی چھت ایک چھوٹے سے صحن کا کام دیتی تھی۔  
معظم علی نے بالاخانے سے حویلی کا جائزہ لینے کے بعد مالک مکان سے کہا۔ "آپ  
سودے کی بات کریں!"  
مالک مکان نے کہا۔ "لیکن جناب اس طرف دیوار کے ساتھ چند کوٹھڑیاں ہیں نیچے اتر  
کر آپ وہ بھی دیکھ لیں۔"

"انہیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس حویلی کا بہت سا حقد  
دوبارہ تعمیر کرنا پڑے گا۔ آپ بلا جھجک قیمت بتائیں!"  
مالک مکان نے جواب دیا۔ "جناب میں آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں۔ میں  
نے سات ہزار میں یہ حویلی خریدی تھی اور قریباً اڑھائی ہزار روپیہ اس پر اور خرچ کر چکا  
ہوں۔ حویلی کا سودا چند آدمیوں کے سامنے ہوا تھا۔ صبح تک میں انہیں بھی آپ کے سامنے  
پیش کر دوں گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو دس ہزار روپیہ دینے کے لیے تیار ہوں  
پانچ سو آپ کا نفع ہوگا۔"

"میں اس پانچ سو کو نفع کی بجائے ایک امیر آدمی کا انعام سمجھوں گا۔ مجھے دس ہزار  
منظور ہے لیکن میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں  
نے یہ حویلی خریدی تھی تو یہاں دو غریب عورتیں رہتی تھیں۔ سرائے کے پہلے مالک نے مجھ  
سے درخواست کی تھی کہ میں انہیں یہیں رہنے دوں وہ بے سہارا ہیں اور گادوں کے ٹوکوں  
کے کپڑے سی کر اپنا پیٹ پالتی ہیں کبھی میری بیوی کچھ مدد کر دیا کرتی ہے جب کبھی یہاں  
مسافر آکر آتے تھے تو انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی اور وہ سارا دن اپنی کوٹھڑی کا دروازہ  
بند کر کے پڑی رہتی تھیں۔ میں نے کوئے کی ایک کوٹھڑی کے سامنے ان کے پردے کے  
لیے ایک چھوٹی سی دیوار بنوا دی ہے۔ وہ نہایت نیک ہیں اور آپ جیسے خدا ترس لوگوں



کی اعانت کی مستحق ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ انہیں وہاں رہنے دیں۔“

معظم علی نے اپنی جیب سے چاندی اور سونے کے چند کے نکال کر حویلی کے مالک کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”انہیں ہماری طرف سے پیش کر دیں اور صبح یہاں تشریف لا کر اپنی رقم وصول کر لیں۔“

اس کے بعد معظم علی، شیر علی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اب گھوڑوں کی دیکھ بھال اور نوکروں کے قیام و طعام کا انتظام آپ کے ذمہ ہے۔ میں اکبر خاں کے ساتھ شہر کے مکان میں جاتا ہوں۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کل ہم یہاں آجائیں گے۔“



اگلے دن معظم علی شہر کے مکان سے اپنا منقر سا سامان اس حویلی میں منتقل کر چکا تھا۔

بالائی منزل کے کمرے وہ اپنی رہائش کے لیے منتخب کر چکا تھا۔ شیر علی بخلی منزل کے ایک کمرے میں اپنا دفتر سجا رہا تھا۔ شہر سے گھوڑوں کے خریدار جو درجہ داروں جمع ہو رہے تھے اور حویلی ایک ابھی خاصی منڈی معلوم ہوتی تھی۔ اس پاس کے بہت سے لوگ صرف گھوڑے دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ صابر سارا دن کھانا پکانے اور برتن صاف کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ جب کبھی فرصت ملتی حویلی کا ایک چکر لگاتا۔ اسے وہ سفید گھوڑے جو اکبر خاں کو فخر الدین نے دیئے تھے، سید پسند تھے اور اس کی پسند کی وجہ یہ تھی کہ اس نے معظم علی اور اکبر خاں کو ان کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کسی دیہاتی کو بازو سے پکڑ کر ان گھوڑوں کے پاس لے جاتا اور پوچھتا: ”تمہارے خیال میں ان گھوڑوں کی کیا قیمت ہوگی؟“ وہ سادگی سے کوئی رقم بتاتا تو صابر بھینچلا اٹھتا۔ ”واہ کیا کہنے تمہاری بچان کے۔ اے اے تو ان کی قیمت

تمہارے سارے گاؤں سے زیادہ ہے۔“

تین دن کے اندر معظم علی بیس گھوڑے فروخت کر چکا تھا۔ جو تھے روز ایک خوش پوش اجنبی اس کے پاس آیا اور اس نے تیس گھوڑے منتخب کر کے ان کی قیمت طے کرنے کے بعد کہا: ”میں یہ گھوڑے بنارس کے راجہ کے لیے خریدنا چاہتا ہوں لیکن گھوڑوں کو بنارس پہنچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ان کی قیمت بھی آپ کو وہیں ادا کی جائے گی۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”مجھے بنارس پہنچانے میں کوئی عذر نہیں لیکن اگر راجہ نے نے یہ گھوڑے پسند نہ کیے تو...؟“

”میں راجہ کا چچا زاد بھائی ہوں۔ اس نے جواب میں کہا۔“

”آپ کب جانا چاہتے ہیں؟“

”کل۔“

معظم علی، شیر علی کی طرف متوجہ ہوا: ”چچا! آپ بنارس جانا پسند کریں گے؟“

”کیوں نہیں۔ میں ابھی جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”بہت اچھا آپ کل ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔“



دو دن بعد کھنٹو میں یہ افواہ گرم تھی کہ دہلی کی سندھیا کی افواج نجیب الدولہ کو مغلوب کرنے کے لیے سہارنپور کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ روسیکھنڈ کے مسلمانوں کے نزدیک نجیب الدولہ ایک بہت بڑے قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اکبر خاں یہ خبر سنتے ہی اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے کر بلا خانے پر معظم علی کے کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی دریچے کے سامنے کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ”اکبر

بیٹھ جاؤ !

اکبر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور معظم علی نے کہا : ہماری ابتدا بہت اچھی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ گھوڑے اتنی جلدی تک جائیں گے۔ میں شیخ فخر الدین کو پیغام بھیج رہا ہوں کہ ہمارے لیے دو سو گھوڑے اور خریدیں۔ ان کا جواب آنے پر مجھے دہاں جانا پڑے گا۔ اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی دلچسپی کی ضرورت ہے۔

اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا : ”بھائی جان ! مرہٹوں کی فوج نجیب اللہ کے تعاقب میں سہارنپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے ابھی یہ خبر سنی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً گھر جانا چاہتا ہوں۔“

”ان حالات میں تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟“

اکبر خاں نے جواب دیا : ”میرے ساتھی گھوڑوں پر زینیں ڈال رہے ہیں۔“

معظم علی نے کہا : ”بہت اچھا تم نیچے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔“

اکبر خاں نے کرسی سے اٹھ کر کہا : ”بھائی جان آپ خفا تو نہیں ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔“

معظم علی نے جواب دیا : ”مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر سننے کے بعد اگر تم فوراً گھر جانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو مجھے یقیناً افسوس ہوتا۔ مجھ سے زیادہ اس بات کا احساس اور کسے ہو سکتا ہے کہ روسلیکھنڈ کے ایک معزز قبیلے کے سردار کی حیثیت میں تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں اور میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ تمہیں میری ضرورت ہے یا میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو میں بن بلائے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

اکبر خاں کرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالافانے سے اتر کر چلی کے صحن میں داخل ہوا تو اکبر خاں

اور اس کے ساتھی گھوڑے پر زینیں ڈال چکے تھے۔ معظم علی کے ایک ہاتھ میں روپوں کی تھیلی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اکبر خاں کے کندھے پر دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا : ”اکبر یہ لو !“

”اس میں کیا ہے؟“ اکبر خاں نے سوال کیا۔

اس میں تمہارے حصے کی کچھ رقم ہے جب دوبارہ ملاقات ہوگی تو ہم اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے۔ اس میں ساٹھ انثرنیاں تمہارے آدمیوں کے لیے ہیں۔ اکبر خاں نے کہا : ”بھائی جان آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ نوکرہوں کے متعلق میں

آپ کو منع نہیں کرتا لیکن اپنے لیے میں ایک کوڑی قبول نہیں کروں گا۔“

معظم علی نے کہا : ”جو لوگ اپنا حق وصول نہیں کرتے وہ غاصبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔“

”لیکن اس تجارت میں میرا کوئی حصہ نہیں۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔“ معظم علی نے یہ کہتے ہوئے سکوں کی تھیلی اکبر خاں کے گھوڑے کی خرمن میں ڈال دی۔

اکبر خاں نے احتجاجاً کہا : ”بھائی جان مجھے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”تمہیں مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ تجارت میں جو نفع کمادو اس کی ایک ایک کوڑی اپنے علاقے کے آدمیوں کو مستحق کرنے پر صرف کروں اس ملک میں صرف روز بلیکھنڈ ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے لوگ برہمنیت، خود غرضی، اور مغلوں کے مکرانوں کی ہوس اقتدار سے آزاد ہیں۔“

اکبر خاں نے لا جواب ہو کر کہا : ”میں آپ کی حکم عدولی کی چانت نہیں کر سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس روپے پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔“

معظم علی مسکرایا : ”تمہیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں تمہیں کوئی غلط کلمہ نہیں دوں گا۔“



اسی دن گیارہ بجے کے قریب ہوتا ہوا منزل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے ایک عورت جو اپنا جسم ایک میلی کپیلی چادر میں ڈھانچے ہوئے تھی، حویلی کے صحن میں داخل ہوئی۔ نوکر صحن میں بندھے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے۔ عورت ایک گھوڑے کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گھوڑے نے اچانک بدک کر اپنے گلے پاؤں اٹھا لیے۔ عورت گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ایک نوکر نے اس کی بدحواسی پر تہقہہ لگایا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کے کونے کی طرف چلی گئی۔

معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور اس نے نوکر کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا: "تمہیں ایک غریب اور بے بس عورت پر ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی اور گھوڑا یہاں کس نے باندھا ہے؟ اسے یہاں سے ہٹاؤ اور راستے سے دوسرے گھوڑے بھی کھول کر ایک طرف باندھ دو۔ یہ کھونٹے بھی یہاں سے اکھاڑ دو!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالا خانے پر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دلا درخاں ایک طشت میں کھانے گرا گیا۔ معظم علی نے کہا: "مجھے بھوک نہیں۔ تم یہ کھانا ان غریب عورتوں کو دے دو جو ہماری حویلی میں رہتی ہیں اور میری طرف سے انھیں یہ کہو کہ آئندہ انھیں دونوں وقت کا کھانا ہمارے لنگر خانے سے ملا کر دے گا۔"

شام کے وقت معظم علی بستی کی چھوٹی مسجد میں نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا کہ حویلی میں نوکروں کا شور مچا رہا تھا۔ معظم علی نے جلدی سے آکر درجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کے ایک سرکش گھوڑے نے کوہد کر ایک نوکر کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ معظم علی نے نوکر کی ٹانگ پر پائے! تھوڑے پٹی باندھی اور کہا: "یہ گھوڑا بہت خطرناک ہوتا ہے بار بارچہ میں کل صبح اس پر تھوڑی کردوں گا۔"

اگلی صبح معظم علی گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو گھوڑا پسینے سے

تر تھا اور اس کی تمام شوخی ختم ہو چکی تھی لیکن جب معظم علی حویلی کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو گھوڑے نے پھر کوئی شرع کر دیا۔ اچانک چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت ڈیوڑھی سے باہر نکلی اور بے خیالی میں گھوڑے کے سامنے آگئی۔ معظم علی نے جلدی سے گھوڑے کی باگ موڑی لیکن بدحواس عورت اُس کے یاچھے ہٹنے کی بجائے گلی کی دوسری طرف جانے کی کوشش میں گھوڑے سے عمرانی اور منہ بے ل گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ گر کر چٹا چور ہو گیا۔ معظم علی نے پوری قوت کے ساتھ باگ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور نیچے کود کر بھاگتا ہوا عورت کے قریب پہنچا وہ بیہوش تھی۔ چادر اس کے سر سے کھسک چکی تھی اور اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک زندگی کی تمام حیات سمٹ کر معظم علی کی آنکھوں میں آ گئیں۔ وہ چلتا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ آتی۔ ساڑھے تین کے ٹوٹے ہوئے تار دوبارہ جڑ چکے تھے اور زندگی کی اداس اور معنوم نمایاں محبت کے نقوش سے لبریز ہو رہی تھیں۔ اندھیری رات کے مسافر کے راستے کا ہر پتھر ایک چراغ بن چکا تھا۔ فرحت! فرحت! اس نے کہا اور پھر کسی توقف کے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اس کی روح مسرت کے ساتویں آسمان پر تھی۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچ کر اس نے فرحت کو چار پانی پر لٹا دیا۔ نوکر جو وہاں جمع ہو چکے تھے، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر ادھر ادھر مٹ گئے۔ معظم علی کی خوشی اب پرلٹانی اور گھبراہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے صابر کو آواز دے کر پانی مانگا۔ صابر پانی کا کٹورا لے آیا اور معظم علی فرحت کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

فرحت نے آنکھیں کھولیں اور معظم علی کی کائنات مسکراہٹوں سے لبریز ہو گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا: "فرحت! فرحت! میں معظم علی ہوں!"

فرحت مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ بالآخر یہ آنسو

اس کی آنکھوں سے اڑ پڑے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا : "میں پہلے بھی ایسے خواب دیکھ چکی ہوں۔"

"ہم دونوں ایسے خواب دیکھ چکے ہیں۔ فرحت ! تم کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟  
"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں گرنے کے بعد مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کب سے یہاں ہوں؟  
مجھے امی جان کے پاس جانا چاہیے۔ وہ بیمار ہیں۔ میں ان کے لیے دودھ لینے جا رہی تھی  
فرحت یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

معظم علی نے کہا : "نہیں بیس رہو۔ میں تمہاری امی جان کو لے آتا ہوں۔"  
"نہیں نہیں آپ دہاں رہ جائیں۔ وہ کوٹھڑی اس قابل نہیں کہ آپ اس میں  
پاؤں رکھیں۔"

معظم علی نے کہا : "فرحت کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو! میں تم کو دلتی سے لے  
کر حیدرآباد تک تلاش کر چکا ہوں۔"

فرحت نے کہا : "میرا خیال تھا کہ اب دنیا میں ہماری کسی کو تلاش نہیں ہوگی کبھی  
میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اس حالت میں شاید آپ ہمیں پہچان بھی نہ سکیں۔ میں  
بیشتر یہ سوچا کرتی تھی کہ آپ کسی دن ضرور آئیں گے جب مامک مکان آپ کی طرف سے روک  
لیے کرایا تھا تو میں نے اس سے آپ کا نام پوچھا تھا۔ اگلے دن میں دروازے کی آڑ میں کھڑی  
باہر جھانک رہی تھی کہ مجھے آپ کی جھٹک دکھائی دی۔"

"اور اس کے باوجود تم نے مجھے اپنا پتہ دینا گوارا نہ کیا؟"

"مجھے یہ پتہ تھا کہ آپ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر مزہ نہیں لیں گے۔ میں سوچتی تھی کہ  
جب میں یہ کہوں گی کہ میں فرحت ہوں تو میری صورت دیکھ کر آپ تعجب لگائیں گے اور  
اپنے نوکروں سے کہیں گے کہ اس بھلی کو جلی سے باہر نکال دو۔ میں نے امی جان سے  
آپ کا ذکر کیا تھا اور وہ یہ کہتی تھیں کہ تم بالکل ہو گئی ہو۔ تمہیں یہ اتنی معظّمی نظر آتا ہے

مجھے اب بھی یقین نہیں اما کہ میں جوت میں ہوں اور آپ مجھ سے اس قدر قریب ہیں۔"  
فرحت بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

معظم علی نے کہا : "فرحت چلو تمہاری امی جان کے پاس چلتے ہیں۔"

فرحت اپنے جسم پر چادر پٹینے کے بعد معظم علی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ نوکر محسن  
میں ایک جگہ جمع ہو کر پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحت  
کو معظم علی کی موجودگی کے سوا اب کسی بات کا احساس نہ تھا۔ وہ خوشی کے مسند میں غوطے  
کھا رہی تھی اور اس کے پاؤں ڈمگھا رہے تھے۔ جوبی کے کونے میں قد آدم ادنیٰ دیوار کے  
ایک چھوٹے سے دروازے سے گزرنے کے بعد وہ تنگ محسن کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے  
کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ فرحت نے آہستہ سے کہا : "آپ یہیں ٹھہریں!"

کوٹھڑی سے ایک نچیت آواز سنائی دی۔ "فرحت تم نے اتنی دیر کہاں کر دی؟"  
فرحت کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں ایک سیلے کھیلے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔  
فرحت نے آگے بڑھ کر بے اختیار سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سرماں کے سینے پر  
رکھ دیا۔

"فرحت ! فرحت ! کیا ہوا بیٹی؟ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے  
کرب انگریجے میں کہا : "خدا کے لیے بتاؤ تمہیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟"

فرحت نے کہا : "امی جان وہ مل گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے  
مجھے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ میں بھلی ہوں۔"

"کون مل گئے ہیں؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"امی جان یوسف علی کے بھائی آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔" فرحت نے گردن اٹھا  
کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور کہا : "بیٹی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہاں

یہ وہ؟

معلم کو ٹھڑی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ کی بیوی کی بے سروسامانی کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ گئے اور اس نے کہا: ”چچی جان میں معلم ملی ہیں۔“ عابدہ بیٹی چھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرحت نے جلدی سے دوسری چارپائی کا میلہ کھینچا بستر لیٹ کر ایک طرف پھینک دیا اور کہا: ”بیٹھ جلیے۔“ معلم ملی نے آگے بڑھ کر عابدہ کی بخش پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”چچی جان آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی طبیب کو بلواتا ہوں۔“ پھر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور عابدہ کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ چھوٹ چھوٹ کر دو رہی تھی۔ معلم ملی نے فرحت سے سوال کیا: ”چچی جان کب سے بیمار ہیں؟“

فرحت نے جواب دیا: ”اباجان کی وفات کے بعد سے ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ پچھلے مہینے ان کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی لیکن اب کوئی دو ہفتے سے پھر بخار رہتا ہے۔“

معلم ملی نے کہا: ”چچی جان یہ کو ٹھڑی آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ آپ چل سکیں گی یا میرے نوکر آپ کی چارپائی اٹھا کر لے جائیں؟“

عابدہ نے کہا: ”بیٹا مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“

”میں آپ کو دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔“

عابدہ نے جواب دیا: ”بیٹا تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو، مجھے یہیں چارہ ہے دو۔“

معلم ملی نے کہا: ”چچی جان میں آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ آپ کچھ دیر بالا خانے میں قیام کریں، اس کے بعد میں شام سے پہلے شہر میں آپ کے

لیے بہترین مکان کا بندوبست کر دوں گا۔ میں نے شہر کے بہترین طبیب کے پاس آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ ٹھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ طبیب کی آمد سے پہلے پہلے آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ میں آدمیوں کو بلاتا ہوں۔ معلم ملی اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن عابدہ نے کہا: ”بیٹا آدمیوں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں چل سکتی ہوں لیکن تم تکلیف کیوں اٹھاتے ہو۔“

معلم ملی نے کہا: ”میرے لیے اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ اس تنگ دنا یک کو ٹھڑی میں پڑی ہوئی ہیں۔ فرحت اٹھو اور اپنی امی جان کو سارا لے کر بالا خانے پر لے چلو۔“

عابدہ نے کہا: ”بہت اچھا بیٹا! لیکن ہم شہر نہیں جائیں گے۔“

فرحت نے کہا: ”اگر آپ ہمیں اس لیے شہر بھیجنا چاہتے ہیں کہ ہمیں بالا خانے پر رہنے سے تپ کے دوستوں اور ہمناموں کو تکلیف ہوگی تو ہمیں یہیں پڑا رہنے دیں۔“

معلم ملی نے جواب دیا: ”مجھے صرف آپ کی تکلیف کا خیال تھا لیکن اگر آپ بالا خانے میں رہنا پسند کریں تو میرا کوئی دوست یا ہمنام آپ کی اجازت کے بغیر اس جگہ میں داخل نہیں ہوگا۔“



ٹھوڑی دیر بعد عابدہ بالا خانے کے ایک کسادہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت اس کی چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اور معلم ملی ان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ عابدہ کے سوالات کے جواب میں معلم ملی نے مختصراً اپنی قید، رہائی اور سفر کے واقعات بیان کیے اور اس کے بعد عابدہ سے اپنی سرگزشت سنانے کو کہا۔

عابدہ نے جواب میں اپنے مصائب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہا: ”بیٹا تمہاری گرفتاری کے بعد ہمارے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ میرا کسی نہ کسی ہاتھ میں

عزت پر لڑنے کی کوشش کرے گا۔ محلے کے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی کہ ہم فردا شہر آباد سے نکل جائیں۔ اگلے دن ہم نے قافلے کے ساتھ مرشد آباد سے ہجرت کی۔ شہر کے دروازے پر میر جعفر کے سپاہیوں نے ہماری تلاشی لی اور ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ ہم سے چھین لیا۔ راستے میں فرحت کے ابا جان بیمار ہو گئے۔ چند دن وہ بیماری کی حالت میں قافلے کا ساتھ دیتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہمارے ساتھ آگرے کا ایک نیک دل حاجر تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب ہمیں مجبوری کی حالت میں ایک بستی میں رکتا پڑا تو اس تاجر نے چند روپے فرحت کے ابا جان کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”آپ کو کھٹو پہنچنے کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی اس لیے اسے قبول فرمائیں۔“ فرحت کے ابا جان نے اس کے اصرار پر یہ روپے لے لیے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بستی کے زمیندار کو ہمارے متعلق بہت تاکید کی۔ زمیندار بھی کوئی نیک آدمی تھا اور اس نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ فرحت کے ابا جان کی وفات کے بعد جب ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا تو ہم اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ دو روز ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارا قافلہ رات کے وقت کھٹو کے قریب پہنچا اور بہت سے آدمیوں نے شہر میں جانے کی بجائے اس سرائے میں قیام کیا۔ ہم بھی یہیں ٹھہر گئے۔ یہاں رات گزارنے کے بعد صبح ہم نے شہر جا کر اپنے رشتہ داروں کا پتہ کیا لیکن ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد جا چکے ہیں۔ ہم سارا دن شہر میں گھومتے رہے لیکن کسی نے ہمارے حال پر توجہ نہ دی۔ شام کے وقت ہم پھر اسی سرائے میں واپس آ گئے۔

اگلے روز میں نے ایک نوکر کو اپنے رشتہ داروں کے نام خط دے کر حیدر آباد روانہ کیا لیکن اس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ حیدر آباد اطلاع پہنچے ہی ہمارا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہماری مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن آج تک ہم ان کی راہ دیکھتے رہے ایک ماہ بعد جب ہماری پونجی

تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہمارا دوسرا نوکر کہیں بھاگ گیا۔ ایک دن سرائے کے مالک نے ہمیں اطلاع دی کہ چند آدمی حیدر آباد جا رہے ہیں اگر آپ اپنے رشتہ داروں کو کوئی خط بھیجنا چاہیں تو وہ پہنچا دیں گے۔ میں نے خط لکھ کر ان کے حوالے کیا لیکن دو ماہ گزر گئے اور اس کا کوئی جواب نہ آیا اور میں یہ سمجھنے لگی کہ اب زمانے کی نگاہیں بدل گئی ہیں اور ہمارے رشتہ داروں نے جان بوجھ کر ہماری طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں اس حالت میں ان کے پاس جاؤں۔

پھر ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انھیں میرا کوئی پیغام نہ ملا ہو اور میں حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن کھٹو سے قافلے کی روانگی سے دو دن قبل مجھے بخار ہو گیا اور مجھے سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ اگر میرے رشتہ داروں کو میری طرف سے کوئی پیغام نہ ملا ہو تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ مرشد آباد جا کر ہمارا پتہ کرتے۔ اس کے بعد انھیں یقیناً یہ معلوم ہوا کہ ہم کھٹو چلے گئے ہیں۔ میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب میں خدا کے سوا کسی کی مدد نہیں تلاش کروں گی۔ سرائے کا مالک ہمارے حال پر بہت مہربان تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت رحم دل تھی۔ وہ ہمارے لیے اس بستی اور کبھی کبھی شہر کی عورتوں سے بھی سلائی کا کام لے آتی تھی۔ جب وہ سرائے پہنچ کر چلا گیا تو ہمیں بہت صدمہ ہوا لیکن سرائے کا نیا مالک بھی ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ کبھی ہمیں دنوں سے یہ سرائے بالکل دیران تھی اور ہمیں یہاں دھشت ہوتی تھی لیکن اس بستی کے لوگ بہت شریف ہیں اور ان کا سلوک دیکھ کر میں نے شہر میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

معظم علی نے کہا: ”چچی جان مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ فرحت نے جان بوجھ کر مجھے اپنا پتہ نہیں دیا اسے معلوم تھا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔“

غائبہ نے جواب دیا: ”بیٹا مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ تم یہاں ہو اور

فرحت کو اس بات کا ڈر تھا کہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوگی اور شاید تم ہمیں پہچان بھی نہ سکو۔

اتنے میں صابر نے دروازے کے پاس اُگر آٹا دی۔ جناب! حکیم صاحب تشریف لے آئے۔

انہیں اوپر لے آؤ! معظّم علی نے کہا۔

فرحت جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک عمر سیدہ طبیب کمرے میں داخل ہوا۔ معظّم علی نے اس کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ طبیب نے عابدہ کی نبض دیکھی اور اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معظّم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں جا کر ابھی دوا بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ کل تک بخار لوٹ جائے گا اور اگر کچھ افادہ نہ ہوا تو میں انہیں کل شام دوبارہ آکر دیکھوں گا۔

معظّم علی نے کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک یہ تندرست نہیں ہوتی، آپ ہر روز کم از کم دوبار انہیں دیکھنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔ میں دونوں وقت آپ کے لیے گھوڑا سیج دیا کروں گا۔

طبیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: بہت اچھا میں شام کو پھر آؤں گا۔ معظّم علی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صابر سے جو دروازے کے باہر کھڑا تھا، مخاطب ہو کر بولا: صابر دلا درغل سے کہو کہ حکیم صاحب کے ساتھ جا کر دو الے آئے۔ پھر اس نے اپنی جیب سے چند سکے نکال کر طبیب کو پیش کرتے ہوئے کہا: یہ قبول فرمائیے۔

طبیب نے جواب دیا: نہیں! میں مرلیضہ کے تندرست ہونے سے پہلے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔

معظّم علی نے کہا: حکیم صاحب یہ علاج کا معاوضہ نہیں۔ یہ شہر سے یہاں تک

آنے کی تکلیف کا صلہ ہے، لیجیے جب مرلیضہ تندرست ہو جائے گی تو میں جی کھول کر آپ کی خدمت کروں گا۔

معظّم علی کے اصرار پر طبیب نے چند سکے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیے لیکن جو پلے سے باہر نکل کر اس نے جیب سے چاندی اور سونے کے سکے نکال کر دیکھتے ہوئے دلا درخاں سے کہا: تمہارا مالک بہت امیر آدمی معلوم ہوتا ہے!

دلا درخاں نے فخر سے جواب دیا: جناب میرا مالک بادشاہ ہے۔

لیکن وہ عورت تو بہت غریب معلوم ہوتی تھی؟

دلا درخاں نے جواب دیا: جناب جب آپ دوسری دفعہ تشریف لائیں گے تو وہ آپ کو غریب نہیں معلوم ہوگی۔ خاں صاحب نے بالا خانے کے کمرے انہیں دے دیئے ہیں اور خود نیچے آگئے ہیں۔

دلا درخاں کا قیاس صحیح تھا۔ جب شام کے وقت طبیب دوبارہ عابدہ کو دیکھنے آیا تو اس کا کرہ قیمتی ساز و سامان سے آرامتہ تھا۔ مرلیضہ بوسیدہ لباس کی بجائے نیا لباس پہنے ایک خوبصورت پنگ پلٹی ہوئی تھی۔ طبیب نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: بخار بہت کم ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری توقع سے پہلے تندرست ہو جائیگی۔

اگلے دن عابدہ کا بخار اتر چکا تھا اور وہ قدرے بشاش معلوم ہوتی تھی۔ تیسرے دن اسے پھر بخار آگیا لیکن شدت نسبتاً کم تھی۔ پانچویں روز طبیب نے اعلان کیا کہ اب انہیں انشاء اللہ بخار نہیں ہوگا۔



بالا خانے کے تمام کمرے فرحت اور اس کی ماں کے لیے وقف تھے اور معظّم علی بجلی منزل کے ایک کمرے میں آگیا تھا۔ جب تک عابدہ بیمار تھی وہ ہر روز معتد با اس کے



تو بارچی خانے میں آکر تمھاری دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔

میری دیکھ بھال؟ صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ میرا مطلب ہے کہ تم کھانا پکانے کے متعلق ان کی ہدایت لے سکو گے اور ہو سکتا ہے کہ تم بھی انھیں کچھ سکھا سکو۔

صابر کو کھانا پکانے کے مسئلے میں کسی کی نکتہ چینی یا مداخلت پسند نہ تھی۔ اگر یہ مداخلت رحمت کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ یقیناً شدید احتجاج کرتا۔ اس نے کہا۔

”جناب یہ کھانا واقعی لذیذ ہے یا آپ مجھے یہ وقت بنا رہے ہیں؟“

معظم علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ صابر تم بہت ہی سادہ دل ہو۔

صابر نے کہا۔ جناب وہ بھی یہی کہتی تھیں۔

کون؟

چھوٹی بی بی جی۔ وہ تو یہ بھی کہتی تھیں کہ میرا دماغ بالکل خالی ہے۔

چند دن بعد چلی منزل کے کوں اور بارچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار تعمیر

ہو چکی تھی اور مہمانوں کے لیے حویلی کے اندر صدر دروازے کے قریب تین نئے کمروں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔



گھوڑوں کی تجارت شروع کرنے سے پہلے معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنے دل سے تنہائی اور بے کسی کا احساس دور کرنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت ہے لیکن زحمت کو تلاش کر لینے کے بعد وہ حوصلوں، امیدوں اور آرزوں کی ایک نئی دنیا میں آچکا تھا وہ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں اپنی ذات کو دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانا چاہتا تھا۔

ایک شام وہ گھوڑے پر سیر کرنے کے بعد واپس آیا تو حویلی میں چند گاڑیاں کھڑی تھیں

کمرے میں حاضری دیا کرتا تھا لیکن عابدہ کے تندرست ہونے کے بعد اس کے طرز عمل میں تبدیلی آگئی تھی۔ وہ کسی معقول دھڑ کے بغیر بالآخر غلے پر جاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا۔ کبھی زحمت کی ماں بلاتی تو چلا جاتا اور اندر داخل ہونے سے پہلے دروازے پر دستک دیتا۔ زحمت جو پہلے اپنی ماں کی موجودگی میں بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی اب اس کی آواز سننے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ معظم علی کے نوکروں میں سے صابر کے سوا کسی کو اوپر آنے جانے کی اجازت نہ تھی ایک شام صابر کھانا لایا تو معظم علی کو معمول سے زیادہ لڑیہ معلوم ہوا۔ اس نے کہا۔

صابر آج کیا ڈالا ہے تم نے سالن میں؟

صابر نے بدحواس ہو کر جواب دیا۔ بی بی میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں ڈالا۔ یہ سالن چھوٹی بی بی نے لپکایا ہے اور میں نے تو چکھا بھی نہیں۔ صبح جب میں ادرپکھا لے کر گیا تو وہ بہت خفا ہوئیں اور کہنے لگیں۔ آج شام ہنڈیا میں خود لپکاؤں گی۔ میں نے انھیں سمجھایا تھا کہ آپ میرے سوا کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہتی تھیں۔

— وہ کہتی.....

کیا کہتی تھیں وہ؟

کچھ نہیں، جی وہ کہتی تھیں کہ تم گوشت کو دال سے بدتر بنا دیتے ہو۔ معظم علی مسکرایا۔ صابر وہ بالکل درست کہتی تھیں۔ میں آج کئی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں لیکن انھیں تکلیف دینا تمہیک نہیں؟

”جی میں نے کہا تھا کہ آپ بخانا ہوں گے لیکن انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اور بارچی خانہ نہیں ہے۔ وہ اصرار کرتی تھیں کہ آپ نیچے بارچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار بنوادیں۔“

معظم علی نے کہا۔ ان سے کہنا کہ میں بہت جلد دیوار بنوادوں گا اور انھیں نیچے آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے لیے کھانا لپکائیں۔ وہ اگر حائر



”یہ کیا ہے؟“ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک نوکر سے سوال کیا۔

نوکر نے جواب دیا۔ ”جناب شیر علی خاں واپس آگئے ہیں۔“

”میں پوچھتا ہوں یہ گاڑیاں کہاں سے آئی ہیں اور شیر علی کہاں ہیں؟“

شیر علی ایک گاڑی کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ گاڑیاں آپ کی ہیں۔ میں بنارس سے گھوڑوں کی قیمت وصول کر کے پیرا خرید لایا ہوں۔ لکھنؤ میں بنارس کی پٹری کی بڑی ماگ ہے۔ انشاء اللہ ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔“

معظم علی نے کہا۔ ”واہ جی، اب آپ گھوڑوں کے بعد مجھ سے پتروں کی تجارت بھی کرنا چاہتے ہیں!“

شیر علی نے جواب دیا۔ ”اگر بنارس سے گھوڑے مل سکتے تو میں پیرا نہ لاتا۔“

”اور اگر پیرا نہ ملتا تو آپ کیا لاتے؟“

”پیرا کیوں نہ ملتا۔ آپ دیکھیں تو سہی۔“

معظم علی نے کہا۔ ”میں میسور سے ہاتھی لانے کے متعلق سوچ رہا تھا اور آپ بنارس

سے پیرا لاتے ہیں!“

شیر علی نے اطمینان سے کہا۔ ”میں آپ کو بتاؤں میں نے پیرا کیوں خریدا؟“

”مجھے کیا معلوم؟“

”مجھے یہ ڈرتھا کہ آپ کہیں کاروبار جاری رکھنے کا ارادہ نہ بدل دیں اور اس پر طے کے

متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ انشاء اللہ دو چار دن کے اندر اندر یک جہانے لگا اور ہمیں کافی نفع ہوگا۔“

”لیکن یہاں اسے خریدے گا کھن؟“

”آپ دیکھتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جوتی لکھنؤ کی ایک اہم منڈی بن جائے گی۔“

معظم علی نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی مل گئی ہیں!“

”مبارک ہو مبارک ہو! کہاں ملیں؟“

”آپ کو یقین نہیں آئے گا وہ اسی حویلی کی ایک کوٹھری میں رہتی تھیں۔“

”اب وہ کہاں ہیں؟“

”میں نے بلاخانہ انھیں دے دیلے۔“

اگلے روز حویلی میں شہر کے پانچ فزیشن کا ایک ہجوم کھڑا تھا اور ایک دلال پتروں

کے تھان نیلام کر رہا تھا۔

معظم علی نے ایک خوش رنگ ریشمی پیرے کے دو تھان نکال کر صابر کو دیتے ہوئے

کہا۔ ”صابر! اوپر دے آؤ۔“ اس کے بعد اس نے چند اور تھان نکال کر دلال کو دیتے ہوئے

کہا۔ ”دلال اور خاں یہ کپڑاؤں کے چودھری کے گھر لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اسے سنی کے

غریب اور سخی لوگوں میں تقسیم کر دیں۔“

تین دن کے اندر اندر معظم علی کا سارا مال فروخت ہو چکا تھا اور شیر علی خاں اسے حساب

دکھانے کے بعد کہہ رہا تھا۔ ”کیوں جی کیسی۔ تہ ہمدانی یہ تجارت اگر ہم اطمینان سے یہ مال

فروخت کرتے تو اس سے دو گنا نفع ہوتا۔ اب بھی دس فیصدی نفع معمولی نہیں اب

آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”معظم علی نے جواب دیا۔ میں نے فخر الدین کو لکھ دیا ہے کہ دو سو گھوڑے خرید کر

یہاں روانہ کر دیں۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ہم میسور سے ہاتھی دانست، واصل اور

گرم مصالحہ خرید کر لائیں۔ پہلے یہ خیال تھا کہ اگر خاں آئے تو میں اسے آپ کے ساتھ حیدرآباد

بھیجوں لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح دیر ہو جائے گی۔“

شیر علی نے کہا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں حیدرآباد سے گھوڑوں کے آنے سے پہلے

بنارس کا ایک اور چیلر دکا آؤں ؟

معظم علی نے جواب دیا : مجھے یقین ہے کہ یہ پٹرول کا مسئلہ ہمیں بہت پریشان کرے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ چند دن آرام کریں۔ اس عمر میں آپ کے لیے زیادہ کام کرنا ٹھیک نہیں۔

شیر علی نے جواب دیا : مصروفیت میرے لیے سب سے بڑا اہم ہے میں صرت سیکار بیٹھ کر تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں ؟



معظم علی کا کاروبار آٹے دن پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ سارا دن کاروبار کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور دفتری کاغذات کے علاوہ کتابیں بھی اس کے کمرے میں انتہائی بے ترتیبی کی حالت میں پڑی رہتی تھیں۔ کسی نوکر کو کوئی کاغذ یا کتاب ایک جگہ سے دوسری جگہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اسے ذہن نشین ہوتی تو وہ اپنی موجودگی میں نوکروں کو صفائی کا حکم دیتا لیکن چند دن بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔

ایک رات، دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر معظم علی اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کی ہر چیز اپنی توقع کے خلاف دکھائی دی۔ کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ کاغذات ایک ترتیب کے ساتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر اور ٹیکے کا غلاف تبدیل ہو چکا تھا اور مقام فیروز پوری چیمبر کے کمرے سے غائب تھیں۔ معظم علی نے صابر کو آواز دی اور اپنے کاغذات اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صابر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا : ”جناب میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے چھوٹی بی بی کو مشق کیا تھا لیکن وہ کہتی تھیں کہ بالکل جانور ہو۔ میری بڑی بے عزتی ہوئی۔ چھوٹی بی بی کہتی تھیں کہ تمہیں کوئی سلیقہ نہیں آتا اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کہا سرکار خفا ہوں گے لیکن انہوں نے کہا تم باؤں میں خود ساختہ کردہ کی اور ہم

تمہارے سرکار سے بالکل نہیں ڈرتے۔

معظم علی نے شکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا : اچھا جاؤ میرا کھانا لے آؤ؟ اور جب وہ تھوڑی دیر بعد کھانا لے کر آیا تو معظم علی نے اس کی طرف شرارت آمیز قسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا : اچھا صابر کیا کہتی تھیں چھوٹی بی بی تمہیں ؟

”جی وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے“

”کیا کیا تھا ؟“

”میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ خفا ہو جائیں گے۔“

”نہیں نہیں بتاؤ !“

”جی وہ کہتی تھیں یہ رہنے کا کمرہ ہے یا کسی کباڑی کی دکان ہے ؟“

اگلی صبح اپنے کمرے سے نکلے وقت معظم علی کو شرارت سوچھی اور اس نے چند کتابیں الماری سے نکال کر بستر پر پھینک دیں۔ پھر مزے سے چند کاغذ اٹھائے اور ادھر ادھر بکھیر دیئے لیکن جب وہ واپس آیا تو کمرہ اسی طرح سجا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ہر روز یہ محسوس کرتا کہ فرحت اس کی غیر حاضری میں اس کے کمرے کا معائنہ کرتی ہے لیکن ایک شام وہ شہر کے کسی تاجر سے کوئی معاہدہ کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے کمرے میں کاغذات کے پرزے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر میں سلوٹیں تھیں اور ایک کتاب جورات کو اس نے پڑھنے کے لیے نکالی تھی ٹیکے کے پاس اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

صابر نے مگر کہا : جناب کھانا لاؤں ؟

معظم علی نے جواب دیا : نہیں۔ پیسے یہ بتاؤ چھوٹی بی بی آج بادرچی خانے میں بیٹھی تھیں ؟

طیب نے جواب دیا۔ "تشویش کی کوئی بات نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد یہاں ہو جائیں گی۔"

رات کو دیر تک معظم علی کو نیند نہ آئی۔ صبح نماز کے بعد اس نے اوپر جا کر دستک دے

تک ماں نے دروازے پر کڑک پوچھا: "کون ہے؟"

میں ہوں چچی جان! فرحت کی طبیعت کیسی ہے؟"

عابدہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "بہت فرحت

اب بالکل ٹھیک ہے۔ تم نے رات کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی؟"

"چچی جان ...." معظم علی نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا!"

"میں ...."

"ہاں بیٹا کہو!"

"کچھ نہیں چچی جان۔ میں بہت پریشان تھا۔" معظم علی یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ اپنے کمرے

میں پہنچ کر اس نے میز کے سامنے بیٹھ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ چند

سطریں لکھنے کے بعد اس نے کاغذ بچا کر پھینک دیا۔ پھر دوسرے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ لپیٹ کر اس کے اوپر رشیم کا دھاگہ باندھتے ہوئے کہا

"صابر! یہ اوپر چچی جان کو دے آؤ۔ دیکھو کہیں جھوٹی بی بی کے ہاتھ میں نہ دے دینا در

تھوڑی خیر نہیں۔ وہ بہت گالیاں دیں گی تمہیں۔"

"نہیں جی میں کوئی بوقت تھوڑا ہوں۔"

"اور دیکھو جواب کے لیے دروازے کے باہر ٹھہر کر انتظار کرنا!"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے کورا کاغذ اور قلم دوات ساتھ لے کر جانا چاہیے۔"

"نہیں نہیں جاؤ۔"

"نہیں۔ جی آج وہ سارا دن بچے نہیں مائیں۔ صبح میں کھانا لے کر گیا تھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ بڑی بی بی کہتی تھیں! انہیں بخار ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "جاؤ دلا درخاں سے کو فوراً طیب کو لے آئے۔ نہیں ٹھہرو۔ میں خود جاتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ بعد، معظم علی نے بالاخانے کے ایک کمرے کے پاس جا کر آواز دی: "چچی جان! حکیم صاحب آئے ہیں!"

اندر سے آواز آئی۔ "حکیم صاحب! اچھا انہیں لے آؤ۔"

معظم علی کے اشارے پر طیب کمرے میں داخل ہوا اور وہ خود تذبذب کی حالت میں دروازے سے باہر کھڑا رہا۔

عابدہ نے آواز دی: "معظم علی! بیٹا اندر آ جاؤ باہر کیوں کھڑے ہو؟"

معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ فرحت چادر میں اپنا منہ چھپائے بستر پر لیٹی ہوئی تھی

معظم علی نے ایک کرسی اٹھا کر فرحت کی چارپائی کے قریب رکھتے ہوئے طیب کو بیٹھنے

کے لیے کہا۔

طیب نے فرحت کی نبض دیکھی اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "پریشان ہوں

کی کوئی بات نہیں۔ بخار بالکل معمولی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اتر جائے گا۔"

پھر اس نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اس میں سے

چار گولیاں نکال کر معظم علی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے دو گولیاں اسی وقت کھلا

دیکھیے اور دوا دھکی رات کے وقت۔ صبح تک اگر بخار نہ اترتا تو اپنا نوکر میرے پاس بھیج

دیکھیں گے گا۔"

تھوڑی دیر بعد چچی کے دروازے پر طیب کو وضعت کرتے ہوئے معظم علی نے کہا۔

"حکیم صاحب مریضہ کے متعلق کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

صابر کرنے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "جناب اچھے بڑی بڑی بی بی آپ کو ادھر بلا رہی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں انھوں نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے، میں جواب لے جاتا ہوں لیکن انھوں نے اٹا بھج پر ہنستا شروع کر دیا۔" بی بی نے کہا کہ وہی تھیں یہ بالکل جانور ہے۔

تم نے جھوٹی بی بی کو خط نہیں دے دیا؟

نہیں جی۔ اب آپ بھی مجھے جانور سمجھنے لگ گئے ہیں کیا؟ میں نے اپنی طرف سے بہت احتیاط کی تھی لیکن بڑی بی بی نے خط پڑھنے کے بعد انھیں دکھایا۔ میں نے بہت کما یہ خط جھوٹی بی بی کو نہ دکھائیے لیکن آج وہ بھی مجھ پر ہنس رہی تھیں۔ معلم علی کمرے سے نکل کر بالا خانے پر پہنچا تو فرحت کی ماں دروازے میں کھڑی ہر کا انتظار کر رہی تھی۔ حیا کے مامے معلم علی کے گال اور ہن سر نہ ہو رہے تھے۔

عابدہ نے کہا۔ "آؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔"

معلم علی جھکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

عابدہ نے کہا۔ "فرحت دوسرے کمرے میں ہے۔ بیٹھے جاؤ۔" اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور انکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ بیٹا! فرحت تمھاری ہے وہ ہمیشہ تمھاری تھی۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں کئی دنوں سے تمھارے پیغام کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ زمانہ میں ٹھکرا چکا ہے۔ میں سوچا کہ کئی تھی کہ تم کھنڈ کے بڑے سے بڑے نانا سے رشتہ حاصل کر کے جاؤ۔

"جی جان!" معلم علی نے آبدیہ ہو کر کہا۔ مجھے صرف یہ ڈرتا تھا کہ اگر میں نے جلد بازی سے کام لیا تو آپ کیسے یہ دیکھیں گے کہ میں آپ کی عبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آج بھی

جب میں خط لکھ رہا تھا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔



آٹھویں روز کھنڈ کے بڑے بڑے گھرانوں میں یہ چرچا ہو رہا تھا کہ ایک لاکھ پتی لوجا نے اس بے سالا لڑکی سے شادی کر لی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ شہر سے باہر ایک بستی کی رائے میں انتہائی مفلسی اور بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔

فرحت رات کے وقت دھن کا لباس پہنے بستی کی عورتوں کے جوم میں بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھ گئی تھی۔ معلم علی دعوت دہیہ پر جمع ہونے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھا۔ جب بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو فرحت کرسی گھسیٹ کر باہر کی طرف کھٹنے والے درجے کے سامنے بیٹھ گئی۔ اتنی سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ فرحت نے اٹھ کر آہستہ سے درمیان کا دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ عابدہ کے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ "امی جان!" اس نے آہستہ سے آواز دی لیکن جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چاند اب بادل کے ایک سیاہ ٹکڑے کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں بادل گزر گیا اور چاند کی دلنریز کرنیں پھر ایک بار فضا میں فورے خزاں بکھیر رہی تھیں۔ دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی فرحت نے مڑ کر دیکھا۔ معلم۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت کی نگاہیں جھلک گئیں۔

معلم علی نے ایک نرمی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فرحت میں تصور میں تمھاری ہزاروں تصویریں دیکھ چکا ہوں لیکن تم ان سب سے زیادہ حسین ہو۔" فرحت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ظہر مسکرایا۔ تمھارے ہاتھ بھی خوبصورت ہیں۔

تم نے سادی سے چہرے پر انکس ڈال لیا اور اپنے ہاتھ اور ہنسی کے اندر چھپا لیے۔

معظم علی نے دیکھے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا: "فرحت! ادھر دیکھو چاند پر بادل آگیا ہے لیکن اس کی رعنائی اندر دکشتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میں میر حبیب کی قید میں تھا تو اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی دراڑوں سے کبھی کبھی چاند کی جھلک دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید اس وقت تم بھی اپنے محل کے کسی درہچکے میں کھڑی ہو کر چاند کی طرف دیکھ رہی ہو گی۔ پھر قید سے نکلنے کے بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب زندگی میں ہمارے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں تو میں نے چاند اور ستاروں کی طرف دیکھنا ترک کر دیا تھا لیکن تم میری لگا ہوں سے کبھی ادھل نہ ہو سکیں۔ معظم علی نے یہ کہہ کر اس کے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ فرحت مسکرا رہی تھی لیکن اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

معظم علی نے کہا: "فرحت! تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں تمہارے کتب خانے میں کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھیں اور پھر جب مرہٹوں نے تمہارے محل پر حملہ کیا تھا اور میں تم پر برس پڑا تھا لیکن تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔"

فرحت نے جواب دیا: "یہ یادیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ معظم علی کا چہرہ اچانک منجمد ہو گیا اور وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ فرحت نے چند بار نظر پھاڑا کہ اس کی طرف دیکھا اور کہا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" معظم علی نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ پریشان ہیں؟" فرحت نے کہا۔

معظم علی نے جواب دیا: "پریشانیں ہماری میراث ہیں۔ فرحت! جب میں بنگال کی فوج میں ملازم ہوا تھا تو اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ منٹس اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ایک دوست نے مجھے کہا کہ اگر تم اپنی کئی اسی طرح نہ کرتے رہو گے تو اپنی بڑی کوئی تہہ نہیں کیا دو گے۔ میں نے جواب دیا کہ میری رفیقہ حیات کا ہر ایک ایسا ملک ہو گا جو اندرونِ ادا بڑی خطرات سے آزاد ہو۔ فرحت! وہ تو ار جو میں نے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت

فرحت نے کہا: "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں:

"پوچھیے؟"

"لیکن میں نہیں پوچھتی۔ آپ برا مانیں گے۔"

"خدا کے لیے ضرور پوچھیے ورنہ مجھے بہت پریشانی ہوگی۔"

”اچھا یہ بتائیے کہ اس لڑکی کا نام کیا تھا؟“  
”کونسی لڑکی؟“

”وہ جو آپ کو حیدر آباد کے راستے میں ملی تھی۔“

”شیخ فخر الدین کی بیانی؟ اس کا نام بتائیں۔“

فرحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ ڈالتے ہوئے کہا: ”نہیں جناب

میں بڑی صاحبزادی کے متعلق پوچھتی ہوں۔“

”اس کا نام عطیہ تھا لیکن تمہیں اس وقت اس کا خیال ایسے لیا؟“

”بس یوں ہی اگیا۔ اچھا یہ بتائیے کہ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی؟“

”میں نے کب کہا کہ وہ خوبصورت تھی۔ میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔“

”لیکن آپ نے یہ تو کہا تھا کہ چھٹی لڑکی کی شکل بہت پیاری ہے وہ بھی تو اس کی بہن تھی؟“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خوبصورت ہو لیکن میں تو اسے نہیں دیکھا۔“

فرحت کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا:

”سوچ رہی تھی کہ اگر عطیہ کی جگہ میں ہوتی تو کیا کرتی۔ آپ کو حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد

کبھی اس کا خیال نہیں آیا؟“

مستم علی نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ”فرحت میرے دل و دماغ میں اگر خیالات

کے لیے کوئی جگہ تھی تو وہ ہمارے تصور سے پُر ہو چکی تھی۔“

فرحت نے کہا: ”یہ عجیب بات ہے۔ میں نے جس دن سے اس لڑکی کے متعلق سنا

ہے، میرے دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ کسی دن حیدر آباد جا کر اسے دیکھوں۔ نہ جانے

کیوں میں اپنے دل میں اس کے لیے ایک بہن کی شفقت محسوس کرتی ہوں۔“

مستم علی نے کہا: ”ممكن ہے میں کسی دن حیدر آباد جانا پڑے؟“

## تیرھواں باب

مستم علی کا تجارتی کاروبار آٹے دن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دولت اور مائی کے

تذکرے زبان زد عام تھے۔ اس کے دروازے پر غریب اور نادار لوگوں کا آنا بندھا رہا تھا۔

لکھنؤ کے امراء اور فوجی افسر اس کا احترام کرتے تھے۔ حویلی کے اندر اس کا ایک شاندار کھانا

مکان اور مہمانوں اور نوکروں کے لیے کمرے تعمیر ہو چکے تھے۔ گھوڑوں کے اصلیل اور گودام ہیں

ہی ایک اور احاطے میں منتقل ہو چکے تھے۔ گھر میں مستم علی کو زندگی کا ہر آرام میسر تھا۔ پرانے دھم

آہستہ آہستہ مندرجہ میں منتقل ہو چکے تھے۔ فرحت کی رفاقت کے باعث زندگی کا ایک بھیانک غلام پُر

ہو چکا تھا۔ تاہم وہ بڑی شہرت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ مائی کی ماریکیاں ابھی تک اس کا پیچھا

کر رہی ہیں اور یہ احساس کبھی ان تمام مرقوں پر حاوی ہو جانا جو اسے فرحت کی رفاقت میں

حاصل تھیں۔ وہ فرحت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا اور اپنے دل میں یہ کہتا: ”میری زندگی! یہ

یہ دنیا تھادی مسکراہٹوں کے لیے بنائی گئی ہے لیکن کاش ان مسکراہٹوں کی بددستی ان کا ایک

پردوں کے پار جاسکتی جو ہمارے حال اور مستقبل کے درمیان حائل ہیں۔“ وہ مائی کو بھول

سکتا تھا لیکن حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی جی اٹھ چلا

اور طوفانوں کے ساتھ لڑنے میں اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن گزارے تھے۔ وہ پھر

ایک نئی شہرت کے ساتھ مستقبل کے افق پر ظاہر ہو رہے تھے۔

مرشد آباد کے قید خانے سے نکلنے کے بعد اس کی ساری توجہ فرحت کی تلاش پر مرکوز

تھی بلکہ قوم کے حل اور مستقبل کے مسائل اس کے لیے ایک ثانوی حیثیت اختیار کر چکے تھے لیکن فحرت کو پالنے کے بعد ان آنکھوں اور طوفانوں کا چہرہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ بھیانک نظر آتا تھا وہ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سارے باغ کی حفاظت کرتا چاہتا تھا۔ وہ اودھ کی سرزمین کو ان انسانی بھیڑوں سے بچانا چاہتا تھا جو جنگ کی طرح کرناٹک، دکن اور شمالی ہندوستان کے وسیع علاقوں کو اپنی شکار گاہیں بنا چکے تھے۔ اکبر خاں نے چھ ماہ قبل اسے جو آخری پیغام بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ میں اپنے علاقے کے مجاہدین کے ساتھ نجیب الدولہ کی فوج میں شامل ہو چکا ہوں۔ ان دنوں ہم محاصرے کی حالت میں ہیں۔ دہلی سندھیا ہم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے ملک کا انتظار کر رہا ہے لیکن نجیب الدولہ کو یقین ہے کہ احمد شاہ ابدالی اب کسی تاخیر کے بغیر ہماری مدد کو پہنچ جائیں گے۔

چند ہفتوں کے بعد احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر ملک کے طویل مدتی مشہور ہو چکی تھی۔ پھر معظم علی تقریباً ہر روز لکھنؤ کے امرا کی محفلوں میں اس قسم کی خبریں سناتا تھا کہ آج احمد شاہ ابدالی نے دریائے سندھ عبور کر لیا ہے۔ لاہور کا مرہٹہ گورنر وہاں سے پسپا ہو کر دلی بھاگ آیا ہے۔ احمد شاہ اب لاہور سے دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں روہیلہ سردار افغان لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور اب یہ لشکر مرہٹوں کو دلی کی طرف ہانک رہا ہے۔ دلی کے غدار وزیر عماد الملک غازی خان نے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے دلی کے شہنشاہ عالم گیر خانی اور اس کے وزیر اعظم نظام الدولہ کو قتل کر دیا ہے اور کسی اور شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھادیا ہے۔ دہلی سندھیا نجیب الدولہ کا بیچا چھوڑ کر احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ ابدالی نے تروٹی کے قریب مرہٹہ افواج کے ہراول دستوں کو شکست دی ہے۔ افغان لشکر نے دریائے جمنہ عبور کر لیا ہے اور سارنپور کے قریب پہنچ گیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی اب دلی

کی طرف بڑھ رہے ہیں، نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں، سعد اللہ خاں، مولا سردار اور دوسرے روہیلہ اکابر اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ ابدالی نے دلی سے چھ میل دور لونی کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ دہلی کی افواج نے افغان پڑاؤ سے دس میل کے فاصلہ پر دیلے جمنہ کے دوسرے کنارے ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ ابدالی نے اچانک دریا عبور کر کے مرہٹہ لشکر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ دہلی مارا جا چکا ہے اور اس کا مصیبت جن کو جی زخمی ہونے کے بعد ہی سہی فوج کے ساتھ کوٹ پتلی پہنچ گیا ہے۔ راجپوتانہ سے ملہار راؤ بھنگری افواج جنگجوئی کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں۔ مرہٹہ لشکر نے روہیلوں کے علاقوں میں تباہی مچا دی ہے۔ مرہٹے بہادر گڑھ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کے مشہور جرنیل جہان خان نے چوہ گٹھ میں تنوایل ملیکار کے اسکنڈر آباد کے قریب مرہٹہ افواج کو عبرت ناک شکست دی ہے اور ان شاندار فتوحات کے بعد احمد شاہ نے موسم برسات گنارنے کے لیے علی گڑھ کے قریب ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔

ان حوصلہ افزا خبروں سے معظم علی اپنے سینے میں زندگی کی نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا لیکن یہ خبریں جس قدر حوصلہ افزا تھیں اسی قدر دکن کے حالات تشویش کا بھتہ جابھے تھے۔ حیدر آباد کے توپخانے کا مشہور کمانڈرٹ ابراہیم گارڈی جس نے فرانسیسی جرنیل سے تربیت حاصل کی تھی، نظام سے غدار کی کہے ہوئے کے ساتھ مل گیا۔ بالاجی نے گارڈی کی خدمات حاصل کرتے ہی دکن پر حملہ کر دیا اور احمد نگر کے مشہور قلعے کے محافظ کی غداروں سے فائدہ اٹھا کر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قبضہ کر لیا۔ احمد نگر کا قلعہ جہن جانے سے نظام کی فوج ایک اہم مستقر سے محروم ہو گئی تھی۔ دوسری طرف تنو خاں کی عدم ادائیگی کے باعث نظام کو اپنے سپاہیوں سے بغاوت کا بھی خطرہ تھا۔ تاہم ان کے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیشوائے سداشیو راؤ کی قیادت میں چالیس ہزار فوج بھیجی۔ اس کے علاوہ ابراہیم گارڈی کو اس کے مشہور توپخانے اور پانچ ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ روانہ



کیا۔ ۳ فروری ۱۷۶۰ء کو پنا سے دوسری دوراگیر کے مقام پر جنگ ہوئی۔ قبل بہادری سے لڑے لیکن گاردی کے توپخانے نے انھیں سخت نقصان پہنچایا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد دکن کے متعلق یہ خبر آئی کہ نظام نے سدا شیو کے ساتھ انتہائی جنگ آمیز شرائط پر صلح کر لی ہے اور بیجا پور، بیدار اور گنگ آباد کے گرد و نواح کے علاقہ جات اور دولت آباد، اسیر گڑھ، احمد نگر اور برہان پور کے قلعہ جات پر ان کا قبضہ تسلیم کر لیا ہے۔



پنا میں ابھی تک اڈگیر کی فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ پیشوا کو دہلی کی موت اور جھکوجی اور ملہار راؤ ہلکری شکستوں کی خبریں ملیں۔ عام حالات میں شاید دہلی سندھیا کی موت کو مرہٹہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ سمجھا جاتا لیکن مرہٹے ایک طرف دکن میں نظام کی قوت مغلوب کر چکے تھے۔ دوسری طرف چند ماہ قبل ان کی فتوحات کا سیلاب پشاور کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ گزشتہ کامیابیوں کے بعد مرہٹوں میں جو غرور اور خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی اس کے باعث یہ شکستیں پوری مرہٹہ قوم کی عزت اور وقار کا مستند بن گئیں اور جہاں شہر سے وہ فوجی قوت نمودار ہوئی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی بلونت راؤ سیہن ڈھیل۔ شمشیر، بہادر، باجی راؤ کا بیٹا ماسائی، نادر و شکر وٹھل، شیو دیو، ترمبک راؤ، پورن دھر، انانجی، مانیکشور اور بیشنار دوسرے بڑے اور چھوٹے مرہٹہ سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ قومی توہین کا انتقام لینے کے لیے پیشوا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، اس کے علاوہ ان کے ساتھ ابراہیم گاردی اپنے مشہور توپخانے اور نوبدار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس عظیم فوج کی کمان اڈگیر کے فاتح سدا شیو راؤ (بھادجی) کو سونپی گئی اور اس کے ساتھ پیشوا نے اپنے نوجوان ولی عہد بشنواش راؤ کو روانہ کر دیا۔ مرہٹہ لشکر ۱۷۶۰ء کو پٹ دڑ سے روانہ ہوا اور اڈگیر آباد، برہان پور اور گوالیار کے راستے سفر کرنے کے بعد جموں کو دیائے چنبل کے کنارے پہنچ گیا۔ راستے میں جوں جوں یہ فوج شمال کی طرف بڑھتی گئی،

اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملہار راؤ ہلکری جھکوجی سندھیا، داماجی، جسونت راؤ بھادڑ اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے علاوہ لیٹروں اور پٹیلوں کے دستے ہر منزل پر اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ یہ صرف ایک فوج نہ تھی بلکہ پوری قوم کا فاعل عنصر، جمع ہو چکا تھا امدان سب کا غرور یہ تھا کہ ہم انغلاؤں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال کر دم لیں گے۔

دلی کی طرف مرہٹہ لشکر کی رفتار بہت سست تھی۔ اس سے قبل مرہٹوں کی کامیابی کا راز ان کی سادگی اور تیز رفتاری میں تھا۔ سیوا جی کے زمانے میں مرہٹہ کمپ میں کسی عورت کا لانا بعید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی بھاری ساز و سامان بھی نہیں رکھتے تھے ایک مرہٹہ سپاہی کے لوازمات گھوڑے، اسلحہ اور ایک توڑے تک محدود ہوتے تھے۔ اپنے لیے کھانا اور گھوڑے کے لیے چارادہ راستے میں لوٹتے تھے۔ لیکن بھادجی کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ سامانِ رسد کی بیشمار گاڑیاں تھیں اور خیمہ بردار تھے۔ شیشی خیمے ہاتھوں پر لے ہوئے تھے۔ مرہٹہ سردار زرتار کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے چنبل کے مقام پر بھرت پور کا حکمران راجہ سورج مل جاٹ اپنے لشکر سمیت مرہٹوں کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن بھادجی کی خود سری کے باعث راستے میں ہی مرہٹوں کے ساتھ اس کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ مرہٹے جولائی کے آخر میں دلی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ۲۰ اگست کو انھوں نے بغیر کسی شدید مزاحمت کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ بھادجی نے اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے لال قلعہ کوٹوا اور دیوان عام کی چھت اور دیواروں میں لگی ہوئی چاندی ابدالی۔ لال قلعے سے باہر بزرگان دین کے مزارات کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کیا۔ سورج مل جاٹ مرہٹوں کی اس حرکت سے خفا ہو کر واپس چلا گیا۔

موسم بہ سہات کے دوران میں بیٹے دلی سے باہر ٹاڈ ڈال کر شہر اور آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ اس عرصہ میں ابدالی لشکر کے ضلع میں انوب کے مقام

پڑویرہ ڈالے ہوئے تھا اور دونوں فریق ذاب شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ لانے کے لیے دوڑ دوڑ کر رہے تھے۔



معظم علی بلانامہ صبح کی نماز کے بعد گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا۔ ایک دن سواری کے بعد وہ اپنی حویلی میں داخل ہوا تو صحن میں ایک فوجی افسر کھڑا شیر علی سے باتیں کر رہا تھا اور معظم علی کا ایک نوکر اس کے گھوڑے کی باگ تھلے چند قدم دور کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر فوجی افسر سے کہا: "لجیجی وہ لگے"۔ معظم علی نے گھوڑے سے اتر کر نوجوان افسر کے ساتھ مصافحہ کیا۔ افسر نے کسی تہید کے بغیر کہا: "جناب مجھے علی کے داروغہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کو اسی وقت علی میں طلب کیا گیا ہے"۔

معظم علی نے کہا: "میں وہاں طلب کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

جناب مجھے کچھ معلوم نہیں۔ داروغہ نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا: "اور اگر میں داروغہ کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو؟"

نوجوان افسر نے جواب دیا: "داروغہ نے آپ سے درخواست کی ہے حکم نہیں بھیجا۔"

"چلیے!" معظم علی نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد معظم علی اور فوجی افسر علی کی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ فوجی افسر نے کہا: "آپ یہاں تشریف رکھیے۔ میں داروغہ کو اطلاع دیتا ہوں۔"

معظم علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور فوجی افسر باہر نکل گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد علی کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے گرمجوشی سے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "آئیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

معظم علی نے داروغہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا: "اگر یہ بات اس عمل کے

رسوم و آداب کے خلاف نہ ہو تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا انتظار کرنے والے صاحب کون ہیں؟"

داروغہ نے جواب دیا: "آپ کو نجیب الدولہ نے بلایا ہے۔"

"نجیب الدولہ یہاں ہیں؟"

"جی ہاں، وہ کل یہاں پہنچے تھے لیکن ابھی تک ان کی آمد کو صیغہ لازم رکھا جا رہا ہے۔ اور میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ یہ بات اس عمل سے باہر کسی پوچھا نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں لیکن میں حیران ہوں کہ انھیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

داروغہ نے جواب دیا: "میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ انھوں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کے متعلق پوچھا تھا۔"

معظم علی اپنے ذہن میں نجیب الدولہ کی سیما یا شخصیت کی عجیب و غریب تصویریں لیے عمل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک قوی الجتہ آؤٹی جس کے چہرے سے ذہانت اور شہادت مترشح تھی، اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور مسافو کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوا آپ شاید اس بات پر پریشان ہوں کہ میں نے آپ کو یہاں آئے کی تکلیف کیوں دی ہے اگر مجھے بعض مجبوریوں کا احساس نہ ہوتا تو میں سیدھا آپ کے ہاں آتا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میرا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

تشریف رکھیے۔ مجھے اکبر خاں نے آپ کا پتا دیا تھا۔"

اکبر خاں کا نام سن کر معظم علی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے

نجیب الدولہ کے سامنے کسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں سے؟ مجھے اس نے کسی میزوں سے کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں اس کے متعلق بہت پریشان ہوں۔"

"وہ احمد شاہ ابدالی کے پاس ہے اور گذشتہ چند ماہ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں بے حد مصروف رہا ہے اور میں اس کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "آپ کو اس کی طرف سے معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں اور شاید میں اس دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کو نہیں جانتا۔ میرے لیے اس کے متعلق صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ سلامت ہے۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "اس کا باپ میرا دوست تھا۔ میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔"

اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں جرات و بہمت کی نہایت قابل فخر روایات قائم کی ہیں اور میں جب کبھی اسے شاباش دیا کرتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ اس نے سب کچھ

آپ سے سیکھا ہے۔ آپ کے ساتھ میری ملاقات ایک مقصد کیلئے ہے کہ خاں مجھے سپاہیانہ زندگی سے آپ کی کماندہی کی وجوہات بتا چکا ہے لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں

کہ احمد شاہ ابدالی نے جس جنگ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی اجتماعی بقا کی خاطر لڑی جائے گی۔ مرہٹے اب ہمیشہ کے لیے اس ملک کی سمیت کا فیصلہ کرنے کے

لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں آپ جیسے باشعور آدمی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شکست کھائی تو جو امیدیں ہم نے

شمالی ہندوستان کے مستقبل کے متعلق وابستہ کی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ مرہٹے ایک بوچکے ہیں اور میں بھی ایک ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس

احمد شاہ ابدالی کا لالچی بن کر آیا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دینے پر رضا مند ہو جائیں گے۔ روہیلکھنڈ کے تمام سردار احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں لیکن ہمیں اپنے

سپاہیوں کو فوجاً تربیت دینے کے لیے آرمودہ کار انہروں کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں کسی ذمہ داری کا پوچھا اٹھا سکتا ہوں تو میری رضا کا لازماً خدمات حاضر ہیں اور مجھے اس بات کی مذمت ہے کہ میں اکبر خاں کی طرح بن جائے آپ کی خدمت میں حاضر کیوں نہ ہوں؟"

محل کا واروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "عالیجاہ حضور نواب صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"نہیں عالیجاہ خود تشریف لا رہے ہیں۔ واروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور معظم علی نے اٹھ کر کہا۔ "تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ کے اندر اندر

احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

نہیں ٹھہریے؟"

"لیکن نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں؟"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "بیٹھ جائیے! نواب صاحب سے آپ کا تعارف ضروری ہے۔"

نواب اودھ اپنے شاہزادہ باہا میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور نجیب الدولہ اور

معظم علی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ شجاع الدولہ اپنے مہمان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ

کر چند تانیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ نجیب الدولہ نے کہا۔ "جناب یہ معظم علی خاں ہیں۔"

مکھنڈ میں پناہ لینے سے پہلے یہ بنگال کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کا ایک ہونہار شاگرد

احمد شاہ ابدالی سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور میں ابھی ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں اپنے

سپاہیوں کو تربیت دینے کے لیے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے اور یہ میری خوش قسمتی

ہے کہ انھوں نے میری درخواست قبول کر لی ہے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔ "تشریف رکھیے۔ ایک اچھے سپاہی کے لیے میری فوج میں

مجھے جگہ ملے گی۔ مکھنڈ میں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟"

"میں تجارت کرتا ہوں۔"

شجاع الدولہ نے نجیب الدولہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا، "آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟  
روسیکھنڈ کا ایک نوجوان مرد اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گزار چکا ہے اور اس  
کی بدولت میں غائبانہ طور پر ان سے متعارف ہو چکا تھا۔"

شجاع الدولہ چند نازخاموش رہا۔ معظم علی نے اس مصل میں اپنی موجودگی کو دخل معزز  
بجھے ہوئے اٹھ کر کہا، "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بہت اچھا! اگر مجھے وقت ملا تو جانے سے پہلے آپ کے ساتھ ایک اور ملاقات کی  
کوشش کروں گا لیکن اگر ممکن نہ ہو تو انشا اللہ ہماری ملاقات احمد شاہ ابدالی کے کیپ  
میں ہوگی۔"

نجیب الدولہ نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ مصافحہ کیا لیکن شجاع الدولہ نے کرسی  
پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا۔ معظم علی دروازے کی طرف بڑھا لیکن کچھ سوچ کر اچانک رک گیا  
پھر اس نے مڑ کر شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور کہا، "جناب اگر یہ گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض  
کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ نجیب الدولہ اپنی مہم میں کہاں تک کامیاب ہوں گے، اور  
احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کے متعلق آپ کا آخری فیصلہ کیا ہوگا میں صرت یہ جانتا ہوں کہ  
ہندوستان کا کوئی مسلمان، اگر اس نے خود کشی کا ارادہ نہیں کر لیا ہے۔ اس جنگ میں غیر جانبدار  
نہیں رہ سکتا۔ اگر خدا خواستہ اس ملک کے مسلمانوں کی اجتماعی بے بسی کے باعث احمد شاہ ابدالی  
کو شکست ہوگئی تو شمالی ہند میں ہمارا آخری دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ مرہٹوں نے صرف  
دلی پر قبضہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ پشاور سے کابل اور غزنی تک اپنی فتوحات کے پرچم ہلانے  
کی نیت سے میدان میں آئے ہیں۔ اگر کسی میدان میں انھیں فیصلہ کن شکست زدنی تھی تو وہ

دن دور نہیں جب دلی کی طرح مکھنوں کی گلیوں اور بازاروں میں بھی ان کے گھوڑے دوڑ  
رہے ہوں گے۔ مکھنوں میں اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی ہیں کہ مرہٹوں نے آپ کو  
جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لیے دلی میں اپنے مکھن پتی حکمران کی وزارت کی پیش کش کی ہے  
اور آپ.....!"

شجاع الدولہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا، "یہ جھوٹ ہے اور مرہٹے مجھے بیوقوف نہیں  
بنا سکتے۔"

معظم علی نے کہا، "میری معذرت قبول فرمائیے لیکن عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لیے  
اس قسم کی افواہوں کی تردید کی اشد ضرورت ہے اور تردید کی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنی  
افواج کو مرہٹوں کے خلاف کوچ کی تیاری کا حکم دیں۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا، "مجھے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے آپ کے مشورہ کی  
ضرورت نہیں۔"

"جناب مجھے معلوم ہے کہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں لیکن میں آپ کے کانوں  
تک اس قوم کی فریاد پہنچانا چاہتا ہوں جس کی شرارگ تک ایک ایسے دشمن کی توار پیخ  
بجلی ہے جو عدل و انصاف اور انسانیت کے الفاظ سے نا آشنا ہے۔ میرے الفاظ بیشک  
تبع نہیں لیکن آپ کو میرے غلوص پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"  
معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔



مکوڑی ویر لعل معظم علی گھوڑے پر سوار اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا۔ شہر کے پر رونق بازاروں  
اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے گرد و پیش کا احساس تک نہ تھا۔ وہ کوسوں دور کسی  
میدان میں ان افواج کے میلوں تک پہنچے ہوئے پڑاؤ دیکھ رہا تھا جو ہندوستان کے مستقبل کا  
بدل کرنے والی تھیں۔ وہ بڑے والوں کے نعرے، زخمیوں کی چیخ پکار، توپوں کی دھند دھماکا

بندوقوں کے دھماکے اور تلواریں کی جھنگ مار سن رہا تھا، اسے ہر گاہ تک لاشوں کے انبار نظر آرہے تھے۔ پھر آگ اور دھواں کے طوفانوں سے نکل کر وہ اس مکان میں پہنچ چکا تھا، جہاں زندگی اپنی تمام بنیادوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ فرحت اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میری زندگی! میں آگیا ہوں، خدا نے ہمیں فتح دی ہے۔ ہم ان درندوں کے دانت توڑائے ہیں جو اس ملک میں انسانیت کے لیے ایک خطرہ عظیم بن چکے تھے۔ میرے پیچھے وہ فوج آ رہی ہے جس کے سپاہی مرہٹوں کی سطوت کے پرچم اپنے پیروں کے روند چکے ہیں۔ اب یہ مجاہدان فرگ تاجروں کی چہرہ دسیوں سے ہمیں نجات دلائیں گے جنہوں نے بنگال میں ہماری عزت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس ملک میں انسانیت دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ اب ہماری منزل مرشد آباد ہے۔ ہم بہت جلد اس وطن کی مٹی کو آنکھوں سے لگائیں گے جہاں ہمارے شہیدوں کا خون گرا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہاں ایک کمرے میں فرحت اور اس کی ماں کے علاوہ دواجنسی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ معظم علی جلدی سے واپس مڑا اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ چند ہی منٹ کے بعد فرحت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ معظم علی نے کہا۔ "فرحت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں تمہاری سیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے برا تو نہیں مانا۔"

فرحت مسکرائی۔ "وہ میری سیلیاں نہیں تھیں۔ انہیں اتنی جان نے بلایا تھا اور جالتے جالتے آپ کو ایک خوشخبری دے گئی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان تشریف لانے والے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "واہ یہ خوشخبری تو میں کچھلے ہفتے سن چکا ہوں۔"

فرحت مسکرائی۔ "ای جان کو اصرار ہے کہ شہر کی ہر خبر بہ کار عورت باری باری مجھے دیکھنے

کے لیے آئے۔ کل چڑوس کی کسی عورت نے ان عورتوں کا پتہ دے دیا تھا اور امی جان نے آج صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی صابر کو ان کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔ معظم علی فرحت کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے خیالات کہیں اور تھے۔ فرحت نے کہا۔ "آج آپ پریشان نظر آتے ہیں خیر تو ہے! دلا درخاں کتا تھا کہ آپ کو شجاع الدولہ نے بلایا تھا۔"

"نہیں مجھے نجیب الدولہ نے بلایا تھا۔ وہ کل سے لکھنؤ میں ہیں، فرحت! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ننھے مہمان کی صورت دیکھنے سے پہلے میں گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔"

فرحت نے کہا۔ "لیکن آپ اگر کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "فرحت آج میں اس بات پر مذمت محسوس کر رہا ہوں کہ میں ان جنگوں سے غیر حاضر رہا ہوں جو ہماری قوم کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہیں۔ تم سن چکی ہو کہ مرہٹوں کا سیلاب اب دلی پہنچ چکا ہے۔ احمد شاہ ابدالی ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے اور اسے ہر اس انسان کے تعاون کی ضرورت ہے جو اس ملک کے مسلمانوں کے متعلق سوچنے کا شعور ادا ان کی بقا کے لیے تیار اٹھانے کی ہمت رکھتا ہو۔ فرحت نے کہا۔ "میں چند دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ آپ کوئی اہم فیصلہ کرنے والے ہیں اور پچھلے ہفتے جب آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آپ اب چند مہینے لکھنؤ سے باہر نہیں جائیں گے تو بھی مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ آپ کسی ذہنی کشش میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ میری خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے تو میں سمجھوں گی کہ میں آپ کی رفیقہ حیات بننے کی اہل نہ تھی۔"

احمد علی معظم علی ایک سپاہی کا لباس پہنے فرحت کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت

کے چہرے پر ایک منوم مسکراہٹ تھی۔ معلم علی نے کہا: "میں اپنی زندگی میں ایسی جنگیں لڑ چکا ہوں جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بے معنی تھیں لیکن اس دفعہ میں ایک ایسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے جا رہا ہوں جس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں شمال مغرب کے علاقے ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری دفاعی حصہ ثابت ہوں گے۔ اگر ہم مرہٹوں کو شکست دے سکے تو یہ سیلاب عظیم کسی دن انک کے پار پشاور اور غزنی تک پہنچ جائے گا اور مسلمانوں کی حالت اس ملک کے شوروروں سے بدتر ہوگی۔ فرحت میں اپنی شہرت اور ناموری کے لیے نہیں بلکہ قوم کے بقا کے لیے یہ جنگ میں حصہ لینے جا رہا ہوں۔ یہ جنگ اس ملک کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ ہوگی اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں سپاہی ایسے ہوں گے جن کی لاشیں دشمن کے گھوڑوں کے پیروں سے روندی جائیں گی۔ اگر میں واپس نہ آیا تو یہ سمجھنا کہ میرا مقصد میری ذات سے بلند تھا اور جو کچھ ہمارے ہاں پہلے ہوگا تم کسی دن اسے یہ بتا سکو گے کہ تمہارا باپ ان ہزاروں گناہ سپاہیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اپنی آنے والی سنوں کی عزت اور آزادی کی قیمت اپنی جانیں دے کر ادا کی تھی۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، اس کی قوت گویا سلب ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے معلم علی نے اس کی طرف دیکھا اور بھارتی ہوئی آوازیں "خدا حافظاً کہہ کر کرے سے باہر نکل آیا۔"

مقوڑی دیر بعد جب وہ گھوڑے پر سوار ہوا تھا تو فرحت اور اس کی ماں بالائی منزل کے دیچے میں کھڑی بیٹھ دیکھ رہی تھیں۔ جب معلم علی اور اس کے ساتھی حویلی سے باہر نکل گئے تو فرحت بے اختیار عابدہ کے ساتھ پٹ لپٹ گئی۔ "امی جان! اس نے سسکیاں لینے ہوئے کہا۔" دعا کیجئے کہ خدا انہیں فتح دے۔



موسم برسات ختم ہو چکا تھا۔ بھاؤ نے نار و شکر کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلی کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر پیش قدمی کی اور دلی سے اسی میل دور شمال کی طرف جانا کے کنارے افغانوں کے مشہور قلعہ کنچ پورہ پر حملہ کر دیا۔ بنجابت خاں دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس قلعہ کی حفاظت پر متعین تھا لیکن مرہٹوں کے سیلاب کے آگے اس کی پیش رفت گئی۔ انھوں نے گاردی کے کوچانے کی گولہ باری کے بعد طعنہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ بنجابت خاں اور سرسند کے سابق گورنر عبدالصمد خاں کے علاوہ ہزاروں سپاہیوں کو تین کر ڈالا۔ اس قلعے سے مرہٹوں کو اسلحہ اور بارود کے علاوہ رسد کے وہ ذخائر دستیاب ہوئے جو احمد شاہ ابدالی کی فوج کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

دریائے جناطیانی کے باعث ناقابل عبور تھا اور احمد شاہ ابدالی انتہائی رنج و ملال کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے مرہٹوں کے ہاتھوں اپنے بہترین ساتھیوں کے قتل عام کی خبریں سن رہا تھا لیکن جب مرہٹے کنچ پورہ کے خزانے لوٹنے کے بعد دوسرے کی خوشیاں منا رہے تھے، احمد شاہ ابدالی دلی سے بیس میل شمال کی طرف باغیت کے قریب جانا نکلا۔ کشتیوں کے بغیر وہاں بھی دریائے جنا کو عبور کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ فوج کے افسر اور سپاہی دریا کی خستہ گسٹیں مریں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے لیکن کسی کو امیر لشکر کے حکم سے سر تابی کی مجال نہ تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے توہیں ہاتھیں پر لاد دی گئیں اور سواروں کے دستے دریا کے کنارے صفت بستہ کھڑے ہو گئے۔ پھر امیر لشکر نے "اللہ اکبر" کہہ کر گھوڑے کو اڑھ لگائی اور دریا میں کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، نصیر خاں بلوچ، مراد خاں ایرانی، برغزملہ خاں، شاہ دلی خاں، جہان خاں اور دوسرے افغان ایرانی، بلوچ اور رد پہلے سرداروں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور پھر ان کی آن میں پوری فوج دریا کی موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

مقوڑی دیر بعد جب یہ لشکر دریا کے پار پہنچ چکا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے عقب



تھا اور اب وہ یہاں سے چھ کوس دور دشمن کی ایک چوکی کا صفایا کرنے جا رہا ہے، پھر یہ علاقہ باطل محفوظ ہو جائے گا اور ہم اپنی پیش قدمی جاری رکھ سکیں گے۔

اگلی رات مرہٹہ چوکی کے چند سپاہی جو روہیلہ دستوں سے جان بچا کر بھاگے تھے ان کا کیا ہو گئے تھے، بھڑا جی کو یہ بتا رہے تھے کہ ابدالی کے لشکر نے اچانک دریا عبور کر کے ہماری چوکی کا صفایا کر دیا ہے۔

بھڑا جی نے مرہٹہ سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی فوج کو پانی پت کی طرف ہٹا لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شکر کے قریب پڑا ڈال دیا احمد شاہ ابدالی نے بھی پانی پت کا رخ کیا اور مرہٹہ کیمپ سے آٹھ میل دور پڑا ڈال دیا۔ مرہٹوں نے ابراہیم گاردی کی ہدایات کے مطابق شہر اور اپنے کیمپ کے گرد ساٹھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ گہری خندق کے پیچھے مٹی کے بلند پلٹے پر جگہ جگہ توپیں نصب کر دیں۔ بھڑا کو امید تھی کہ اس کی پٹھانہ فوج احمد شاہ ابدالی کے سرداروں کے راستوں پر حملہ کر کے اسے حملے پر مجبور کر دے گی لیکن ابدالی، مرہٹہ پر سالار کی نسبت کہیں زیادہ تجربہ کار اور دور اندیش تھا۔ وہ دشمن کی خواہش کے مطابق اپنی فوج کو اس کی توپوں کے سامنے لائے پر تیار نہ ہوا۔ اس نے ارد گرد کے جنگلات سے پیشاور درخت کوٹائے اور پڑاؤ کے ارد گرد گڑی کے کھیموں کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ابدالی کے اس اقدام سے مرہٹے ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ اپنے بھاری توپخانے کو ایک فیصلہ کن حربہ سمجھتے تھے لیکن بھاری ساز و سامان سے لیس ہونے کے باعث بدلے ہوئے حالات کے مطابق جنگ کا کوئی نیا نقشہ تیار کرنے کے قابل نہ تھے۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے خندق کھودی تھی کہ احمد شاہ ابدالی ایک طوفان کی طرح آگے بڑھے گا اور ان کی توپیں خندق کے ارد گرد افغان سپاہیوں کے ڈھیر لگا دیں گی لیکن اتنی بڑی تیاری کے بعد انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کیا سوچ رہا ہے۔ افغان لشکر اگر کھلے میدان میں نکل کر حملہ کرتا تو مرہٹے ابدالی کے ہر سوار کے مقابلے میں کم از کم پانچ

سے گھوڑوں کی ٹاپ سائی دی۔ ابدالی کی فوج کے چند دستوں نے کسی غیر متوقع حملے کے منتظر آگے بڑھ کر صفیں باندھ لیں۔ چند تینے بعد میں سواروں کا دستہ نمودار ہوا۔ اگلی صفت سے کسی نے بلند آواز میں کہا: یہ ہمارے ساتھی ہیں انھیں آنے دو۔ اکبر خاں اور معظم علی ان سواروں میں سب سے آگے تھے وہ اپنے گھوڑوں سے اتر کر بھاگتے ہوئے لشکر کی صفوں میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ عجیب الدولہ، حافظ رت خاں اور دد سیکھنڈ کے دوسرے سرداروں سے باتیں کر رہے تھے۔ معظم علی کہہ رہا تھا: یہاں سے صرف چھ کوس کے فاصلے پر مرہٹوں کی ایک چوکی ہے اور اس چوکی کا صفایا کرنے کے بعد یہ علاقہ ہمارے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ وہاں سپاہیوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں۔ مرہٹے اس وقت دھڑ کا جتن مٹا رہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ چند تیز رفتار دستے بھیج دیئے جائیں تو میں دوپہر سے پہلے پہلے ان کا صفایا کر سکتا ہوں۔

حافظ رحمت خاں نے کہا: ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ چلیے آپ ہماری رہنمائی کریں۔

ہمارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر معظم علی نے ایک فوجان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

فوجان نے کہا: لیکن میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔

معظم علی نے اسے بازو سے پکڑ کر گھوڑے سے اُتارتے ہوئے کہا: تم سن چکے ہو کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

اکبر خاں نے اس کی تقلید کرنا شروع کیلیں کہ ایک سپاہی کا گھوٹا پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی چار سو سوار لشکر کی صفوں سے نکل کر دربار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے اور عجیب الدولہ، احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا: عالیجاہ! اس کا نام معظم علی ہے اس نے دو دن قبل اس علاقے میں دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے دریا عبور کیا



اور اطاعت کے جذبات سے مغلوب ہو کر گردن جھکا لی۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا: "بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا"۔  
اکبر خاں نے گردن اٹھائی: "اس کی چمک دار آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے گٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا: "عالیجاہ! میری صرف ایک خواہش ہے اور وہ آپ کے سوا کوئی پوری نہیں کر سکتا۔"

کہو:"

• عالیجاہ! میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرہٹے دوبارہ اس سرزمین میں پاؤں نہ رکھیں۔ اور ان الفاظ کے ساتھ اکبر خاں کی آنکھوں سے آنسو پک پڑے۔  
احمد شاہ ابدالی نے کہا: "بیٹا خدا مجھے ہمت دے۔ تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی"۔  
اب میں تمہیں ایک حکم دیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد تمہیں تنہا دشمن کے مقابلے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مرہٹوں کا یوم حساب شروع ہونے والا ہے اور میں تمہیں اس دن کے لیے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش اس ملک میں چند اور نوجوان تم جیسے ہوتے؟"

اکبر خاں نے کہا: "عالیجاہ! میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس کا بچپن میرے بچپن سے اور جس کی جوانی میری جوانی سے بہتر تھی اور جواب بھی میرے لیے باعث رشک ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"عالی جاہ! وہ چھاپا بارہ سید دستوں کا سالار ہے اور میں نے سب کچھ اسی سے سیکھا ہے۔"

۱۹ نومبر کو گاردی نے اپنی پیادہ سپاہ کے ساتھ حملہ کیا لیکن اسے شدید نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونا پڑا ہوا۔ تین دن بعد سندھیا نے یکے بعد دیگرے دو حملے کیے

سوار لا سکتے تھے۔ پھر اگرچہ اقل میں مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ان کی بیویاں نہ ہوتیں تو ان کے بیلے پسپا ہو کر جنگ کے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوتا۔ اب ان کے لیے پڑاؤ سے باہر ہر جگہ غیر محفوظ تھی۔ اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی کی فوج ہر وقت حالات کے مطابق نقل و حرکت کر سکتی تھی۔ ابدالی کے سپاہی بھاری توپوں کی بجائے ایسے نیرزوں تلواریں، ہندو قلوں اور گھوڑوں پر بھروسہ رکھتے تھے۔

فریقین کے کیمپوں کے درمیان قریباً آٹھ میل کے خلا میں روزمرہ انفرادی شجاعت کے واقعات دیکھے جاتے تھے کبھی کوئی مرہٹہ ماتھے پر تلک لگا کر اپنے پڑاؤ سے نکلتا اور مسلمانوں کے پڑاؤ کے سامنے گھوڑا رک کر کسی افغان، کسی ایڑلی، یا کسی بلوچ کو مقابلے کی دعوت دیتا۔ اسی طرح افغان فوج کے جوان گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے پڑاؤ سے نکلتے اور مرہٹہ کیمپ کی خندق کے پل کے قریب رک کر انہیں دعوت مبارزت دیتے۔ ابدالی کے کیمپ میں ایک نوجوان کی زندہ دلی اور جرأت کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں۔ وہ ہر روز ایک نئے بھین میں اپنے کیمپ سے نکلتا اور دشمن کے دو چار سرداروں کا غرور خاک میں ملا کر واپس آتا۔ ابدالی کے جانشین اسے کبھی افغان، کبھی بلوچ، کبھی مغل اور کبھی روہیلہ سپاہی کے لباس میں دیکھتے اور داد و تحسین کے نعرے بلند کرتے۔ چند شاندار معرکوں کے بعد وہ نصیر خاں، ح سہ باب پشکا، ملک جہان خان سے ایک تلوار، شجاع الدولہ سے ایک گھوڑا اور نجیب الدولہ سے ایک بندوق بطور انعام حاصل کر چکا تھا۔

یہ نوجوان اکبر خاں تھا۔ ایک دن احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا اور کہا: "بیٹا میں تمہارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور تم اپنے آپ کو میری طرف سے بہترین انعام کا مستحق ثابت کر چکے ہو۔ تمہاری کوئی ایسی خواہش ہے جو میں پوری کر سکتا ہوں؟"

اکبر خاں نے انسانی سطوت و جبروت کے اس پیکر عظم کی طرف دیکھا اور محبت

لیکن اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۷ دسمبر کو رد سہیلوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی جھڑپ بلونت راؤ میہنڈیل کے دستوں کے ساتھ ہوئی، سخت لڑائی کے بعد بلونت راؤ مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ روسیوں نے شکست خوردہ دستوں کا تعاقب کیا اور مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئے اور شام تک تباہی پھانے کے بعد واپس چلے آئے۔

قریباً اڑھائی ماہ فریقین کے درمیان اس طرح کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس عرصہ میں دونوں فوجوں کے سامنے سپاہیوں کے لیے رسد اور گھوڑوں کے لیے چارے کی ذرا سی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ مرہٹہ فوج کو زیادہ تر رسد دلی کے قلعہ دار نادر شکر کی طرف سے سمیٹتی تھی۔ نجیب الدولہ نے امیر لشکر سے مشورہ کرنے کے بعد معظم علی کی قیادت میں اپنی فوج کا ایک حصہ مرہٹوں کی رسد و ملک کے راستوں پر چھاپے مارنے کے لیے بھیج دیا۔ چند دن کے بعد یہ چھاپہ مار دستہ دلی اور پانی پت کے درمیان آمد و رفت کے تمام راستے بند کر چکے تھے اور مرہٹہ فوج قحط کا سامنا کر رہی تھی۔

افغان فوج کو زیادہ تر رسد روسیکھنڈ کے علاقوں سے ملتی تھی۔ بھادو صاحب نے بھیل کھنڈ میں گوبند پتھ کو صورت حالات سے باخبر کیا اور اس نے بارہ ہزار تیرہ سواروں کے ساتھ روسیکھنڈ پر لیٹار کر دی۔ چند دن میں وہ رد سہیلوں کے کئی علاقے تباہ و برباد کرنے کے بعد مرہٹہ تک پہنچ چکا تھا اور افغان اخراج کو خوراک کی ترسیل بند ہو چکی تھی۔ اب مرہٹہ کیمپ کی طرح افغان فوج کے پڑاؤ میں بھی قحط کے اثرات محسوس کیے جا رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے جرنیلوں نے اسے مشورہ دیا کہ ہمیں یا تو فوراً مرہٹوں پر حملہ کر دینا چاہیے یا یہاں سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ ورنہ ہمیں چند دنوں تک ایک خطرناک قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ احمد شاہ ابدالی کا جواب یہ تھا: ”تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ انتظار کرو اور دیکھو، ہمارے مقدّر میں فتح ہے پسپائی نہیں“۔

احمد شاہ ابدالی کی جوابی کارروائی یہ تھی کہ اس نے مرہٹوں کے کیمپ کے گرد اپنا گھیرا

جنگ کرنا شروع کر دیا اور اپنے اور دشمن کے پڑاؤ کے درمیان پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک اور چوکی قائم کر دی اور وہاں اپنے لیے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا تیر نصب کر دیا۔ یہ چھوٹا سرخ خیمہ اس عظیم فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا جو اپنی توار کی نوک سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا صفحہ لٹنے والی تھی۔ احمد شاہ ابدالی دن بھر گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی سردنی چوکیوں کا معائنہ کرتا اور بسا اوقات اسے ایک دن میں پچاس ساٹھ میل سواری کرنی پڑتی۔ رات کے وقت اس کی لگی چوکی کے سپاہی دشمن کے پڑاؤ تک پہنچ جاتے اور بانی فوج کے کئی دستے مرہٹوں کی رسد و ملک کے راستوں پر چھاپے مارتے۔

۷ دسمبر کو احمد شاہ ابدالی کے ایک جرنیل عطاریاں کی قیادت میں سواروں کی ایک فوج نے ایک دن میں پچاس میل لیٹار کر کے گوبند پتھ کو جا لیا اور بارہ ہزار مرہٹوں کے اس لشکر کو تیغ کر ڈالا جو کئی دن سے رسد و ملک کے راستوں پر حملے کر کے افغانوں کو پریشان کر رہا تھا۔ چند دن بعد معظم علی اور اکبر خاں نے رات کے وقت مرہٹہ کیمپ کے ان دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو گھوڑوں کے لیے چارالاش کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔

۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو دلی سے ایک قافلہ جو مرہٹہ فوج کے لیے رسد اور تنخواہیں لے کر آ رہا تھا، افغان چھاپہ مار دستوں کے نرغے میں آ گیا اور اس قافلے کے بہت کم آدمی ایسے تھے جنہیں افغان سواروں نے بچ نکلے کا موقع دیا۔ اب مرہٹہ کیمپ پر بیجاگڑی، بے بسی اور خوف چھایا ہوا تھا۔ قریباً چار لاکھ انسان ایک ایسے پڑاؤ میں بری طرح گھرے ہوئے تھے جہاں دشمن کا انتظام ناممکن تھا۔ سیکڑوں آدمی روزانہ بھوک سے مر رہے تھے اور سیکڑوں غلاظت اور قلعش کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ فوج جو اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے نش میں غرور تک پہنچنے کا غرور لے کر نکلی تھی، اب کیمپ سے باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مرہٹے دن بھر اپنے پڑاؤ

کے چاروں طرف افغان شہسواروں کے تیز رفتار گھوڑوں کے سہول سے اٹھنے والا گدو غبار دیکھتے تھے اور موسم سرما کی طویل اور اداس راتیں گزارنے کے بعد جب وہ صبح کے وقت بیدار ہوتے تھے تو انہیں اپنے خیموں میں دشمن کی گولیوں کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ بھوک سے مرنے والے انسانوں، گھوڑوں اور سیلوں کی لاشوں کا تقفن میلوں تک پھیل چکا تھا۔ فضا میں دن بھر چیلوں اور گدھوں کے غول نظر آتے تھے۔



ایک دن احمد شاہ ابدلی کے خیمے میں فوج کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ صلح کنے کے لئے مرہٹوں کی پیشکش پر غور کیا جا رہا تھا۔ شجاع الدولہ جس کی واسطت سے مرہٹوں نے صلح کے لیے سلسلہ جھنڈائی کی تھی، احمد شاہ ابدلی سے کہہ رہا تھا: عالمیجاہ! مرہٹے فاکٹش سے تنگ آچکے ہیں اور وہ صلح کے لیے ہماری ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔ اگر ان کی پیشکش ٹھکرا دی گئی تو انہیں مجبوراً میدان میں آنا پڑے گا اور اس گئی گزری حالت میں بھی ان کی فوجی قوت ایسی نہیں کہ انہیں آسانی سے شکست دی جاسکے۔ وہ دلی خالی کر کے واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان سے یہ وعدہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ دوبارہ شمال کا رخ نہیں کریں گے، اگر ہم لڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجیب الدولہ ہزاروں جانیں ضائع کرنے پر کیوں مصر ہیں؟

نجیب الدولہ نے کہا: "عالمیجاہ! ہمارا مقصد مرہٹوں کو بانی پت کے میدان سے بھگانا نہیں بلکہ اس طاقت کو ختم کرنا ہے جو اس ملک میں مسلمانوں کی عزت اور بقا کے لیے ایک خطرہ عظیم بن چکی ہے۔ مرہٹے اب لڑے بغیر اس بے واپس جانا چاہتے ہیں کہ انہیں لڑائی میں اپنی تباہی نظر آتی ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ زیادہ تیاری کے بعد واپس نہیں آئیں گے؟"

شجاع الدولہ نے کہا: "ان کے سامنے یہ شرط پیش کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے چند

سرداروں کو بطور بریغالی ہمارے پاس چھوڑ دیں۔"

نجیب الدولہ نے جواب دیا: "ہمارا معاملہ چند سرداروں کے ساتھ نہیں، مرہٹہ قوم کے ساتھ ہے جو پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا عزم کر چکی ہے، اگر چند سرداروں کی جان کا خطرہ اس کے ارادوں میں حاوی ہو تو اسے نئے سردار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ مجھے اپنے اکابر کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے جو ایک ایسے دشمن کے ساتھ سودا بازی سے زندہ رہنا چاہتے ہیں جس کی پوری تاریخ ریاکاری، بے مہدی اور محو فریب کی داستانوں سے لبریز ہے۔ میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا جن کے ہاتھ میری قوم کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہمارا سابقہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو حالات کے مطابق اپنا طریق کار بدلتا رہتا ہے۔ جو طاقت ور کے سامنے خمیر اور کردور کے سامنے شیر بن جاتا ہے۔ میں مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کرنے سے پہلے اپنے معزز دوست سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ ہمارے ساتھ بحث کرنے سے پہلے اپنی فوج کے کسی معمولی سپاہی کے ساتھ مشورہ کر لیں۔ اگر وہ یہ کہے کہ مرہٹوں کے یہاں سے زندہ اور سلامت بچ نکلنے کے دو یا تین سال بعد لکھنؤ کی گلیاں ان کی لوٹ مار اور قتل و غارت سے محفوظ رہیں گی تو میں اپنا موقف بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاؤں گا۔ مرہٹوں کی منزل مقصود بانی پت نہ تھی۔ ان کی نگاہیں کابل، ہندو شاہ اور غزنی پر تھیں۔ اب وہ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا یہاں آنا ایک احمقانہ فعل تھا اور ان کا یہ سمجھ لینا بھی ایک حماقت تھا کہ ہم انہیں بند کر کے ان کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اب ان کے لیے اپنی غلطی کی تلافی کی یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے جائیں اور ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر اگلے سال یا اس سے اگلے سال زیادہ تیاریوں کے ساتھ واپس آئیں۔ اگر ہم نے انہیں صبح سلامت بچ نکلنے کی اجازت دی تو مستقبل کے مورخ ہمیں ان کی نسبت کہیں زیادہ احمق خیال کریں

گئے۔ میں آئندہ کسی وقت ان کے ساتھ لڑنے کی بجائے آج ہی ان سے پیٹ لینا بہتر سمجھتا ہوں اور اگر میرے معزز دوست حقیقت پسندی کا ثبوت دیں تو انہیں بھی یہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مرہٹے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول کے قائل نہیں۔ اگر وہ جنگ کے میدان سے بچ نکلنے کے لیے ہمارے ساتھ مصالحت کر لیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ واپس جاتے ہوئے مہاراشٹر تک راستے کی بستیوں اور شہروں کو لاکھ کے انبار بنا کر نہیں رکھ دیں گے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جس تلوار کو وہ ہمارے سپاہیوں کے سامنے بے نیام کرنے سے ہچکچاتے ہیں وہ ان کے راستے کے نہتے اور بے بس انسانوں کے قتل عام سے دریغ کرے گی؟

عالیجاہ! میرے حلق میں چیخوں کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلت و رسوائی کے دلگراں مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے روسیکھنڈ کی بستیوں اور دی کے بازاروں میں ان درندوں کو انسانیت کا منہ فوچتے دیکھا ہے۔ میں ان کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کر سکتا اور نواب شجاع الدولہ کو بھی میں یہ مشورہ دوں گا کہ انھیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے روسیکھنڈ کی طرح اودھ کی سرحدوں پر بھی کوئی ایسی دیوار دکھائی نہیں دیتی جو مرہٹوں کی جارحیت کو روک سکتی ہو۔ مجھے تو ان سے یہ بات بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ وہ نواب شجاع الدولہ کی کوششوں کے طفیل یہاں سے بچ کر نکلیں گے اور واپس جاتے ہوئے لکھنؤ میں اپنی وحشت اور بربریت کی ناقابل فراموش یادگار چھوڑ جائیں گے۔

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ "نجیب الدولہ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے، اگر آپ حضرات کی رائے یہی ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ بہ حال جنگ کی جائے تو میں تیار رہنا چاہیے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میری فوج کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔"



۱۳ جنوری ۱۷۹۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا۔ طلوعِ سحر کے ساتھ مرہٹہ فوج نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پٹاؤ سے نکل کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ان کے میسرہ پر گاردی کے تربیت یافتہ دستے تھے اور اس کے ساتھ لگیوار کی وجہ تھیں۔ سیمند میں ملہار راؤ بھکر اور جنکو جی سندھیا تھے۔ قلب شکر میں بھاؤ اور لیٹو اش راؤ ایک جنگی ہاتھی کے بودج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لشکر کے قلب میں ابدالی کا وزیر اعظم شاہ ولی خان تھا اور اس کی کمان میں درانی فوج کے وہ آزمودہ کار جانا جاتے جو کئی میدانوں میں دلا شجاعت دے چکے تھے۔ میسرہ پر شاہ لہند خاں اور نجیب الدولہ تھے۔ شجاع الدولہ کی افواج میسرہ اور قلب شکر کے درمیان تھیں۔ مہمند کی قیادت برہم دار خاں کے ہاتھ میں تھی اور روسیل، مغل اور بلوچ سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی عقاب ننگا ہوں سے میلان جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ برق رفتار سواروں کی ایک جماعت فوج کے جرنیوں اور سالاروں کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایت پہنچانے میں مصروف تھی۔ جنگ کی ابتدا مرہٹوں کی آتشبازی سے ہوئی اور اس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روسیل دستوں پر سنگینوں سے حملہ کر دیا۔ روسیلوں کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کو ایک عام حملے کا حکم دیا اور افغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کر دیں۔ پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ گرد و غبار کے بادلوں میں گھوڑوں کی ٹاپ، توپوں کی دھندلاہٹ، بندوقوں کے دھماکوں، تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخ پکار کے ساتھ ایک طرف سے اللہ اکبر اور دوسری طرف سے "ہر ہر مہادیو" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ شاہ ولی خاں نے

افغانوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر پوری قوت سے چلایا: میرے رفیق! تم کہاں جا رہے ہو؟ ہمارا وطن بہت دور ہے۔ لیکن اس کی آواز جنگ کے مہیب ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔ جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا پانسہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ افغانوں کے میمنہ اور قلب لشکر میں افزائری پھیل چکی تھی لیکن میسرہ کی افواج ابھی تک پوری طرح منظم تھیں۔ نجیب الدولہ جوابی حملہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی افواج پوری شدت کے ساتھ مرہٹوں پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔ نجیب الدولہ کے پیادہ سپاہی دشمن کی صفوں پر ہواٹیاں اور گولے پھینکتے اور جب دشمن پیچھے ہٹتا تو تیز بہادری سے بڑے معظّم علی کی کمان میں ایک ہزار روہیلہ سوار تھے اور ان میں سے اکثر اکبر خاں کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے مرہٹہ لشکر کے میمنہ پر حملہ کیا اور چند منٹ کے اندر اندر جنگجو مسدھیا کی فوج کی کئی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ اس کے بعد دوسرے روہیلہ سردار اور نجیب الدولہ کے چند دستے اس کے ساتھ جا ملے اور انھوں نے مل کر پے درپے حملے کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔ سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا لیکن لڑنے والوں کو گرد و غبار کے بادلوں میں اس کے صرف دھندلے سے آثار نظر آتے تھے۔ جنگ اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ جب ہر دقت فریقین میں سے کسی ایک کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ اس ہنگامہ محشر میں جس شخص کے چہرے پر اضطراب، گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے وہ احمد شاہ ابدالی تھا۔ اس کی پیشانی پر اپنے سپاہیوں کے لیے فتح کی بشارت لکھی ہوئی تھی۔ مرہٹے اپنی ساری قوت میدان میں لا چکے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی کے ترکش میں ایک آخری تیرا بھی باقی تھا۔ دوپہر کے وقت اس نے اپنی محفوظ فوج کے ان چودہ ہزار سواروں کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ جنھیں جنگ شروع ہونے سے قبل میدان سے پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہر محاذ سے

اپنے جرنیوں کو فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اب گرد و غبار کی یہ حالت تھی کہ زمین اور آسمان میں تیز کرنا مشکل تھا۔ ابدالی کے محفوظ دستے اس کے شکر کے عقب سے ایک آدھ کی طرح نمودار ہوئے اور دشمن کے میمنہ اور میسرہ کی صفیں چیرتے ہوئے اس کے عقب میں جا پہنچے۔ تازہ دم فوج کے میدان میں آجانے سے محفوظ فوج کے دستے دشمن کی صفیں روندتے ہوئے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف نکل جلتے تھے۔ سواروں کے قریب لشٹاش راؤ گولی گئے سے زخمی ہو گیا۔ بھاؤ نے دل برداشتہ ہو کر آخری بار پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا اور بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سپہ سالار کی موت سے مرہٹوں کے حوصلے لپٹ ہو گئے اور شام کے چار بجے کے قریب ایک ایک ان کی ساری فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ فاتح فوج نے ان کا پیچھا کیا اور مرہٹہ کیمپ کی خندق لاشوں سے بھری۔ آفتاب کی دالیں نگاہیں کوسوں دور تک مرہٹوں کی تباہی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ابدالی کا لشکر چاندنی رات میں طلوع سحر تک مرہٹوں کا تعاقب کرتا رہا۔ اگلی صبح کیمپ میں پناہ لینے والے بچے کچھ دستوں پر بھی لیغاری گئی۔ لشٹاش راؤ زخمی ہونے کے چند گھنٹے بعد مر چکا تھا۔ میدان سے بھاگنے والی مرہٹہ فوج کا تعاقب کرنے والے صرف افغان اور بلوچ اور مغل ہی نہ تھے بلکہ قرب و جوار کے وہ دیہاتی جن پر مرہٹوں نے پانی پت میں قیام کیا۔ وہ دوران میں ان گنت مظالم کیے تھے۔ توادوں۔ برہمنوں اور لائٹوں سے مسلح ہو کر جگہ جگہ انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ مرہٹوں سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ دیہات کی عورتیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ مرہٹہ کیمپ کا مال غنیمت کسی بڑی سلطنت کے خزانوں سے کم نہ تھا۔ جو اہرات، سونے اور چاندی کے علاوہ ہزاروں بیل گاڑیاں، کوئی دو لاکھ مولی، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ اور پانچ سو ہاتھی افغانوں کے ہاتھ گئے۔

مرہٹہ فوج کے بیشتر سردار جنگ میں کام آچکے تھے۔ اگلے دن مرہٹوں کے

تغاب سے واپس آنے والے جنرل اور بڑے بڑے افسر احمد شاہ ابدلی کے سامنے باری باری اپنی کارگزاری کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔ دوپہر تک قریباً تمام فوج کیمپ میں جمع ہو چکی تھی لیکن معظم علی اور اس کی کمان کے چند دستے لاپتہ تھے۔ اکبر خاں اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے اسے رات کے پچھلے پہر ہلکے کے ساتھ فرار ہونے والے سپاہیوں کا تعاقب کرتے دیکھا تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اکبر خاں اس کی تلاش میں کیمپ کے اندر کئی چکر لگا چکا تھا اور نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سردار اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے، ایک کسٹم سپاہی نے جنوب مشرق کے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "شاید وہ آ رہے ہیں!"

اکبر خاں نے چونک کر دیکھا اور اسے دور حدنگاہ پر چند شتر سوار دکھائی دیئے، اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "لیکن وہ گھوڑوں پر تھے، یہ کوئی اور ہیں۔"

نجیب الدولہ نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ معظم علی ضرور آئے گا۔" اور اکبر خاں اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ "انہیں۔" اور آنا چاہیے۔ ہماری یہ شاندار فتح ان کے لیے جتنی۔ ہماری اس کامیابی پر ان سے زیادہ خوش ہونے کا حق نہیں۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم تینوں ہم ان کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ کسی جگہ دشمن کے گھیرے میں اپنے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "دشمن میں اب لڑنے کی جہت نہیں اور اس وقت کسی گھوڑے میں سوار کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی۔"

ہم پیدل جاتیں گے۔ اکبر خاں نے کہا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "اپنے ساتھیوں کو تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔ اگر

معلم علی شام تک نہ آیا تو ہم چند دستے اس کی تلاش میں بھیج دیں گے۔"

تھکاوٹ کے باعث اکبر خاں کے اعضاء ریشل ہو چکے تھے۔ وہ کچھ اور کہے بغیر زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شتر سوار کیمپ میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "اکبر اکبر! معظم علی آگئے!"

"کہاں ہیں وہ؟" اکبر خاں نے جلدی سے اٹھ کر سوال کیا۔

نوجوان نے اس کے جواب میں شتر سواروں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اکبر خاں بھاگ کر آگے بڑھا۔ معظم علی ایک اونٹ پر سوار تھا۔ اس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی تباخون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کی گردن بھی ہوئی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ڈھیلے ہاتھ سے اونٹ کی نیل پکڑ رکھی تھی۔

"بھائی جان بھائی!" اکبر خاں نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی نیل پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا، آپ زخمی تو نہیں؟"

معلم علی نے نیم بیہوشی کی حالت میں آنکھیں اوپر اٹھائیں اور تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اکبر خاں نے نیل کھینچ کر اس کا اونٹ بٹھا دیا اور معظم علی نیچے اتر پڑا۔ اکبر خاں کو اس کی آستین پر تازہ خون کے نشان دکھائی دیئے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھائی جان آپ زخمی ہیں۔"

معلم علی مسکرایا۔ "یہ معمولی خراش ہے۔"

"معلم علی! معظم علی! تم کہاں تھے؟" نجیب الدولہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بہت دور نکل گیا تھا۔" معلم علی نے یہ کہہ کر لوٹھراتے ہوئے نجیب الدولہ کی طرف چند قدم اٹھائے لیکن اچانک اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔



امیر، نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک سپاہی نے پانی کی جھاگل اتار کر اس کے منہ سے لگا دی، معظم علی نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا:

”آپ لوگوں کو مطلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔“

حافظ رحمت خاں نے اس کی اسٹین پیاٹر کر بازو کا زخم دیکھتے ہوئے کہا: ”بحر معمولی ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

ایک سپاہی نے اپنا پٹکا پھاڑ کر بازو باندھ دیا اور وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔

نجیب الدولہ نے کہا: ”اسے اٹھا کر میرے خیمے میں لے جاؤ۔“

”نہیں“ معظم علی نے خیمہ آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے تھوڑی دیر میں رہنے دیجیے۔“ چند ثانیے بعد معظم علی گری نذیر سو رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اب ادنیوں سے اتر کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان نجیب الدولہ کو بتا رہا تھا: ”ہم نے پاک میں تک دشمن کا پیچھا کیا تھا۔ ہمارے گھوڑے دم توڑ چکے تھے تو ہم پیدل ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ اونٹن ہم نے مر، بٹوں سے چھینے تھے اور ہمارے پچاس اور ساتھی پیدل واپس آ رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد بعد احمد شاہ ابدالی اپنے چند جرنیلوں کے ساتھ پڑاؤ میں گشت کرتا ہوا ادھر اُنکلا۔ یہ کون ہے؟ اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔ نجیب الدولہ نے جواب دیا: ”عالیجاہ! یہ معظم علی خاں ہے اور یہ ابھی مر بٹوں کے قتل سے واپس آیا ہے۔“

”اس کے زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟“

”نہیں عالیجاہ! یہ بہت تھک گیا ہے۔“

شاہ دلی خاں نے کہا: ”میں اسے میدان میں کئی بار دیکھ چکا ہوں اور اگر یہ اب تک دشمن کا پیچھا کر رہا تھا تو اس کا زہدہ رہنا معجزہ ہے۔“

ابدالی نے کہا: ”یہاں سردی ہے اسے خیمے کے اندر لے جاؤ۔“

اکبر خاں نے معظم علی کا بازو پکڑ کر لایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے ابدالی کو دیکھ کر اٹھا اور باادب کھڑا ہو گیا۔

ابدالی نے اس کے خون آلود کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور تمہیں اس سے بہتر لباس کی ضرورت ہے۔“ پھر اس نے اپنے ایک اسکر کی طرف دیکھا اور کہا: ”جاؤ اسے میرا لباس لا دو۔“

چند دن بعد احمد شاہ ابدالی کی افواج دلی کا رخ کر رہی تھیں۔ پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی۔ مگر، داماجی ٹیکوارا ناڈو شکر، ہادیو جی سندھیا اور نانا فرولیس کے سوا تمام بڑے بڑے مرہٹہ سردار مارے جا چکے تھے۔ ابراہیم گاردی جسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا، گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔ ٹمبشیر بہادر اور اناجی منگیشور، جو زخمی ہو کر بھاگے تھے۔ راستے میں مر گئے۔ مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنہیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اس فتح کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی لیکن وہ عظیم مقصد جس کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی، پورا ہو چکا تھا۔ شمالی ہندوستان میں پاؤں پھیلا، کے متعلق مرہٹوں کے عزائم ہمیشہ کے لیے خاک میں مل چکے تھے۔



## چودھوال باب

چند دن بعد افغان افواج دلی کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں اور شہر میں پانی پت کی فح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں عید کا سماں تھا۔ اہل شہر کے علاوہ فرج کے افسر اور سپاہی مسجد کے اندر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر کھلے میدان میں جمع تھے۔ نماز کے بعد احمد شاہ ابدلی کی عزت، اقبال اور دلائی عمر کے لیے دعا کی جا رہی تھی۔ دعا کے اختتام پر جب نمازی اٹھنے لگے تو خطیب نے بند آواز میں کہا۔ حضرت تھوڑی دیر ٹھہر جائیے، پانی پت کا ایک مجاہد آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ نمازی ہر تن گوش ہو کر منبر کی طرف دیکھنے لگے۔ معظم علی اٹھ کر منبر کے قریب پہنچا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔

”عزیزو اور بزرگو! پانی پت کی فح بلا شہر ہماری تاریخ کا شاندار کارنامہ ہے۔ ہمارے بعد آنے والی نسلیں یقیناً احمد شاہ ابدلی کو اپنا امن عظیم خیال کریں گی۔ انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں اس دشمن سے نجات دلائی ہے جو ہمیں بدترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑا چاہتا تھا۔ ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے لیکن اس وقت ہماری وعدوں کے سب سے زیادہ مستحق پانی پت کے وہ شہداء ہیں جنہوں نے ہماری عزت، ہماری آزادی اور ہماری بقا کے لیے اپنا خون پیش کیا ہے۔ آج ان گناہ شہیدوں کی رو میں ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ ہم

پانی پت کے میدان میں جا کر ان کی قبروں پر چراغ جلائیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ کسی وقت بھی اس مقصد سے انحراف نہ کریں جس کے لیے وہ اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ پانی پت کے شہیدوں نے ہمیں اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے اور اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ قدرت کسی گرتی ہوئی قوم کو بار بار سنبھالا نہیں دیتی۔

ہمارے عظیم محسن احمد شاہ ابدلی نے ہمیں اس وقت ایک نئی زندگی کا پیغام دیا ہے جب کہ ہمارے دروازے پر موت کا پہرہ تھا۔ انھوں نے ایک منتشر، مفلوک الحال اور مایوس قافلہ کو اکٹھا کر پھر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ ہماری اگلی منزل کیا ہے۔ ہماری ماضی کی وہ کسوٹی کو تاہیاں تھیں جن کے باعث مرہٹوں کی بربریت اور جنت کا طوفان اب تک پہنچ چکا تھا اور ہم سے ہمارے حال اور ہمارے مستقبل کے مطالبات کیا ہیں؟ احمد شاہ ابدلی اپنے حصے کا کام پورا کر چکے ہیں لیکن ہمارے حصے کا کام ابھی باقی ہے۔ پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی کرکٹ چلی ہے لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اگر ہم نے اپنی کمزوریوں کا علاج نہ کیا تو ممکن ہے کہ چند برس کے اندر اندر ہمیں مرہٹوں سے زیادہ خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے۔ بنگال میں ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ کرناٹک فرنگیوں کی شکار گاہ بن چکا ہے اور ان کی سازشیں دکن تک پہنچ چکی ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ابھر رہی ہے اور اگر ہم نے انہیں نہ کھولیں تو یہ بعید نہیں کہ ہمارے لیے اس ملک کی زمین تنگ ہو جائے جس پر ہم نے صدیوں حکومت کی ہے۔

حضرات! احمد شاہ ابدلی نے ہمیں ایک خطرہ عظیم سے نجات دلائی ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے جس کے مکینوں نے چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنا محافظ سمجھ رکھا ہو۔ ہماری بے بسی اور مظلومیت کا باعث وہ مفاد پرست

امراء میں جنہوں نے قوم کے مستقبل سے بے پروا ہو کر دلی کی عظیم سلطنت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ہماری مایوسی اور بددلی کا باعث وہ علاقائی سیاست ہے جو ہر ضابطہ اخلاق سے آگاد ہو چکی ہے۔ بنگال میں مٹھی بھرا انگریزوں سے ہماری شکست کا باعث وہ وطن فروش تھے جنہوں نے توہ کا ساتھ چھوڑ کر اپنا مستقبل انگریزوں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اور اگر آپ نے بنگال کے واقعات سے سبق نہ لیا اور اسی طرح انتشار اور لامرکزیت کی لغتوں میں مبتلا رہے تو بنگال کی تاریخ اس ملک کے ہر حصے میں دہرائی جائے گی۔ کسی قوم کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملت فروش اس کی عزت اور آزادی کے امین بن جائیں اور حریف طالع آزما اقتدار کی مسندوں پر چھن ہو جائیں۔ گذشتہ نصف صدی کے واقعات سے ہم پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ دنیا کسی کمزور قوم کو عزت اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں دیتی جو ملک انتشار اور لامرکزیت کا شکار ہوتا ہے وہ لامحالہ انسانی بیڑیوں کی شکار گاہ بن جاتا ہے۔

آج اس مسجد میں وہ لوگ موجود ہیں جن کی حقیقت پسندی ہمیں مستقبل کے خطرات سے بچا سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے باشعور لوگ ان جاہ لپندوں کے خلاف عوام کی قوتِ محاسبہ بلیڈ کریں جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری قوتِ مدافعت اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ ہم اپنے حقیر ترین دشمنوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے نہیں لڑی گئی ہے کہ ہمارے حکمران مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی مسندوں پر سوار بنیں یا انہیں کچھ عرصہ اور عیش و عشرت کی محفلیں آراستہ کرنے کا موقع مل جائے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے لڑی گئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ میں اس ملک کی حکومت کے دو مہمرازوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مہنسی سے سبق سیکھیں اور ان غلطیوں کا

اعادہ نہ کریں جن کے باعث بنگال میں ہم ایک عبرت ناک تباہی کا سامنا کر چکے ہیں اور میں عوام سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے گرد و پیش سے خبردار بنیں اور جب انہیں کوئی بیرونی حملہ آور لگا کر رہا ہو تو وہ میدان میں آنے سے پہلے یہ تسلی کر لیں کہ ان کی صفوں میں کوئی میر جعفر تو نہیں ہے!

حضرات! مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں۔ میں نے بنگال کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ میرا باپ، میرا بھائی اور میرے بہترین دوست بنگال پر قربان ہو چکے ہیں لیکن یہ بے لوث قربانیاں صرف اس لیے بے نتیجہ ثابت ہوئیں کہ بنگال کے عوام اس قدر بیدار نہ تھے کہ وہ عہدِ قوم اور وطن فروشوں کے درمیان تفریق کر سکتے۔ میں نے شہرت اور ناموری کے لیے پانی پت کی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا بلکہ میرے دل میں اگر کوئی ٹرپ تھی تو یہ تھی کہ ان بھیاٹک تارکیوں کو آپ کے گھروں سے ددر کھا جائے جو بنگال کے مسلمانوں پر مسلط ہو چکی ہیں اور آج میں نے آپ کے سامنے زبان کھولنے کی صرف اس لیے جرأت کی ہے کہ میں آپ کو ان خطرات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کر لینے کی صورت میں آپ کو پیش آسکتے ہیں۔

اختتام پر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو پانی پت کی جگ سے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے صمیم نتائج پیدا کرنے کی جرأت، ہمت اور طاقت دے۔ خدا ہمارے امراء اور حکمرانوں کو بھی یہ توفیق دے کہ وہ قوم کے لیے زندہ رہنا سیکھیں۔ معظم علی کی تقریر کے اختتام پر جب لوگ مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو ایک افغان افسر نے اس سے کہا: حضور بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں!

احمد شاہ ابراہی منبر سے تھوڑی دیر دلی کے اکابر اور اپنے سرداروں کے دربار میں کھڑے تھے۔ معظم علی ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے کہا: میں ایک مدت سے اس

کر کے قہار کھنڈھنا مشکل ہو جائے گا۔

معظم علی نے جواب دیا : کھنڈھ میرے سفر کی آخری منزل نہیں اور جب مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ دہاں رہ کر میری زبان میرے ضمیر کا ساتھ نہیں دے سکتی تو میں اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنے میں تکلیف محسوس نہیں کروں گا۔

نجیب الدولہ نے چند ٹاپے سوچنے کے بعد کہا : "میں نے شجاع الدولہ کو سمجھا دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ تم کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کسی وقت تم کو کھنڈھ کی آب و ہوا اس نائے تو قہار سے لیے دلی کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اگر اس وقت بھی تم پسند کرو تو میں تم کو فرج میں بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا : "ابھی دلی کے حالات اس قابل نہیں کہ میرے دل میں ملازمت کا شوق پیدا ہوا۔ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ میں یہاں اگر کوئی مفید کام کر سکتا ہوں تو آپ مجھے ایک رضا کار کی حیثیت میں یہاں موجود پائیں گے مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد دلی کے حالات کیا ہوں گے مجھے آپ کے تدبیر اور فراست پر اعتماد ہے لیکن جب تک دلی کے تخت پر کوئی اولوالعزم حکمران نہیں بیٹھتا میرے نزدیک دلی اور کھنڈھ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہماری بڑبڑتی ہے کہ اسی عظیم الشان فتح کے بعد اس ملک کے اکابر قوم کا مستقبل کسی ایسے حکمران کو نہیں سونپ سکے جس کی سیرت اور کردار رعایا کی آزادی اور بقا کی ضمانت دے سکتا ہو۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قابلیت کے بغیر کوئی شخص اپنے سر پر تاج پہننے کا پیدائشی حق رکھتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ہم اپنے نام نہاد حکمرانوں کی نااہلیت کے باعث بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ قدرت نے ہمیں زندہ رہنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن کاش ہمارا وہ من جس نے ہمیں مرہٹوں کی جارحیت سے نجات دلائی ہے ہمیں یہ مرہہ بھی دنا سکتا کہ دلی کے تخت کے لیے ایک انسان کی ضرورت ہے اور اس ملک

ملک کے کسی آدمی کے من سے ایسی باتیں سننے کا منظر تھا۔ اگر ہندوستان کے ہر علاقے میں قہار سے جیسے صبح الخیال لوگ جاگ اٹھیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ قوم تباہی سے بچ سکتی ہے۔" پھر انھوں نے ایک نانیہ کے لیے شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا : "لیکن اگر تم کسی مرحلہ پر یہ محسوس کرو کہ اس ملک میں تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں تو سیدھے میرے پاس پہنچ جاؤ۔ دہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق گوئی کی قدر کرنا جانتے ہیں۔"



اگلے دن معظم علی ظہر کی نماز ادا کر کے جامع مسجد سے نکل رہا تھا کہ اسے نجیب الدولہ کی فرج کا ایک سپاہی دکھائی دیا۔  
"آپ کو امیر الامار نے یاد فرمایا ہے!" سپاہی نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت فرج کے پڑاؤ میں ہیں۔ چلیے!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی پڑاؤ کے ایک عالی شان خیمے کے اندر نجیب الدولہ کے سامنے کھڑا تھا۔ نجیب الدولہ نے کسی تمہید کے بغیر کہا : "کل مسجد میں قہار سے منہ سے میرے دل کی آواز نکل رہی تھی لیکن شجاع الدولہ تمہاری تقریر سے بہت پریشان ہیں۔ وہ صبح مجھ سے ملے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سب ان کے متعلق تھا۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ یہ ذہوان کھنڈھ پہنچ کر میرے لیے سروردی کا باعث بنے گا۔ وہ اس سے پہلے بھی تم پر زیادہ خوش نہ تھے لیکن کل تمہاری تقریر نے انہیں بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا : "میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔"

"میں تمہاری حق گوئی کا معترف ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شجاع الدولہ کو ناراض

کے امراء کا یہ فرض ہے کہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو قوم کی سیادت سونپ دیں۔ خدا کرے دلی کی حکومت کے نئے دعویدار سے آپ کی توقعات درست ثابت ہوں لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ صبح معنوں میں مکران ثابت ہوگا یا صرف یہاں کے بادشاہ گروں کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا ہوگا۔

”تم جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں تمہارا ہم خیال تھا لیکن مغل امراء کا یہ مطالبہ تھا کہ دلی کے تخت پر کسی جائز وارث کو بٹھایا جائے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”میرے نزدیک صرف وہ بات جائز ہوتی ہے جو صحیح بھی ہو۔ شاہ عالم کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ دلی کی سازشوں سے خوفزدہ ہو کر کہیں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور جن امراء نے اسے تخت پر بٹھانے کے لیے بہت زیادہ زور دیا ہے، وہ صرف اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اپنے مقتول باپ سے زیادہ کمزور ثابت ہوگا۔ میرے لیے اگر کوئی بات اطمینان بخش ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ دلی میں احمد شاہ ابدالی کے مانند رہیں گے اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ نیا شہنشاہ کسی دن آپ سے مزید پھر کر ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بن جائے جس سے پیشتر کسی کھلونے کو چکے ہیں۔“

”تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ شاہ عالم ایک ناکام مکران ثابت ہوگا؟“

”میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ ایک کمزور آدمی ہے اور اس کی بادشاہت ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوگی مجھے جلا وطنی کی حالت میں اس کی بے بسی کا احساس ہے لیکن مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ تخت پر بیٹھ کر شاید وہ زیادہ بے بس ثابت ہوگا۔“

نجیب الدولہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: ”تم کب واپس جا رہے ہو؟“

معظم علی نے جواب دیا: ”میں صرف اس امید پر ٹھہر گیا تھا کہ شاید احمد شاہ ابدالی واپس جانے کا خیال ترک کر دیں اور جنوب کی طرف پیش قدمی کریں۔ میں انہیں ہمارا شہر کے

میدانوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب میں دو تین دن تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ نجیب الدولہ نے کہا: ”یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔ اگر افغان ہڑا

فاغت نہ کرتے تو شاید اس وقت تک ہمارے گھوڑے دیباے نہ کاپانی پی رہے ہوتے لیکن میں تمہیں پھر ایک بار یہ مشورہ دوں گا کہ تم کھنڈر جا کر محتاط رہو۔ شجاع الدولہ ایک منقسم المزاج آدمی ہے۔ اگر اس کے دماغ میں یہ بات سماگئی کہ تم اسے پسند نہیں کرتے تو وہ تم سے نجات حاصل کرنے کے ہزاروں بہانے تلاش کرے گا میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنا دشمن بنانے کی بجائے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرو۔ جو سکتا ہے کہ تمہارے خیالات سے متاثر ہو کر وہ قوم کی بھلائی کا کوئی کام کر سکے۔“

معظم علی سر کیا۔ ”قوم کی بھلائی کے لیے میں ایک حقیر ترین انسان کے پاؤں پر سر رکھنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“

”اور تمہیں شاہ عالم کے متعلق اپنے خیالات کے انکار میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔“

نواب شجاع الدولہ اور ان کے ہم خیال امراء ان کے بہت زیادہ طرف دار ہیں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ انہیں ایک کارآمد کھلونا سمجھتے ہیں۔“

معظم علی نجیب الدولہ سے ملاقات کے بعد پڑاؤ میں اپنے خیمے کے قریب پہنچا تو

اکبر خاں باہر دھوپ میں بیٹھا ایک فوجیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی کو دیکھتے ہی اکبر خاں

نے اٹھ کر کہا: ”بھائی جان یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

معظم علی انہیں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد چٹان پر بیٹھ گیا۔

اجنبی نے کہا: ”میرا نام اسد خاں ہے۔ میں میسور سے حیدر علی کا ایک خاص پیغام

لے کر احمد شاہ ابدالی کے پاس آیا تھا۔ کل مسجد میں میں نے آپ کی تقریر سنی تو میرے دل

میں آپ سے متعارف ہونے کا شوق پیدا ہوا۔“

آپ احمد شاہ ابدالی سے مل چکے ہیں؟“

جی ہاں! اور دین دن تک میں واپس جا رہا ہوں۔ کل آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے فوج کے ایک سپاہی سے آپ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی تھیں میں نے ہر ضروری خیال کیا کہ آپ کو کسی دلی میسرور نے کی دعوت دوں ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق آپ جو خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ انشاء اللہ میسرور پورے ہوں گے۔ حیدر علی اس دور کی ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔ وہ جنوبی ہندوستان کو ایک طرف مرہٹوں کی چہرہ دستیوں سے اور دوسری طرف انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے نجات دلانا چاہتا ہے اور اس نے میسرور کے دروازے ہر صبح الخیال مسلمان کے لیے کھول دیئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ اس کے متعلق پڑھیں گے کہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی سرگزشت یہ ہے کہ میں کرناٹک کی فوج میں ملازم تھا اور حیدر علی والا جاہ کی فوج کے اندروں کے اس گردے سے قلعہ رکھتا تھا جوائسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک کا برترین دشمن سمجھا تھا۔ جب انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کے ساتھ جنگ شروع کی تھی تو حیدر علی نے بدراس کے گورنر کی خواہش پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد کے لیے چند دستے کلکتہ بھیجے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے ان دستوں کی کان کے لیے منتخب کیا گیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر مجھے بغاوت کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی لیکن چھ ماہ قید کاٹنے کے بعد مجھے ڈار ہونے کا موقع مل گیا اور میں سیدھا سرنگاپٹم پہنچ گیا۔ حیدر علی کی سفارش سے مجھے میسرور کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ میسرور کے راجہ کی فوج کا یہ نڈر سپاہی کسی دن جنوبی ہند کی آزادی کا سب سے بڑا محافظ بنے گا۔ اگر آپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں جو ہندوستان کے بے بس اور مایوس مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھائے تو آپ کسی دن سرنگاپٹم پہنچو۔ آئیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ کو ان کے سامنے جا کر یہ بتانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ آپ کون ہیں۔ ان کی مردم شناس نگاہیں آپ کے چہرے

سے آپ کے دل کا حال معلوم کر لیں گی۔

مظلم علی نے جواب دیا: میں حیدر علی کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں لیکن سر دست میں سرنگاپٹم جانے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک مجھے حیدر آباد جانا پڑے اور اگر موقع ملا تو شاید میسرور بھی دیکھ سکوں۔ بہر حال مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی ہے



ایک دوپہر فرحت اپنے دو ماہ کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور عابدہ اس کے قریب مسئلہ پر بیٹھی تسلیج پڑھ رہی تھی۔ صابر بانپتا ہوا آیا اور اس نے کرے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا: "بی بی جی۔ بی بی جی! خاں صاحب آگئے ہیں۔"

فرحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور عابدہ الحمد للہ کہہ کر سجدے میں گر پڑی۔ چند ثانیے بعد نیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ فرحت نے بچے کو بستر پر لٹا دیا۔ مظلم علی السلام علیکم کہہ کر کرے میں داخل ہوا اور فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے لٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر یہ دعائیں آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگیں اور اس نے کہا: "آپ کو فتح مبارک ہو!"

عابدہ سجدے سے سر اٹھا کر مظلم علی کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ اسے سلام کر کے بچے کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھی اور اس نے بچے کو بستر سے اٹھا کر مظلم علی کی گود میں رکھ دیا۔ تمہیں سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس نے کہا۔

مظلم علی نے شرماتے ہوئے سوال کیا: "چی جان اس کا نام کیا رکھا ہے؟" بیٹا ہم ہر روز اسے ایک نئے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ شیر علی مقرر تھے کہ اس کا نام صدیق ملی رکھ دیا جائے لیکن فرحت کہتی تھی کہ تمہارے آنے تک انتظار کر لیا جائے۔ "صدیق علی اچھا نام ہے چی جان! کیوں فرحت تمہارا کیا خیال ہے؟"

معظم علی مسکرایا۔ صابر اندر آجاؤ۔

صابر کمرے میں داخل ہوا اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ پھر معظم علی جنگ کے واقعات سنارہا تھا اور صابر کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھیں۔ پانی پت کے آخری معرکے کی تفصیلات سننے کے بعد صابر اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا اور جاگتا ہوا صحن میں جا پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے نوکر اور محلے کے لوگ اس کے گرد جمع تھے اور وہ انہیں اپنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ معظم علی اور اکبر خاں کے بہادری کا رتا سنا رہا تھا۔



پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح کھنڈ کے مسلمان عوام میں بھی ایک نیا دلولہ بیلار ہو چکا تھا۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں غریبوں کے جھوپڑوں سے لے کر امراء کے محلات تک ان بہادری کی جوائنری کی داستانیں زبان زد عام تھیں جو مرثیوں کی عظیم ترین طاقت کو پامال کر چکے تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد کھنڈ واپس آنے والے سپاہی اپنے ساتھ بیشمار اولوالعزم مجاہدوں کے کارناموں کی روح پرور داستانیں لاتے تھے اور معظم علی، جسے لکھنڈو کے لوگ کچھ مدت قبل صرف ایک کامیاب اور خوشحال تاجر کی حیثیت سے جانتے تھے، اب ان کی نگاہوں میں ایک قوی ہیرو بن چکا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو عوام اس کے راستے میں آنکھیں پھیلاتے۔ اس کے ساتھ مبکلام ہونے یا مصافحہ کرنے میں ایک خوشی محسوس کرتے۔ ایر لوگ اسے دعوت دینے پر اصرار کرتے۔ طبقہ اعلیٰ کی خواتین اس کے گھر آکر ذرخت کے ساتھ راہ درسم پیدا کرنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتیں معظم علی ان رسمی ملاقاتوں اور دعوتوں سے اجتناب کرتا لیکن کبھی لوگوں کی گر جوشتی میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر محفل میں اس سے پانی پت کی جنگ کی تفصیلات سننے کا مطالبہ کیا جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے عقیدت مندوں کو مختصر سا جواب دے کر ٹالنے

ذرخت ابھی تک مسرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کر رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ مجھے اس کے لیے ہر نام اچھا لگتا ہے۔

عابدہ نے کہا۔ بیٹا میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔

معظم علی نے جواب دیا۔ نہیں چچی جان کھانا میں راستے میں کھا چکا ہوں، آپ تشریف رکھیں۔ ذرخت تم بھی بیٹھ جاؤ۔

ماں اور مٹی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

عابدہ نے کہا۔ بیٹا اکبر خاں ملا تھا۔

چچی جان اکبر خاں میرے ساتھ تھا۔ جنگ میں اس کی بہادری کے قصے در در تک مشہور ہو چکے ہیں۔

ذرخت نے کہا۔ پچھلے مہینے حیدر آباد سے شیخ فخر الدین کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ اکبر خاں کو ساتھ لے کر حیدر آباد مراد میں۔

معظم علی نے کہا۔ اب چند مہینے میرا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اگلے سال میں دہلی جاؤں لیکن آپ اور چچی جان میرے ساتھ ہوں گی۔

عابدہ نے کہا۔ بیٹا جب پانی پت میں تمہاری فتح کی خبر آئی تھی تو لکھنڈو میں چراغاں کیا گیا تھا۔ صابر کو اس بات پر اصرار تھا کہ سب سے زیادہ چراغ عبادے مکان میں جلنے چاہئیں، جس کی رات ہمارے مکان کا کوئی گوشہ چراغوں سے خالی نہ تھا۔ پھر شہر میں ایک رات چراغ جلانے گئے تھے لیکن صابر نے پوری رات راتیں چراغاں کیا۔ اب تم اطمینان سے مہین جنگ کے واقعات سناؤ۔

معظم علی نے پانی پت کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو ذرخت نے کہا۔ آپ کی باتیں سننے کے لیے صابر ہم سب سے زیادہ بیقرار ہے۔ آپ ذرا اونچی آواز میں باتیں کریں مجھے یقین ہے کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔

کی کوشش کرتا لیکن کبھی کبھی وہ اس انداز سے گفتگو کرتا کہ سننے والوں کی نگاہوں کے سامنے پانی پت کے میدان کی تمام تفصیلات آجاتیں۔

ایک دن اودھ کی فوج کے ایک بڑے افسر نے اسے اپنے ہاں دعوت دی۔ شہر کے چیدہ چیدہ لوگ اور فوج کے کئی افسر اس دعوت میں شریک تھے۔ جب پانی پت کی جنگ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو شہر کے ایک رئیس نے سوال کیا: "جناب آپ کے خیال میں احمد شاہ ابدالی اور ان کی افواج کے بعد اس جنگ میں سب سے زیادہ صدمہ کن لوگوں کا ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں جنگ میں شریک ہونے والے ہر سپاہی کو اس فتح میں یکساں حصہ دار سمجھتا ہوں۔"

دوسرے آدمی نے سوال کیا: "لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ روسیکھنڈ کے سپاہیوں کی بہت تعریف کرتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "روسیکھنڈ کے جواؤں نے پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے ہر سپاہی کو متاثر کیا ہے اور میں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ کاش ہندوستان کے باقی امارات کے پاس بھی ایسے سپاہی ہوتے۔"

فوج کے ایک افسر نے کہا: "معاف کیجیے! روسیوں کے ساتھ آپ کی محبت کی وجہ یہ تو نہیں کہ ان کے چند دے آپ کی کمان میں تھے؟"

معظم علی نے پرہیز کر دیا۔ اگر میں اودھ کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تو بھی آپ اسی طرح میرے منہ سے روسیوں کی تعریف سنتے۔ میں نے پانی پت کے میدان میں جو کچھ دیکھا ہے ایک سپاہی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔"

وہی افسر نے چہرہ کیا۔ لیکن جناب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک سپاہی کی نظر سے دیکھنے کے بعد آپ نے اودھ کی فوج کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں

روسیکھنڈ کے سپاہیوں سے بہتر ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا: "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روسیکھنڈ کے سپاہیوں کی تعریف کرنے سے اودھ والوں کی توہین ہوئی ہے تو میں آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کروں گا۔" افسر خاموش ہو گیا اور معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "اگر آپ حضرات براہ مامنی تو میں یہ کہوں گا کہ روسیکھنڈ کا ہر جوان اس جنگ کو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ سمجھتا تھا لیکن دلاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اس جنگ کو صرف اپنے امار کی جنگ سمجھتے تھے اور میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اس مصل میں مجھے ان امار کا تذکرہ چھپانے پر مجبور نہ کریں جو آخری وقت اس کوشش میں تھے کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے اور وہ ٹوٹے بغیر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔"

ایک امیر زادے نے کہا: "لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں کیسے کہ پانی پت کی فتح کے لیے ہمیں بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے اور احمد شاہ ابدالی کے ہزاروں سپاہیوں کے نقصان کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ افغان سرداروں نے دلی سے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر نجیب الدولہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے ساتھ قوت آزمائی پر مقرر نہ ہوتے تو مرہٹوں سے آئندہ پراسن رہنے کا وعدہ لیا جاسکتا تھا اور ہماری متحدہ افواج ایک طرف کلکتہ اور دوسری طرف مدراس تک پیش قدمی کر کے اس ملک کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا سکتی تھیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ نیام سے تلواریں نکالے بغیر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے دشمن کا سر قلم ہو چکا ہے۔ مرہٹوں کو فیصلہ کن منہ کر کے پہلے اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ ہمیں لڑائی کے بغیر فتح حاصل ہو چکی ہے تو یہ ایک بدترین حماقت ہوتی۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مرہٹے کچھ عرصہ بعد زیادہ تیاریوں کے ساتھ شمال کا رخ کرتے اور ہمیں ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ



ہو لنک جنگ لڑنا پڑتی۔ مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کے حق میں ہمارے ملک کے وہ سیاست دان تھے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے مذہب اور مذہبیت کے بن بولے پر مرہٹوں کی جادو حقیقت کو اپنی سرحدوں سے دور رکھ سکتے ہیں لیکن نجیب الدولہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں وہ جانتے تھے کہ مرہٹوں کو ایک فیصلہ کن جنگ ہی راہ راست پر لاسکتی ہے۔ آپ میں سے کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ مرہٹے جو گذشتہ چند برس میں سیکڑوں شہر اور ہزاروں بستیاں تاخت و تاراج کرچکے ہیں وہ پانی پت کے میدان میں پیٹنے کے بعد اچانک جنگ سے منتظر ہو گئے تھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر انھیں دہاں سے بچ نکلے کا موقع دے دیا جاتا تو وہ واپس جاتے جاتے دلی سے دکن تک راستے کی ہر پستی کو تباہی و بربادی کا پیغام دیتے اور پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سیدھے گھر جانے کی بجائے اگر وہ لکھنؤ جیسے شہروں کو اپنے راستے کی منزلیں بنانے کی کوشش نہ کرتے! مجھے افسوس ہے کہ آپ میں سے بہت کم لوگوں کو اس سیلاب کا صحیح اندازہ ہے جو پولیس سے نکل کر پانی پت تک پہنچ گیا تھا۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے اس سیلاب کے راستے میں ایک عظیم پیادہ فوج اکر دیا اور ان ملک کے حاکم اپنی فراست اور تدبیر پر فخر کرتے ہیں ان میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کی معمولی لہروں کا بھی مقابلہ کر سکتے۔ احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب اگر ہم انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں اور ہمارے امراء انفرادی خود کشی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے متحد اور منظم ہو کر اجتماعی بقا کے لیے جدوجہد کریں تو ہم کسی وقت کا سامنا کیے بغیر اس ملک کو انگریزوں کی ہوس تک میری سے بچا سکتے ہیں۔

قوم کی موت و حیات کے مسائل سے ہماری قسمت کے ناخداؤں کی بے حسّی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انگریز بنگال کی آزادی پر چھاپہ مارتے ہیں تو ان میں سے

کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ جو بے رحم ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کا نکلا گھونٹ چکے ہیں وہ کسی دن ان کی شرکات تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر جات اور مرہٹے دلی یا دہلی کے علاقوں میں تباہی مچاتے ہیں تو اودھ، دکن، لاہور یا ملتان کے صوبیدار یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آگ ابھی تک ان کے اپنے گھر کی چار دیواری سے دور ہے۔ اسی طرح جب دکن یا اودھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دوسروں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ برسوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس ملک کے چند امراء ایک اجتماعی خط سے خوف زدہ ہو کر ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے اور اس اتحاد کے شاندار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا خطرہ دور ہو چکا ہے۔ اب اگر ہم فریجی تاجروں کو اس ملک سے نکال دے گے یا اگر ہم نے مرہٹوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو ہماری اس ماکامی کا باعث ہمارے اکابر کی نااہلیت اور کوتاہی ہوگی۔

احمد شاہ ابدالی کے لیے ہر سانس کے ساتھ میرے دل سے ایک دعا نکلتی رہے گی۔ انھوں نے مجھے ایک باغوت اور باوقار قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع عطا کیا ہے لیکن اس احسانِ عظیم کے بعد میں ان سے یہ مطالبہ نہیں کروں گا کہ آئیے اب آپ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر بھی پروہ دیجیے اور اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ مرہٹے جو پانی پت کی جنگ کے بعد نیم جان ہو چکے ہیں۔ کہیں دوبارہ اٹھ کر ہمارے مقابلے پر نہ آجائیں۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی مرکزیت برقرار رکھنے کے لیے ایک برائے نام شہنشاہ کی ضرورت ہے اور جس شخص کو دلی کا تخت سونپنا جا رہا ہے اسے امراء کی سازشوں یا دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی آپ کے پہرے کی ضرورت پڑے گی لیکن میں ان لوگوں سے کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں جو اپنے آپ کو قوم کی کشتی کا ناخدا سمجھتے ہیں اور میں ان سے یہ مطالبہ کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ خدا کے لیے ماضی کے واقعات سے سبق حاصل کرو۔ اگر تمہاری کوتاہ اندیشی، عافیت پسندی اور سہل انگاری کے باعث قوم

حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے اجتناب کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات کی تلخی بڑھتی گئی۔ تجارت کار ہمساکا ردبار عمل خود پر شیر علی کے سپرد کرنے کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت قوم کے مستقبل پر سوچنے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر یہ خیال بری طرح عادی ہو رہا تھا کہ ملک کے امرا اگر نئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو بنگال کو انگریزوں کے پنجہ استبداد سے نجات دلانی جاسکتی ہے اور کرناٹک میں ان کی سازشوں کا سدباب ہو سکتا ہے۔ مرہٹوں کے متعلق بھی وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ انھیں دوبارہ مراٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ ادھر پنجاب میں سکھوں کے حوصلے مسلمانوں کے لیے ایک نیا خطرہ بن چکے تھے اور مظفر علی کے نزدیک ہر الجمن، ہر پریشانی کا واحد علاج یہ تھا کہ سلطنت کے تمام صوبیدار اور امرانظم اور متحدہ قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل پر غور کریں اور ان مسائل سے عمدہ برآ ہونے کے لیے عوام میں ایک اجتماعی احساس بیدار کریں۔ پانی پت کی جنگ اس کے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھی لیکن یہ تاریخ حقیقت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی کہ امرا کی بے حسی بتدریج عوام کے اٹھتے ہوئے حوصلوں اور ولولوں پر غالب آ رہی ہے۔ وہ لکھنؤ کے امرا سے ملتا اور انھیں یہ سمجھاتا کہ اگر ہم نے ان حالات سے فائدہ نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ قوم پھر ایک بار مایوسی اور بے حسی کے دہلیز میں جا کر رہے گی مگر ہمارے اکابر اپنی سیاسی سودا بازیوں اور علاقائی سازشوں پر اعتماد کرنے کی بجائے عوام کے جذبات مدافعت پر اعتماد کریں تو ہم چند ماہ کے اندر اندر مٹھی بھر انگریزوں کو خلیج بنگال کے گھر سے پانیوں کی طرف دھکیل سکتے ہیں۔ مرہٹوں کے لیے ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے مراٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر صرف ادوہ اور دکن کی حکومتیں صرف چند مہینوں کے لیے اتحاد کر لیں تو جنوبی ہندوستان کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی چیر دہستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانی جاسکتی ہے۔

مظفر علی کبھی اُدھی اور اُدھی رات تک گھر میں بیٹھ کر دکن، لاہور، ملتان اور سرسہند

کی تیاؤب گئی تو تم بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاؤ گے۔

آپ میں سے کسی کو اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ میں پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے دو ہیرو جاننازوں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں روہیکھنڈ کا دوست ہوں نہ ادوہ کا دشمن۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت میں میں ان سب کو اپنے پی و جد کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ پانی پت کی جنگ میں شہید ہونے والے افتخار، مغل، بلوچ اور ہندی مسلمان سب میرے محسن تھے۔ ان کا مقدس خون میری عزت، میری آزادی اور میری سرملندی کے لیے بہا ہے۔ ادوہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس خون کی دوستی سے میرے اور میری قوم کے مستقبل کی تاریخ کے بہترین صفحات لکھے جائیں۔

جب یہ محفل بر غامست ہو رہی تھی تو لکھنؤ کا ایک عمر رسیدہ آدمی معلم علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میزبان کے گھر سے باہر نکلا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ شجاع الدولہ کے کانوں تک پہنچا جائے گا؟

معلم علی نے اطمینان سے جواب دیا: خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ تمام باتیں شجاع الدولہ کے لیے ہی کہی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیک اقدام قوم کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو سکتا ہے اور جن کی کوتاہیوں سے لاکھوں انسانوں کے لیے تباہی اور بربادی کے راستے کھل سکتے ہیں۔

○

لکھنؤ میں معلم علی کی بڑھتی ہوئی عزت اور شہرت کے ساتھ اس کے خلاف وہ عیب و اذہاں لوگ بھی پیدا ہو چکے تھے جو کسی انسان کی تعریف کو اپنی مذمت کے مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ وہ امرا جو ابتلا میں اس کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آئے تھے۔ اب اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ منہ نشینوں اور کورنش بجالانے والوں یا خراجوں اور خراجہ برداری کی دنیا میں ایک حق گو اور مہیاک انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ابتداء میں معلم علی ادوہ کی

کے صوبیداروں، دلی کے ذیروں اور امیروں اور روسیہ کے سرداروں کے نام اس قسم کے خطوط لکھتا :-

• ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی بار بار ہماری اعانت کے لیے نہیں آئیں گے۔ اگر آپ متحد ہو جائیں تو گئی گزری حالت میں بھی اس ملک کی کوئی طاقت آپ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ آپ اس ملک کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے محافظ ہیں۔ اگر آپ نے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو آپ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے؟ پانی پت کی فتح کے بعد اس ملک کے یایوس اور بدل مسلمانوں میں جو حوصلے اور دلوںے بیدار ہوئے تھے وہ اب سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے حال سے یوں اور مستقبل سے بے پروا ہو جائیں۔ ہماری سب سے بڑی بیماری لامرکزیت ہے۔ اگر آپ متحد اور منظم ہو جائیں تو دلی کے تخت کا کھویا ہوا دھار بھال کیا جاسکتا ہے لیکن اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاہ عالم ثانی جو ابھی تک جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے قوم کی ڈھال اور توار نہیں بن سکتا تو خدا کے واسطے سے ۔۔۔ بچو۔ اٹھانے کے لیے کسی ایسے آدمی کو آگے لانے کی کوشش کیجیے جس کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جاسکے۔ میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ایک قوم کا مستقبل کسی نااہل علوان کی ذاتی خواہشات پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ میں اس ملک کے کرد و دیو مسلمانوں کی عزت اور آزادی اور بقا کا واسطہ دے کر آپ سے یہ انتظار کرتا ہوں کہ آپ اپنے فرائض کا احساس کریں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے جو قوم کی آزادی کے پاسان ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی ہیں تو میری آخری

درخواست یہ ہے کہ آپ قوم کے راستے سے ہٹ جائیں اور ایسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیں جو قوم کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں :-



ایک دن معظم علی اپنے دفتر میں بیٹھا انتہائی انہماک کی حالت میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اکبر خاں کمرے میں داخل ہوا اور بے پاؤں آگے بڑھ کر اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ صابر دروازے پر کھڑا ٹری شکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر خاں دیر تک چپ چاپ بیٹھا ایک شرارت آمیز قسم کے ساتھ معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ تنویری دیر بعد معظم علی کھا ہوا کاغذ رکھ کر دوسرا کاغذ اٹھانے لگا تو اچانک اس کی نگاہ اکبر خاں پر جا پڑی۔

• بھائی جان، السلام علیکم! اکبر خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہوئے کہا۔

معظم علی "وعلیکم السلام" کہہ کر اٹھا اور اس سے ہاتھ ملانے کے بعد بخگیر ہو کر بولہ "تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"میں ابھی آیا ہوں بھائی جان! آپ اطمینان سے اپنا کام ختم کر لیجیے۔"

"بیٹھو، میرا کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

وہ بیٹھ گئے اور اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا "بھائی جان ابھی صاف مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ دن رات کھتے رہتے ہیں اور اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ بھابی جان کیسی ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں کئی دنوں سے تمہارے ہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم اتنا عرصہ کہاں تھے۔ کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع تو بھیج دی ہوتی۔"

اکبر خاں نے جواب دیا "بھابی جان یقین کیجیے کہ میں ہر روز آپ کی خدمت میں

معلوم ہے کہ وہ مرہٹوں سے حیدرآباد کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے چکا ہے۔ شیخ فخرالدین کی رائے اس کے متعلق اچھی ذہنی لیکن پچھلے خط میں انھوں نے بھی اس کی توجہ کی ہے۔ میں نے نظام کو لکھا ہے کہ آپ اس ملک کے امراء کو اجتماعی خطرے کے مقابلے میں متحد اور منظم کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ تم یہ خط پڑھ سکتے ہو۔ معظم علی نے یہ کہہ کر لکھے ہوئے کاغذ میز پر سے اٹھائے اور اکبر خاں کے ہاتھ میں دے دیئے۔

اکبر خاں نے خط پڑھنے کے بعد معظم علی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا: بھائی جان! آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے اور چچا شیر علی کہاں ہیں؟ معظم علی نے جواب دیا: پانی پت کی جنگ سے لوٹنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ بیشتر کام چچا شیر علی نے سنبھال رکھا ہے اور وہ چند دن سے فیض آباد گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آج یا کل آجائیں گے۔

صابر ایک کم سن بچہ اٹھلے کمرے میں داخل ہوا اور اسے اکبر خاں کی گود میں رکھتے ہوئے بولا: بھلا یہ کون ہے؟

اکبر خاں مسکرایا اور اس نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ یہ میرا خفائنہ لاڈلا بھتیجا ہے اور کسی دن یہ اس ملک کی عظیم ترین فوج کا سپہ سالار بنے گا۔

پانچ دن بعد معظم علی، اکبر خاں اور شیر علی ایک کمرے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اچانک بابر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد دلاور خاں انتہائی بدحواسی کی حالت میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا: جناب شہر کا کوڑاں آپ سے ملنا چاہتا ہے اس کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی ہیں۔

مستم علی نے اطمینان سے جواب دیا: کوڑاں سے پوچھو اگر انھیں ناشتا کرنا ہو تو یہاں تشریف لے آئیں ورنہ انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دو اور کوئی اچھی آباہوں۔

حاضر ہونے کا ارادہ کیا کرتا تھا۔ دو ماہ قبل ہمارے علاقے کا ایک آدمی لکھنؤ آ رہا تھا اور میں نے اسے ایک خط دیا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ مجھے ملا اور اس نے بتایا کہ گھر سے نکلنے کے بعد میرا ارادہ بدل گیا تھا اور میں لکھنؤ کی بجائے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے آگرہ چلا گیا تھا۔

مستم علی نے کہا: شیخ فخرالدین ہر خط میں تمہارے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ میں نے پرسوں ہی انھیں لکھا ہے کہ اکبر خاں نے مدت سے کوئی اعلان نہیں بھیجا اور غمغریب اس کے گاؤں جا رہے ہیں۔ شیخ صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور وہ مضمین میں حیدرآباد آؤں تو تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔

”وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں بھی انھیں بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ اگر آپ حیدرآباد گئے تو میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔“

مستم علی نے کہا: اب معلوم نہیں کہ مجھے کہاں کہاں جانا پڑے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ میں زیادہ عرصہ لکھنؤ میں نہیں رہ سکوں گا۔ نواب شجاع الدولہ کے خوشامدی اور جی حسوری مجھ سے بہت خفا ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے ایک بڑے اہلکار نے مجھ سے گھر کیا تھا کہ میں لکھنؤ میں بغاوت پھیلارہا ہوں۔

اکبر خاں نے کہا: بھائی جان! میں نجیب الدولہ کی دعوت پر پچھلے پچھلے چند دنوں کے لیے دلی گیا تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ شجاع الدولہ آپ جیسے حق گو آدمی کا زیادہ عرصہ لکھنؤ میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ نے انھیں کوئی چٹھی لکھی تھی؟ معظم علی نے جواب دیا: ان دنوں میرا سب سے بڑا مشغلہ اس ملک کے اکابر کے نام خطوط لکھنا ہے اور اس وقت بھی میں میر نظام علی کے نام ایک خط لکھ رہا تھا۔

میر نظام علی کو آپ نے کیا لکھا ہے؟ میں نے مرہٹوں کے خلاف اس کی تازہ فتوحات پر اسے مبارکباد دی ہے تبھی

لیکن خدا معلوم پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد انھیں کیا ہو گیا ہے کیہ بھری مصل میں حکومت کے بڑے بڑے مسدیاروں پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔

اکبر خاں نے اٹھ کر دروازے سے باہر بھاگنے کے بعد شیر علی کی طرف دیکھا اور کہا: "چچا جان پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے لاکھوں انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہو گئی ہے اور بھائی جان کے منہ سے ان لاکھوں انسانوں کے دل کی دہلی ہوئی آواز نکلتی ہے۔"

"لیکن اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں چچا جان، آپ پریشان نہ ہوں۔ موجودہ حالات میں شجاع الدولہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

سمن میں مسلح سپاہی اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی کو قوال کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا۔

اکبر خاں نے شیر علی سے کہا: "چچا جان میں ابھی آتا ہوں۔"

شیر علی نے کہا: "خدا کے لیے معظم علی کو یہ ضرور سمجھاؤ کہ شجاع الدولہ ایک تندرست آدمی ہے وہ اس کے ساتھ بات کرنے میں احتیاط کریں۔"

"چچا آپ اطمینان رکھیں۔" اکبر یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا: "اکبر مجھے نواب وزیر اودھ نے کسی ضروری کام سے بلایا ہے میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

مقتویٰ دیر بعد معظم علی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قوال ادراس کے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کا رخ کر رہا تھا۔

معلم علی نواب شجاع الدولہ کی مسند کے سامنے کھڑا تھا اور منہ سے آگے دائیں بائیں

دلا درخاں نے کہا: "جناب میں نے کہا تھا کہ آپ ناشتہ کر رہے ہیں لیکن وہ ذرا آپ سے ملنے پر مہرے تھے۔"

معلم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا: "جاؤ اسے کہہ دو میں ابھی آتا ہوں اور میرے لیے ایک گھوڑے پر زین بھی ڈال دو۔"

دلا درخاں کمرے سے باہر نکل گیا تو معظم علی نے کہا: "اکبر معلوم ہوتا ہے کہ مجھے شجاع الدولہ نے یاد کیا ہے۔ اگر مجھے کسی وجہ سے دیر لگ جلتے تو تم اپنی بھائی ادراس کی والدہ کو حیدر آباد پہنچا دینا۔ میں انشاء اللہ وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کئی ہفتوں سے شجاع الدولہ کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو آپ کو شجاع الدولہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ حیدر آباد کی نسبت میرا گھر یہاں سے نزدیک ہے اور ہم کسی وقت کے بغیر کو قوال ادراس کے آدمیوں کو کسی کوٹھڑی میں بند کر کے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

معلم علی مسکرایا: "مجھے یقین ہے کہ یہ آدمی مجھے گرفتار کرنے کی نیت سے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی میرا قید ہونے کا ارادہ ہے۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں!" معظم علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "تم یہیں رہو۔ تمہیں اس کمرے سے نکلنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

معلم علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور شیر علی جو کمرے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا اپنے حلق میں اٹکا ہوا لقمہ نکلنے کے بعد شکایت کے لہجے میں بولا:

"اھوں نے کبھی میرا کہا نہیں مانا۔ میں ان سے ہمیشہ کہتا تھا کہ جو لوگ قوم اور ملک کے خیر خواہ بن کر آپ کے پاس آتے ہیں ان میں سے آدھے حکومت کے جاسوس ہوتے ہیں



میرا باپ، میرا بھائی، میرے عزیز اور میرے دوست سراج الدولہ کے جھنڈے تلے قربان ہو چکے ہیں کھنڈ پینچ کر میں نے یہ جرم کیا ہے کہ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ابھی تک میری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں جو قوم کے کام آسکتے ہیں تو میں ایک رضا کار کی حیثیت میں پانی پیت کے میدان میں پہنچ گیا تھا۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا: پانی پیت کی جنگ میں اس ملک کے ہزاروں انسان ہمدردی سے بھرے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ حکومت کے خلاف باغیانہ بغیر کسی گروے تمہارے خلاف کئی ہفتوں سے نفرت پھیلا رہے ہو۔ تم نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم جنگ کے دوران میں مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہے ہیں۔ تم نے شہنشاہ کے خلاف انتہائی قویں آئینہ باقیں کہی ہیں۔ تم نے دلی میں احمد شاہ ابدالی کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے کہ پانی پیت کی جنگ میں اودھ کی افواج کی حیثیت تماشا یوں سے زیادہ نہ تھی۔ ہم تمہیں روسیوں کی طرف داری سے منع نہیں کر سکتے لیکن تمہیں نجیب الدولہ یا حافظ رحمت خاں کے اشاروں پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کھنڈوں میں تمہاری خدمات کا احساس نہ ہوتا تو ہم ایک تانہ کے لیے بھی تمہارا رہنا گوارا نہ کرتے۔

مظلم علی نے ایک تانہ کے لیے حاضرین دربار کی طرف دیکھا اور پھر شجاع الدولہ کی آنکھوں میں ڈال کر جواب دیا: "مجھے معلوم نہیں کہ میرے دوستوں نے میرے متعلق آپ کو کیسی اطلاعات پہنچائی ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ میں آپ کے خلاف کوئی بغاوت پھیلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں یہ ماننا ہوں کہ میں اس ملک کے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہوں اور کوئی باغی اور آدمی ان حالات سے مطمئن نہیں ہو سکتا، میں آپ کے سامنے ایک ایسی قوم کے فرد کی حیثیت میں کھڑا ہوں جس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے اور آپ اس ملک کے ان چند انسانوں میں سے ایک ہیں جو اسے تباہی سے بچا سکتے ہیں پانی پیت

دو قطاروں میں چند امراء اور عمدہ دار بیٹھے ہوئے تھے۔ شجاع الدولہ نے چند تانہ اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: "مجھے تمہارے دو خط ملے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہیں سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے عمدہ دار کے نام خط لکھنے کا شوق ہے۔ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ ہمیں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے تمہارے نیک مشوروں کی ضرورت ہے؟"

مظلم علی نے جواب دیا: اگر مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ آپ کے ساتھ لاکھوں انسانوں کی قسمت وابستہ ہے اور آپ کا صحیح قدم قوم کے لیے خیر و برکت اور آپ کی معمولی کوتاہی اس کے لیے تباہی کا باعث ہو سکتی ہے تو میں آپ کو ہرگز پریشان نہ کرتا۔

"لیکن تمہیں ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم صرف اپنی تجارت سے سروکار رکھو اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو کہ قدرت نے سلطنت کا سارا اوج تمہاری گردن پر لاد دیا ہے؟ ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ جو لوگ بیگال کو تباہی کے راستے پر ڈال کر وہاں سے بھاگے ہیں وہ یہاں اگر ہمارے لیے کوئی فتنہ پیدا کریں۔"

مظلم علی ایک مبلغ کا جذبہ لے کر شجاع الدولہ کے دربار میں داخل ہوا تھا لیکن یہ الفاظ اسے چابک کی طرح لگے اور اس نے جواب دیا: "معاف کیجیے مجھے اس سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر اقتدار کی مسزیں آراستہ کرنے والے امراء اپنے آپ کو کبھی مرہٹوں، کبھی جاٹوں، کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے سامنے بے بس پاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آواز آپ کے کانوں کے لیے غیر مانوس ہوگی لیکن اقتدار کی منہ کی شخص کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر جان دینے والوں کا مذاق اڑائے۔ بیگال میں میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی ہزاروں خوشیاں اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر قربان کر چکا ہوں۔"

کی جنگ کے بعد قدرت نے ہمیں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو قدرت شاید ہماری اس کوتاہی کو قابل معافی نہ سمجھے۔ اگر ہمارے امرار اور صوبیداروں نے متحد اور منظم ہو کر مرکز کو مضبوط کیا تو مرہٹوں کو دوبارہ سر اٹھانے میں دیر نہیں لگے گی اور ہمارے اکابر کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ جب کوئی نیا طوفان آئے گا تو قدرت ان کی اعانت کے لیے کسی اور احمد شاہ ابدلی کو بھیج دے گی۔ مرہٹوں سے بھی زیادہ خطرناک اس وقت ہمارے لیے انگریز ہیں لیکن ہماری اس سے زیادہ بد قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے امرار نے بنگال کے واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ہم اس جنگ میں رہتے ہیں جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ اور میرے پیچھے اور پیٹلے کی دھڑکتی ہوئی یہ ہے کہ میں لکھنؤ سے اس آگ کے شعلے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس آواز کی پسند کا دل سے رو رہا ہوں جو بنگال کو ٹھپ کر چکا ہے۔ میں ان بیٹیوں کی چیخیں سن رہا ہوں جو ایک بار پھر عمارا شہر سے نکل کر اس ملک میں تباہی پھیلاتی چاہتے ہیں۔ پھر جب میں اپنے ان اکابر کو دیکھتا ہوں جو اجتماعی خطرات کے مقابلے کے لیے عوام کی قوت مدافعت بیلہ کرنے کی بجائے اپنی سیاسی چالوں اور سودا بازوں کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو میں غموش نہیں رہ سکتا۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے انگریزوں کے جارحانہ غور، اہم کا سبب نہ کیا تو وہ کسی دن دلی پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے مرہٹوں کی جارحیت کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو تمہاری آئندہ نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی اور اگر تم نے پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی کے لیے افغانوں کا ساتھ نہ دیا تو شمال میں تمہارا اہم ترین دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا مگر اس قسم کے خیالات کا اظہار جرم ہے تو میں اس جرم کی سزا جھگٹے کے لیے تیار ہوں۔ دلی سے احمد شاہ ابدلی کی واپسی کے بعد میں نے صرف ایک حوصلہ افزا خبر سنی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظام کی افواج نے مرہٹوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے ہیں لیکن کاش میں اودھ، دلی اور روہیلکھنڈ کی افواج کو بھی دکن کی افواج کے دوش بوش

دیکھ سکتا اور پھر یہی افواج پونا سے آگے ارکاٹ اور مدراس کی طرف بڑھتیں اور اس ملک سے ان فرنگی آجروں کو نکال کر دم لیتیں جو ہماری عزت اور آزادی کا سودا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد شاید بنگال کو آزاد کرانے کے لیے ہمیں لڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

شجاع الدولہ نے قدسے نرم ہو کر کہا: "تم ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے کسی مرحلہ پر دوسرے امرار سے تعاون نہیں کیا۔ جب مرہٹوں کا خطرہ پیش آیا تھا تو ہم پانی پت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے اور اب بھی اگر کسی مشترکہ دشمن کے مقابلے میں اس ملک کے امرار نے کوئی متحدہ محاذ بنایا تو ہم ان کا ساتھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے کیسی ہماری حکمت عملی کسی ایسے حلیف کی خواہشات کی تابع نہیں ہو سکتی جس کی وفاداری پر ہمیں پورا بھروسہ نہ ہو۔ تم ہمیں نظام الملک کے ساتھ تعاون کا مشورہ دیتے ہو لیکن تمہارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم نظام کی حمایت کے لیے اٹھیں تو وہ مرہٹوں کے ساتھ سودا نہیں کرے گا؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ کو نظام کے لیے نہیں، دکن کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے لیے مرہٹوں کے خلاف میدان میں آنے کی دعوت دیتا ہوں میرا مقصد صرف امرار کا اتحاد ہی نہیں بلکہ عوام میں ایک ایسا اجتماعی شعور اور ایک ایسی قوت محاسبہ پیدا کرنا ہے جس کا احترام اور خوف کسی رہنما کو بے راہ روی کی اجازت نہ دے۔"

شجاع الدولہ نے طنزیہ لہجے میں کہا: "تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے دکن جا کر دہلی کے عوام کا ضمیر بیدار کرو؟ مجھے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ میر نظام علی نے جسے تم شاید قوم کا نجات دہندہ سمجھتے ہو۔ مرہٹوں کے خلاف جنگ سے واپس لوٹتے ہی اپنے بھائی صلابت جنگ کو گدی سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا"



ہے۔ ان حالات میں تم مجھے صلابت جنگ کی اعانت کا مشورہ دیتے ہو یا میرے نظام علی کی اعانت کا؟ مجھ نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا : میرے لیے یہ کھیل نیا نہیں۔ جب تک چند خاندان سلطنت مغلیہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنی شکا رکھا ہیں سمجھتے رہیں گے اور جب تک دلی کی حکومت میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ اقتدار کے بے حیا دعویداروں کا مقابلہ کر سکے، اس ملک کے مختلف صوبوں میں اس قسم کے کھیل ہوتے رہیں گے۔

شجاع الدولہ نے کہا : دلی کی حکومت کی طرف سے میں تمہیں یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اگر ہم اس وقت دکن کے معاملات میں مداخلت کریں تو میرے نظام علی، مرہٹوں یا انگریزوں کے ساتھ سودا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور یہی بات صلابت جنگ کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے متعلق تمہارا یہ قیاس غلط تھا کہ ہم دکن اور مرہٹوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے لیکن کاش دکن میں کوئی ایسی شخصیت ہوتی جسے صحیح معنوں میں ہم اپنا حلیف سمجھ سکتے۔ میرے نظام علی کے متعلق اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہوشیار سپاہی اور ایک کامیاب سیاست دان ہے اور قرآن یہ بتا رہا ہے کہ دکن پر اس کی سیادت تسلیم کر لی جائے گی لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قوم اور ملک کے مستقبل کے متعلق میرے نظام علی کے حوالہ کیا ہیں اگر تم اپنی مرگرمیاں صرف اودھ کی حکومت پر مرکوز نہیں رکھنا چاہتے تو ہماری یہ خواہش ہے کہ تم دکن جاذبہ میرے نظام کو حال اور مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرو اور اگر اسے تمہاری باتیں متاثر کر سکیں تو یہ معلوم کرو کہ دکن کو تباہی سے بچانے کی کوئی اور صورت کیا ہو سکتی ہے! دکن کے امرا میں سے کئی تمہیں اپنے ہم خیال مل جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میرے نظام علی انتہائی کوتاہ اندیش ثابت نہ ہوا تو تم ایسے لوگوں کی مدد سے اسے اپنا ہم خیال بنا سکو گے اور تم تمہارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار رہیں کہ جب میرے نظام ہمارے مشترکہ

دشمنوں کے خلاف کوئی جرات مندانہ قدم اٹھائے گا تو ہم اس کا ساتھ دیں گے اور اگر تمہیں اس مہم میں ناکامی ہوئی تو اس کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ تم ہر معاملے میں ہمیں مددگار ٹھہرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہم خوشی تمہیں اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ تم ملک کے کونے کونے میں جا کر ہر باخدا دی کو ہماری طرف سے یہ پیغام دو کہ مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا جائے گا اودھ کے تمام دسائے اس کی فتح اور کامیابی کے لیے وقف ہوں گے لیکن اگر تم لوگ صرف باتیں بنانا جانتے ہو تو میں تم سے یہ کہوں گا کہ اودھ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے نجیب الدولہ نے کہا تھا کہ تم ایک کارآمد آدمی ہو اور میں تمہیں قوم کی خدمت کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں اب تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم حیدر آباد جانا چاہتے ہو یا نہیں لیکن میں تم سے یہ توقع ضرور رکھوں گا کہ جب تک تم کھنڈیں ہو میرے پاس اس قسم کی کوئی شکایت نہیں آئے گی کہ اس ملک کی تمام برائیاں میری ذات کے ساتھ وابستہ کی جا رہی ہیں۔ تم جاسکتے ہو؟

مظلم علی نے چند نمونے تذبذب کی حالت میں شجاع الدولہ اور حاضرین مجلس کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اہل دربار پریشانی، اضطراب اور تذبذب کی حالت میں اس شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے سامنے ذرا سی گتخی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ مظلم علی کے ساتھ کھٹگو کے دوران میں وہ ہر لمحہ اس بات کے منتظر تھے کہ شجاع الدولہ اچانک مانی بجائے گا اور سپاہی ننگی تلواروں کے پیرے میں اس گتخ آدمی کو کسی تنگ دنا نیک کوشٹری کی طرف لے جائیں گے اور مظلم علی کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ شاید شجاع الدولہ پیر تلواروں کو کھٹا دے کر یہ کہہ دے کہ اس گتخ آدمی کو محل کے دروازے سے باہر نکلتے ہی گرفتار کر لیا جائے لیکن شجاع الدولہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اہل مجلس کو حیران اور پریشان دیکھ کر کہا : تمہیں یہ شکایت تھی کہ ایسے خطرناک آدمی کو کھنڈیں نہیں رہنا چاہیے

درجے یقین ہے کہ اب وہ لکھنؤ میں نہیں رہے گا۔ ایسا آدمی اپنی ذات کے سوا کسی کے لیے خطرناک نہیں ہو سکتا۔

ایک درباری نے اٹھ کر کہا: لیکن عالیجاہ! اس نے حضور کے سامنے بھی انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کیا ہے۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا: ”تم اس بات پر حیران ہو کر میں اس کے ساتھ نرمی سے کیوں پیش آیا۔ سنو! وہ نجیب الدولہ اور حافظہ و حرمت خاں جیسے لوگوں کا دوست ہے، اگر اس پر سختی کی جاتی تو یہ لوگ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے۔ احمد شاہ ابدالی سے نصیر خان بروج تک اسے جلستے ہیں اور میری اپنی فوج کے بزاروں جوان پانی پت کے میدان میں اس کے بہادرانہ کارناموں کے معترف ہیں۔ پھر اس کی باتیں سننے کے بعد تم اسے بد زبان اور گستاخ کہہ سکتے ہو لیکن اس پر مذمتی کا الزام عائد نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے لیے سروردی کا باعث تھا لیکن میں نے یہ سروردی اب نظام کی طرف منتقل کر دی ہے اور مجھے نظام سے پوری توقع ہے کہ وہ اس کا صحیح علاج کر سکے گا۔ نظام سے یہ بعید نہیں کہ وہ اسے مہار ایک جاسوس سمجھ لے اور یہ حضرت حیدر آباد پیسچے ہی لاپتہ ہو جائیں۔“

ایک درباری نے سوال کیا: لیکن عالیجاہ اگر وہ یہاں سے نرگیا تو؟  
شجاع الدولہ نے کہا: ”شہر کا کو تو مال اس بات کا پورا خیال رکھے گا کہ وہ کسی آخیر کے بغیر لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔“

معظم علی اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اکبر خاں ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا: ”بھائی جان میں آپ کے متعلق بہت پریشان تھا۔ کیسے دہاں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں!“ معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ شجاع الدولہ کی خواہش ہے کہ میں لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد چلا جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے

میرے لیے قید خانے کی کوٹھڑی منتخب نہیں کی۔“

اکبر خاں نے کہا: ”اس نے آپ کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دیا ہے؟“  
”نہیں! اسے اس بات کا یقین تھا کہ میں ایسا حکم نہیں مانوں گا اور اس کی التجوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں لکھنؤ کی بجائے حیدر آباد جا کر توڑم کے مسائل حل کرنے کی کوشش کروں۔“

اکبر خاں نے کہا: ”بھائی جان اگر آپ لکھنؤ چھوڑ کر میرے ہاں جانا قبول کریں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ اودھ کی نسبت روہیلکھنڈ میں یوں بھی آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”ابھی میں نے مستقل طور پر لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ایسا وقت آئے گا تو تمہارا گھر میری آخری جائے پناہ ہوگی لیکن ابھی میں حیدر آباد جانا چاہتا ہوں۔ میں شیخ فخر الدین سے کئی بار وعدہ کر چکا ہوں اور اب شجاع الدولہ نے اس وعدے کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں۔ تمہاری بھابی کو بھی حیدر آباد دیکھنے کا شوق ہے۔“

اکبر خاں نے پوچھا: ”آپ کب جا رہے ہیں؟“  
”میں انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جاؤں گا۔“  
”اکبر خاں نے کہا: ”بھائی جان میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

## پندرھواں باب

عطیہ دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے عطیہ کو بازو سے پکڑ کر جھجھکاتے ہوئے کہا: "آپا جان! آپا جان! وہ آگئے۔"

عطیہ نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی: "کون آگئے؟"۔  
"بھائی معظم علی آئے ہیں آپا جان۔"  
"پھر میں کیا کروں؟ عطیہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریے میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں۔"  
بلقیس اسی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت بچہ اٹھائے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"بھلا بتائیے آپا جان یہ کون ہے؟ اس نے بچے کو عطیہ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔  
"اسے کہاں سے اٹھالائی ہو؟" عطیہ نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"آپا جان! یہ ان کا بیٹا ہے۔ ان کی بیوی اور ان کی ساس ان کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ نیچے اتنی جان اور مائی جان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں دیکھیے آپا جان یہ کتنا پیارا

بچہ ہے!"

عطیہ چند ثانیے بے حس و حرکت بیٹھی بچے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے اپنے دل میں جذبات کا تلاطم محسوس کیا اور بچے کو سینے سے لگالیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔  
بلقیس نے کہا: "چلیے آپا جان وہ آپ کے متعلق پوچھتی تھیں۔"

"تم چلو میں آتی ہوں۔"

بلقیس نے اس کی گود سے بچہ اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔  
تھوڑی دیر بعد عطیہ جھجکتی ہوئی خلی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئی فرحت اور اس کی والدہ فخر الدین کے خاندان کی چند خواتین کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ عطیہ انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

بلقیس نے فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بھابی جان! یہ عطیہ آپا ہیں۔"  
فرحت نے مسکرا کر عطیہ کی طرف دیکھا اور پھر بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تھیں دیکھنے کے بعد تمہاری بہن کو پہچانتا میرے لیے مشکل نہیں۔ تمہاری صورتیں بہت ملتی ہیں۔"  
عطیہ بڑی عمر کی خواتین اور اپنی ماموں زاد بہنوں کی مجلس میں فرحت کے ساتھ بے تکلفی سے کوئی بات نہ کر سکی لیکن غروب آفتاب کے قریب جب فرحت بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور بلقیس اس کا کچھ اٹھائے! دھردھر گھوم رہی تھی عطیہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ فرحت نے کرسی سے اٹھ کر کہا: "آؤ بہن! میں لکھنؤ میں تمہیں بہت یاد کیا کرتی تھی اور تمہارے بھائی جان بھی بہت یاد کیا کرتے تھے۔"  
"بھابی جان! عطیہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر فرحت سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"میں ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتی تھی کہ بھائی جان آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور پھر جب انہوں نے ماموں جان کو یہ کھاکر آپ مل گئی ہیں تو میں یہ دعا کیا کرتی

کی آمد کی اطلاع ہوتی تو میں حیدر آباد کا سروس سے آگے آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اکبر خاں کو بھی ساتھ لے آئے ہیں۔ معظم علی نے کہا: "یہ محض اتفاق تھا کہ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو یہ میرے پاس آئے ہوئے تھے۔"

"مکھنوں میں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ اب دہلی معمولی کاروبار رہ گیا ہے اور وہ میں شری علی خاں کے سپرد کر آیا ہوں۔ میں کچھ عرصہ سیر و سیاحت سے جی بھلانا چاہتا ہوں۔" فخر الدین مسکرایا اور قدرے توقف کے بعد بولا: "جس معظم علی کو میں جانتا ہوں وہ سیر و سیاحت کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ اپنی خواہش سے یہاں نہیں آئے ہیں۔"

معظم علی نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا: "اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری خواہشات کیا ہیں؟"

فخر الدین نے کہا: "لوگ اپنے ممانوں سے ایسی باتیں پوچھنا خلافت تہذیب سمجھتے ہیں لیکن میں آپ کی ہر پریشانی میں حصہ دار بننا اپنا حق سمجھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ میری حلقہ تفتی نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میری پریشانیوں میری اپنی پیدا کردہ ہیں اور کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں میرا صحیح مقام کیا ہے۔ مکھنوں سے روانہ ہوتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ اب ملک کے کسی حصے کی آب دہوا مجھے راس نہیں آئے گی۔"

فخر الدین نے کہا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت کے ساتھ آپ کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔"

تجی کہ آپ کسی دن یہاں آئیں۔"

فرحت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "عطیہ تم فرشتہ ہو اور مجھے ہمیشہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔ بیٹھ جاؤ!"

عطیہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے غور سے فرحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بھابی جان ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"آپ بڑا تو نہ مانیں گی؟"

"کبھی نہیں۔"

عطیہ نے اپنی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز تہمت لاتے ہوئے کہا: "بھابی جان! آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

فرحت نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "عطیہ بات یہ ہے کہ تم میرے چہرے میں اپنی آنکھوں کا حسن دیکھ رہی ہو؟"



اسی مکان کے مردانہ حصے میں فخر الدین، معظم علی اور اکبر خاں کا خیر مقدم کر رہا تھا، ان کے نوکر دوں اور گھوڑوں کے دو دروازے حویلی میں ٹھہرانے کا انتظام کرنے کے بعد وہ معظم علی اور اکبر خاں کے ساتھ دیوان خانے کے ایک کٹہرے میں داخل ہوا۔ جب وہ ایک دوسرے کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا: "بیکے راستے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، راستے میں ہمیں کوئی قابل ذکر حادثہ پیش نہیں آیا لیکن حیدر آباد سے کوئی آٹھ منزل دور ہمیں یہ پتہ چلا کہ ڈاکو چار دن پہلے ایک چھوٹا سا قافلہ لوٹ چکے ہیں۔" فخر الدین نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے لیکن اگر مجھے آپ

معظم علی نے جواب دیا: "آپ شاید اسے بزدلی خیال کریں لیکن اس مرتبہ میں نے قید ہونا پسند نہیں کیا۔ پچھلے وقتوں کے حکمران جب اپنے کسی گستاخ عہدہ دار یا مشیر پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے تو اس سے یہ کہا کرتے تھے کہ آپ حج کر آئیں۔ شجاع الدولہ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک گستاخ آدمی ہوں اور اس نے مجھے قید خانے کے داروغہ کے حوالے کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ میں میرے نظام علی کی خدمت میں حاضر ہو کر قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے دکن اور ادھ کے اتحاد کے مکانات معلوم کروں اور میرے خیال میں آج تک اس نے اتنی رعایت کسی اور کے ساتھ نہیں برتی ہوگی۔"

فخر الدین کے استفسار پر معظم علی نے لکھنؤ میں اپنی سرگرمیوں اور شجاع الدولہ کے ساتھ ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کے بعد فخر الدین نے کہا: "جب آپ نے مجھے پانی پت کی جنگ کے واقعات لکھے تھے تو مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ آپ لکھنؤ واپس کیوں آگئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک سپاہی کی حیثیت میں اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے بعد آپ تجارت میں دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد آپ دلی میں نجیب الدولہ کے ساتھ رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد مجھے دلی اور لکھنؤ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بے جان بادشاہ جس کا کوئی پُرسان حال نہیں، میری آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ کاش احمد شاہ ابدالی دلی کے تخت پر کسی ایسے آدمی کو بٹھا جاتے جس میں اس دور کے طوفانوں کے ساتھ لڑنے کی جرأت اور ہمت ہوتی۔ نجیب الدولہ اپنے مذہب، اپنی قابلیت، اپنی جرأت، ہمت اور ذہانت کے باوجود گھاس کے تنکوں سے قوم کا دفاعی حصار تعمیر نہیں کر سکتے۔ دلی کے امراء اور دلی سے باہر سلطنت کے دوسرے عہدہ دار اگر کسی بات سے بے نیاز ہیں تو وہ قوم کا مستقبل ہے۔ وہ مرکز میں کسی ایسی تیار ت کا تصور کرنے پر آمادہ نہیں جس کا اشارہ ہر چھوٹے

بڑے کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔ انھیں ایک کٹھ پتلی کی ضرورت تھی اور وہ انھیں مل گئی ہے۔ ان دنوں اس کے تار شجاع الدولہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن آگے چل کر یہ معلوم نہیں کہ یہ کٹھ پتلی کس کس کے ہاتھ میں کھیلے گی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق حاصل کریں گے لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دلی چہر ایک بار ان بیڑیوں کی شکا رگاہ بننے والی ہے جو بار بار اسے تاخت و تاراج کر چکے ہیں۔

شیخ صاحب! میں ایک سپاہی ہوں اور اب زندگی کی اس منزل میں داخل ہو رہا ہوں جب قوی ڈھیل پڑ جاتے ہیں اور ہمت عوام کا ساتھ نہیں دیتی۔ تاہم میرے حوصلے مرد نہیں ہوئے۔ کاش میں کسی ایسے شخص کی رفات میں جان دے سکتا جس کی نگاہیں میری قوم کے مستقبل سے روشن ہوں۔ میرے لیے پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے کسی صوبیدار کی فوج میں بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرنا مشکل نہ تھا لیکن میرے سامنے وہ لوگ تھے۔ جن کی زندگی کا مقصد قوم کی حفاظت کی بجائے قوم پر حکومت کرنا ہے۔ مجھے اگر صرف اپنی ذاتی خوشی اور سلامتی مطلوب ہوتی تو میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ بھی جا سکتا تھا لیکن مجھے اس وطن کی مٹی سے اسلاف کے خون پسینے کی منک آتی ہے۔ میں اپنے خرسن کی بھی ہوئی راکھ سے زندگی کی چنگاریاں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس دور کے رجب عظیم کا متلاشی ہوں۔ لکھنؤ سے میں یہ ارادہ لے کر نکلا تھا کہ اگر میں دکن اور ادھ کا اتحاد کر اسکا تو یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا لیکن دکن کے حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہاں کی نفاذ لکھنؤ کی نسبت کم متعفن نہیں۔ میرے نظام علی کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس کے پیش نظر میں ملک و قوم کے لیے اس کی ذات سے کوئی نیک توقع وابستہ نہیں کر سکتا۔ تاہم میں اس سے ملاقات کی ہوشش کروں گا۔

فخر الدین نے کہا: "میرے نظام علی ان دنوں بیمار آگئے ہوئے ہیں اور شاید چند ہفتوں تک واپس نہ آئیں۔ ان کی واپسی پر آپ کی ملاقات کا انتظام ہو جانے کا لیکن مجھے

اس ملاقات سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ سرنگا پٹم دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن یہ شہر آپ کے سفر کی آخری منزل بن جائے۔ میں حیدر علی کی آنکھوں میں قوم کے مستقبل کی امیدوں کی روشنی دیکھ چکا ہوں۔

معظم علی نے کہا: آپ پہلے بھی حیدر علی کی تعریف کر چکے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانی پت کی جنگ کے بعد مجھے دلی میں ایک نوجوان ملا تھا اور اس نے بھی مجھے سرنگا پٹم آنے کی دعوت دی تھی۔

فزا الدین نے کہا: "اس زمانے میں میں نے آپ سے جس حیدر علی کا ذکر کیا تھا وہ اس قدر مشہور نہ تھا۔ ان دنوں میسور کی ریاست بھی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی لیکن آج میسور ایک سلطنت ہے اور مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے عمل تعمیر کرنے والے قہمت آزما اپنے ذریعوں اور مشیروں سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ حیدر علی کون ہے؟ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔۔۔ باج انگریز، مرہٹے اور نظام جن میں سے ہر ایک جنوبی ہندوستان کو اپنی وراثت سمجھتا ہے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ قدرت نے ان کے راستے میں ایک ناقابل تسخیر پہاڑ کھڑا کر دیا ہے اس کی شہرت حیدر آباد، دلی، لکھنؤ، مدراس اور کلکتہ سے نکل کر لندن اور پیرس تک پہنچ چکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسی پرشکوہ شخصیت سے متعارف ہونے کے بعد آپ کو حیدر علی کی شخصیت کس حد تک متاثر کر سکے گی لیکن اس ملک کے حال اور مستقبل کے متعلق اس کے خیالات دہی میں جو آپ کے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "میں لکھنؤ میں بھی اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ میں دہلی ضرور جاؤں گا۔ اگر وہ اس تاریک دور میں قوم کا مشعل بردار بن سکتا ہے تو میں اس کے پیچھے چلنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھوں گا۔ سردست میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ براہ مہربانی تو میں آپ کو دہلی سے زیادہ تکلیف دینا

نہیں چاہتا۔ شاید مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے، اس لیے اپنے ایک علمبردار مکان کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔"

فزا الدین نے جواب دیا: "دیکھیے اگر آپ اس مکان میں اپنے آپ کو ایک اجنبی محسوس کریں تو میں بہتر سمجھوں گا کہ اسے آگ لگا دی جائے۔ اگر آپ حیدر آباد آ کر کہیں اور ٹھہریں تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ میں یہاں سے ہجرت کر کے کہیں اور چلا جاؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا: "شیخ صاحب آپ خفا ہو گئے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

فزا الدین نے کہا: "آپ نے بات ہی ایسی کی تھی۔"

فزا الدین کا رہائشی مکان بہت وسیع تھا اس نے اس کی بالائی منزل کا ایک حصہ معظم علی کے سپرد کر دیا اور اکبر خاں کو مہمان خانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا:



چند دن حیدر آباد رہ کر معظم علی کو اس تلخ حقیقت کا زیادہ شدت کے احساس ہونے لگا کہ مرہٹوں کے خلاف میر نظام علی کی فتوحات کی خبریں سن کر اس نے دکن کے مستقبل سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ محض ایک خواب تھیں۔ دلی کے تمام تگمگات حیدر آباد میں آپکے تھے اور دکن کے امراء دورِ زوال کے مغل شہزادوں کی طرح ملیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دکن کی بیشتر فوج ان امراء اور جاگیرداروں کے نجی دستوں پر مشتمل تھی جن کا مرکز وفا بدلتا رہتا تھا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں کی کمزوری اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر میر نظام علی نے دکن کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے تھے لیکن فوج کی مدد سے صلابت جنگ کو گدڑی سے اتارنے کے بعد اندرونی غلغلہ کے خطرے نے اسے اپنے بیرونی دشمنوں کے ساتھ سودا بازیوں پر مجبور کر دیا تھا۔ ابن الوقت اور غدار پرت

”خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ آپ حیدر آباد میں کیسے پہنچے اور یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں آپ کو اکثر یاد کرتا تھا۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ دس دن ہو چکے ہیں اور میں شیخ فخر الدین کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں۔ اسد خاں نے کہا۔ ”میں انہیں جانتا ہوں۔“

”آپ یہاں کب تشریف لائے تھے؟“ معظم علی نے سوال کیا۔  
”میں کوئی بیس دن قبل یہاں آیا تھا لیکن چند دن یہاں رہ کر نظام الملک سے ملاقات کے لیے بیدار چلا گیا تھا۔ پرسوں یہاں واپس پہنچا تھا اور انشاء اللہ کل یہاں سے سرنگاپٹم روانہ ہو جاؤں گا۔ میں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں، چلیے وہاں چل کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔“

معظم علی اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں مختصر اپنی سرگزشت سنانے کے بعد اس نے اسد خاں کے بیدار جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ ”میں نظام کے پاس حیدر علی کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔“

معظم علی نے پوچھا۔ پھر آپ کی ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا؟  
میری ملاقات کا صرف یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اب نظام الملک کے ساتھ آئندہ ملاقاتوں کا راستہ کھل گیا ہے لیکن ذاتی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا نظام علی جیسے آدمی سے دوستانہ ملاقاتیں کسی کے لیے سودمند ثابت نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتا اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ بغلیکے ہونے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں لیکن میسور کے لیے یہ ایک مجبوری ہے کہ نظام کو خوش رکھا جائے اور ایسے حالات پیدا نہ ہوں جو اسے جانتے جانتے بغیر اسے یا میری طرف سے ہوا جائے۔“

امراء کی اکثریت صلابت جنگ کا ساتھ چھوڑ کر حکومت کے نئے دعویدار کی طرف دار بن چکی تھی اور جن امراء کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی ان کی جگہ نئے جاگیردار پیدا کیے جا رہے تھے۔ میر نظام علی سے بغاوت کرنے والے چند امراء اور فوجی افسر حیدر آباد سے باہر پناہ ملے چکے تھے۔ اس کے دوسرے بھائی بسالت جنگ کو دکن میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا اور وہ کسی وقت بھی خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ نظام علی نے اسے مطمئن کرنے کے لیے ادھونی کی حکومت اس کے سپرد کر دی اور دریا سے کرشنا کے جنوب میں چند اضلاع اس کے حوالے کر دیئے۔ بسالت جنگ بظاہر ادھونی کا خود مختار حکمران تھا لیکن عملاً اس کی سلطنت حیدر آباد کی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی۔

معظم علی بیکار بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ وہ کبھی فخر الدین کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر کسب خاں کے ساتھ سیر کی نیت سے شہر کے باہر نکل جاتا۔ فخر الدین کے دسترخوان پر دو دنوں وقت شہر کے چند امراء تاجریا علماء موجود ہوتے ایک دعوت میں معظم علی کی ملاقات شہر کے ایک ایسے رئیس سے ہوئی جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتب میں جمع کرنے پر صرف کرتا ہے۔ اس نے اپنے کتب خانے کی چند نایاب کتابوں کا ذکر کیا اور معظم علی اس کا کتب خانہ دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے بعد یہ کتب خانہ معظم علی کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ایک دن معظم علی چند گھنٹے اس کتب خانے میں صرف کرنے کے بعد واپس گھر آ رہا تھا کہ بازار میں کسی نے اچانک اس کا بازو دیکھ کر روک لیا۔ معظم علی نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ اجنبی نے کہا۔ ”میں اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو میں دلی میں آپ سے مل چکا ہوں۔“

معظم علی چند تائید تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا۔ ”ارے آپ اسد خاں ہیں۔“



معظم علی نے کہا: ”آپ کو یاد ہے کہ جب دلی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے مجھے سرنگاٹم آنے کی دعوت دی تھی؟“

”ہاں مجھے یاد ہے اور میں اب بھی آپ کو سرنگاٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر میں کبھی آپ کو اپنے ساتھ لے جا سکوں تو میں سمجھوں گا کہ میرا یہ سفر بہت کامیاب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میسور کے حالات دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کے بہترین خواب دہاں پورے ہو رہے ہیں۔ آج جب کہ لوے لنگڑے، اندھے بہرے اور اپنا بچ لوگ قوم کی سیادت کے دعویدار بنے ہوئے ہیں، میسور کا اولوالعزم حکمران اپنی توار کی نوک سے اس ملک کے نقشے پر نئی نئی کیڑیں کھینچ رہا ہے۔ جب میں نے دلی کی جامع مسجد میں آپ کی تقریر سنی تھی تو میں نے بے عسوس کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار حیدر علی کو دیکھ آئیں۔“

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”میرے ساتھ اکبر خاں بھی آیا ہوا ہے۔ وہ دلی میں آپ سے ملا تھا۔ اگر آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو ممکن ہے ہم دونوں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

اسد خاں نے جواب دیا: ”میں ایک دو دن کی بجائے ایک دو ہفتے آپ کے لیے ٹھہر سکتا ہوں۔“

سرکاری مہمان خانے میں پہنچ کر معظم علی دیر تک اسد خاں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کا موضوع زیادہ ترجید علی کی شخصیت تھی۔ قریباً دو گھنٹے کے بعد معظم علی نے اٹھ کر کہا: ”اب مجھے اجازت دیجیے۔“

اسد خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ”تو اس بات کا ذہید ہو چکا ہے کہ آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں؟“

”ہاں“ معظم علی نے جواب دیا۔ ”اور اگر خدا کا فضل شامل حال رہا تو ہم انشاء اللہ

پرسوں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“



اکبر خاں اپنے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور بلا ”آپ نے بہت دیر لگائی۔ میں بہت پریشان تھا۔“ معظم علی نے جواب دیا: ”میں کتب خانے سے نکلا تو راستے میں اداہمک اسد خاں سے ملاقات ہو گئی۔ یہ اسد خاں وہی ہے جو ہمیں دلی میں ملا تھا۔ ہم پرسوں اس کے ساتھ سرنگاٹم جا رہے ہیں۔ تم تیار ہونا۔“

اکبر خاں نے جواب دیا: ”میں تیار ہوں لیکن ہمیں بہت جلد واپس آنا پڑے گا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔“

اکبر خاں نے سوال کیا: ”آپ بھائی جان کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟“

”نہیں وہ یہیں رہیں گی۔ شیخ فخر الدین کہاں ہیں؟“

وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”میں ابھی ان سے مل کر آتا ہوں۔“ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا شیخ فخر الدین

کے دفتر میں داخل ہوا۔ شیخ فخر الدین اپنے منشی کو کوئی خط لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے

معظم علی کو اپنے قریب بٹھالیا اور منشی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”میں تمہیں کچھ دیر مسد بلاؤں

گا۔ اس وقت ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

جب منشی کمرے سے باہر نکل گیا تو شیخ فخر الدین نے معظم علی کی طرف دیکھ کر سوال

کیا: ”آپ سارا دن کہاں رہے؟“

معظم علی نے اس کے جواب میں اسد خاں سے اچانک ملاقات کی تفصیلات بیان

کردیں۔ بالآخر جب اس نے سرنگاٹم جانے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کیا تو فخر الدین نے کہا۔

یہ ضروری ہے کہ آپ یا تو اگلے بیٹے جائیں یا اس باہ کے اختتام سے پہلے یہاں داپ آجائیں۔ اگلے بیٹے کی تین تاریخ کو عطیہ کی بات آنے والی ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ آپ اور اکبر خاں اس موقع پر موجود ہوں۔

”میں ضرور پہنچ جاؤں گا لیکن ان کی منگی کہاں ہوئی ہے؟“  
ادھونی کے ایک جاگیردار کے لڑکے کے ساتھ۔ وہ بے لالت جنگ کے رشتے دار ہیں۔ لڑکے کا نام طاہر بیگ ہے اور وہ ادھونی کی فوج میں ملازم ہے۔ عطیہ کی شادی پر آپ کا موجود ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب بلیقیس بھی بڑی ہو چکی ہے اور میں ایک ہی دن دونوں بہنوں کی ستادی کے امکانات پر غور کر رہا ہوں۔“  
”بلیقیس کا رشتہ کہاں ملے ہوا ہے؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

فخر الدین مسکرایا۔ ”بلیقیس کے لیے میں نے جس نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔ اسے آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔“

معظم علی نے غور سے فخر الدین کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہا: میں جس نوجوان کو جانتا ہوں اس کا نام اکبر خاں ہے اور اگر آپ نے اسے پسند دیا ہے تو میں آپ کے حق انتخاب کی داد دینے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلیقیس اگر میری مٹی ہیں ہوتی تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔“

فخر الدین نے کہا: ”بلیقیس اور عطیہ دونوں آپ کو لگے بھائی سے زیادہ عزیز سمجھتی ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔“

”ابھی اکبر خاں سے اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔“  
فخر الدین نے کہا۔ ”اکبر خاں سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہمیں صرف ان کے بھائی جان کی رضا مندی کی ضرورت تھی۔ آج صبح جب آپ باہر گئے تھے تو ہمارے گھر میں یہ مسکراہٹ پیش ہوا تھا۔ پھر جب میں نے اکبر خاں سے کہا تو اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا۔“

آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ اسے بلاوجہ یہاں لائے تھے۔

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ مجھے یہ جوڑا ابتداء ہی سے بہت جھلا معلوم ہوا تھا۔ بارہا میرے دل میں خیال آیا کہ آپ کو خطا کھوں لیکن جرات نہ ہوئی اور اب میرا خیال تھا کہ سرنگا پٹم سے واپس آکر یہ مسکراہٹ آپ کے سامنے پیش کر دوں گا اور پیش کرنے سے پہلے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈلوادوں گا۔ تاکہ اگر آپ ہمیں فوراً گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس کریں تو ہمیں پریشانی نہ ہو۔“

فخر الدین نے کہا۔ ”میرے دوست میں پتھر اور ہیرے میں تفریق کر سکتا ہوں۔“  
مختواری دیر بعد معظم علی، اکبر خاں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اکبر خاں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

معظم علی نے کہا: ”اکبر خاں گھر سے آئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سرنگا پٹم جلنے کی بجائے آج ہی کھٹورہ اندھو جائیں تم لوگوں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دو۔ ہم شام سے پہلے ایک منزل طے کرنا چاہتے ہیں۔“  
اکبر خاں کے چہرے پر اچانک مایوسی کے بادل چھا گئے۔

معظم علی نے پھر کہا۔ ”جاد اکبر دیر نہ کر دو! میں شیخ فخر الدین سے اجازت لے چکا ہوں۔“

”لیکن بھائی جان۔۔۔۔۔!“

”کیا ہے اکبر؟“

”کچھ نہیں بھائی جان! اس نے بدلی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔“

”اے شہرہ کیا بات ہے، تم واپس نہیں جانا چاہتے؟“

اکبر خاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور معظم علی نے ایک تہقیر لگانے کے بعد آگے بڑھ کر

اسے گلے لگایا۔

”نالائق تم بہت خوش قسمت ہو۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ شیخ صاحب کے ساتھ تمہاری کیا باتیں ہوئی تھیں؟“

اکبر خاں کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا رہی تھی۔  
تیسرے دن علی الصباح معظم علی اور اکبر خاں اسد خاں کے ہمراہ شگاپٹم کا رخ کر رہے تھے :-



ایک روز دوپہر کے وقت معظم علی اور اس کے ساتھی سرنگاپٹم میں داخل ہوئے۔  
اسد خاں انہیں اپنے مکان پر شہر اکبر حیدر علی کے پاس بلا گیا۔ شام کے وقت اس نے واپس آکر معظم علی کو اطلاع دی کہ نواب حیدر علی کل صبح آپ سے ملاقات کریں گے۔  
اگلے دن صبح کی نماز کے تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اکبر خاں اپنے میزبان کے ساتھ شاہی محل کی طرف چل دیئے، وہ بائیں باغ میں داخل ہوئے تو اسد خاں نے باغ کے دریاں ایک سائبان کے قریب پہنچ کر کہا : آپ یہاں تشریف رکھیں۔ اس وقت وہ عام طور پر یہیں ملاقات کیا کرتے ہیں۔“

وہ سائبان کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انہیں دو نوکر اور ایک کم سن لڑکا باغ میں بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ کسن لڑکا نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا۔ ستوڑی دو دو جا کر نوکروں نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جھبکا لیکن اس نے غزا کر اپنے دونوں اگلے پیچھے اٹھائے اور نوکر بدعاس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے نوکر نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کسن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی۔

”اب اسے لے جاؤ لڑکے نے نوکر کی طرف زنجیر بڑھاتے ہوئے کہا۔“  
”حضور یہ کاٹتا ہے۔“

”تم یوں ہی ڈرتے ہو۔ دیکھو“ لڑکے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔

جب شیر کا بچہ لڑکے کا ہاتھ چلنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا تو اس نے فاختہ انداز سے نوکروں کی طرف دیکھا اور کہا : ”تم اگر اس سے ڈرو گے تو یہ خواہ مخواہ کاٹے گا۔“

ایک نوکر نے کہا : ”نہیں حضور اگر ہم نہ ڈریں تو بھی یہ کاٹتا ہے۔“  
”یہ کن ہے؟“ معظم علی نے اسد خاں سے سوال کیا۔

”یہ شہزادہ فتح علی ٹیپو ہیں۔ انہیں شیروں کا بہت شوق ہے۔“  
”معمظم علی نے کہا۔“ ایک شہزادے کے لیے شیروں سے بہتر کیا کھلونے ہو سکتے ہیں۔ انہیں بلایئے۔“

اسد خاں نے اٹھ کر آوازی۔ شہزادہ صاحب ! ادھر تشریف لائیئے۔“

ٹیپو، شیر کا بچہ نوکروں کے حوالہ کر کے اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا سائبان کی طرف بڑھا۔ معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹیپو نے ”السلام علیکم“ کہہ کر کیے بعد کیے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور معظم علی اور اکبر خاں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسد خاں نے کہا : ”شہزادہ صاحب ! یہ معظم علی خاں ہیں۔ آپ مرشد آباد کے رہنے والے ہیں۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے آپ سراج الدولہ کی فوج میں عہدہ دار تھے اور یہ وہی کھنڈ کے سردار اکبر خاں ہیں۔ آپ پانی پت کی جنگ کے متعلق بہت سوالات کیا کرتے ہیں اور یہ دونوں اس جنگ میں حصہ لے چکے ہیں۔“

شہزادہ ٹیپو نے کہا : ”مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو

کے لیے پیدا ہوا ہے ۔

حیدر علی نے کہا : اسدخان تھاری میزبانی ختم ہو چکی ہے اور آج سے یہ میرے مہمان ہیں۔ پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا : میں اسدخان کی زبانی آپ کی سرگزشت سن چکا ہوں اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی ہے اسدخان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت جلد واپس جانا چاہتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو اس ملک کے مسلمانوں کے لیے کسی مضبوط قطعے کی تلاش ہے تو آپ دوبارہ یہاں آئیں گے۔ جو ٹرپ آپ کو پانی پت کے میدان میں لے گئی تھی اور جو دلولہ آپ کو حیدر آباد لایا ہے۔ وہ کسی دن آپ کو یہاں آنے پر مجبور کر دے گا۔ کادیری کے پانی کے بغیر آپ کی پیاس نہیں بجھے گی۔ اگر آپ ایک اچھے سپاہی ہیں تو میسور کی فوج میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ مدبر اور سیاست دان ہیں تو آپ یہ غوس کریں گے کہ آپ کی یہاں ضرورت ہے۔ اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو میسور میں آپ کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہیں اور اگر آپ ایک بلند پایہ عالم ہیں تو یہاں آپ کے قدر دان موجود ہیں۔ اسدخان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے سفر کا مقصد اس ملک کے مسلمان حکمرانوں میں اتحاد اور تعاون کے امکانات معلوم کرنا ہے۔ آپ میری طرف سے ان سب کو یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ جب وہ کسی اجتماعی خطرے کی مداخلت کے لیے متحد ہوں گے تو مجھے سب سے اگلی صف میں پیش گے۔ میرے نزدیک ہندوستان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ انگریز ہیں اور جب تک جنوب میں ان کے بھٹنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے ہیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ میں جنوبی ہندوستان کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے نظام کی دوستی کا طلبگار ہوں اور اگر سرٹھے پرامن رہے تو میں ان کے ساتھ بھی الجھنا پسند نہیں کروں گا۔

معظم علی نے کہا : خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے

تو آپ مجھے جنگ کا نقشہ بنا دیں۔ پھر میں آپ سے چند سوالات پوچھوں گا۔  
ٹیپو کی عمر گیارہ سال سے زیادہ تھی لیکن اس کا چہرہ اس کی عمر کے مقابلے میں بہت سنجیدہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ چمک دار آنکھوں سے غیر معمولی ذہانت مترشح تھی۔ تاہم معظم علی کے نزدیک وہ ایک کسن بچہ تھا۔

اس نے کہا : بہت اچھا میں آپ کو نقشہ بنا دوں گا۔  
ٹیپو نے کہا۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو میں ابھی کاغذ قلم منگواتا ہوں :  
حیدر علی علی کی طرف سے نمودار ہوا اور اسدخان نے جلدی سے اٹھ کر کہا : وہ

آ رہے ہیں !  
معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔  
شہزادہ ٹیپو نے کہا : آپ ابا جان سے ملاقات کے بعد کہیں غائب نہ ہو جائیں۔  
اسدخان نے کہا : شہزادہ صاحب آپ مطمئن رہیں۔ یہ میرے مہمان ہیں اور جب تک یہ نقشہ نہیں بنائیں گے میں انہیں کہیں غائب نہیں ہونے دوں گا۔  
تھوڑی دیر بعد حیدر علی سانبان میں داخل ہوا اور اسدخان اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آپ معظم علی ہیں ؟“ اس نے سوال کیا۔  
”جی ہاں“

”اور آپ اکبر خاں ہیں ؟“

”جی ہاں۔“ اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی اور اکبر خاں کی نگاہیں رعب و طلال کے اس پیکر عجم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ حیدر علی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے خد خال یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کم نہیں

کر نظام انگریزوں کے خلاف آپ کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں کی مدد سے میسور پر قبضہ جانے کی کوشش کرے گا اور مرہٹے بھی آپ کی بیٹی میں چھرا گھونپنے کا کوئی موقع ملتا ہے نہیں جلنے دیں گے۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ جنوبی ہند میں ایک طاقتور مسلم حکمران کا عروج برآمدت نہیں کریں گے۔ آپ کو بیکہ وقت ان تین طاقتوں کے خلاف جنگ لڑنی پڑے گی اور مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اودھ اور دکن کے مغوج اور بے بس امراء آپ کو کوئی مدد دے سکیں گے۔ میرا مقصد آپ کی حوصلہ شکنی نہیں، لیکن بنگال کے واقعات نے مجھے بہت زیادہ حقیقت پسند بنا دیا ہے۔

حیدر علی مسکرایا: ایک حقیقت پسند آدمی کی گفتگو میری حوصلہ شکنی یا دلازاری کا باعث نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دن مجھے تمہارا بھڑلایا اور گیدڑوں کی افواج کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا لیکن مجھے خدا کی اعانت پر بھروسہ ہے، اگر مجھے کام کرنے کی مہلت مل گئی تو میں میسور کی سرزمین کو ایک ناقابل تخیر قلعے میں تبدیل کر دوں گا۔ میں وہ فوج تیار کروں گا جو ہر میدان میں ان حریف طالع آزمادوں کے دانت کھٹے کر سکے گی۔ میرے بھڑلے تلے کرانے کے سپاہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں اس وطن کی خاک اپنی جاذب سے زیادہ عزیز ہوگی۔ جب تک میرے ہاتھ تلوار اٹھا سکیں گے میں تلوار ہوں گا اور آپ جیسے لوگ حیدر آباد کے مسلمانوں کو یہ بتا سکیں گے کہ میسور کی جنگ تمہارا بقا اور تمہاری عزت اور آزادی کی جنگ ہے۔

حیدر علی گفتگو کے دوران میں معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ برسوں بے آب دیکھا صحرائوں میں گھومنے کے بعد اپنے سینوں کی مادی میں پہنچ گیا ہے اس کا دل حیدر علی کے لیے عقیدت اور محبت کے جذبات سے مہرین تھا۔ اس نے کہا: مجھے یہاں آنے کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں ابھی بے کاوری کے پانی کی مٹھاس محسوس کر رہا ہوں۔

حیدر علی نے ہتھ کر مصلحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: میں آپ کا انتظار کر رہا

گا لیکن جتنے دن آپ یہاں ہیں، میں آپ کی موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اب انشاء اللہ شام کے وقت ملاقات ہوگی۔

سانبان سے تھوڑی دیر محل کے دروازے کے سامنے چند سپاہی اور افسر گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اکبر خاں سے ہاتھ ملایا اور شہزادہ ٹیپو کی طرف متوجہ ہو کر کہا: آؤ بیچ علی! ٹیپو نے کہا: ابا جان مجھے ان سے ایک کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک پہنچ جاؤں گا۔

حیدر علی نے جواب طلب نگاہوں سے اسد خاں کی طرف دیکھا اور اس نے کہا: عالی جاہ! شہزادہ ٹیپو ان سے پانی پت کے میدان کا نقشہ بنوانا چاہتے ہیں۔ حیدر علی نے مسکرا کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ یہاں آپ کی ضرورت ہے؟

تھوڑی دیر بعد حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا اور معظم علی اکبر خاں، اسد خاں اور شہزادہ ٹیپو کے ساتھ شاہی مہمان خانے میں داخل ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے حکم سے ایک سپاہی کاغذ اور قلم لے آیا اور معظم علی قالمین پر میٹھ کر نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ معظم علی کا خیال تھا کہ ایک کسٹ کے کو مطلق کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگے گا لیکن شہزادہ ٹیپو کے غیر متوقع سوالات کے جواب میں اسے میدان جنگ کی تمام تفصیلات اور جزئیات پر متوجہ کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کاغذ ان بشمار نشانات اور کیوں سے بھر چکا تھا۔ جن سے فریقین کے پڑاؤ، ان کے ریسدا اور ملک کے راستوں ان کی افواج کی صفوں اور ان کے توپخانوں اور مختلف معرکوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

نقشہ ختم کرنے کے بعد معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پانی پت کی جنگ کی پوری تاریخ بیان کر چکا ہے۔ جب کہ شہزادہ ٹیپو نے معظم علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد

وہاں سے چلا گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، خدا اس لڑکے کو  
نظرِ بد سے بچائے۔ بعض اوقات اس کے سوالات سے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے  
پیر سالار سے باتیں کر رہا ہوں۔ شہزادہ کی عمر کتنی ہے؟

اسد خاں نے جواب دیا: "ان کی عمر بارہ سال سے کم ہے لیکن حیدر علی کے بیٹے  
کے مزے ایسی باتیں عجیب معلوم نہیں ہوتی چاہئیں۔ قدرت نے اسے ایک غیر معمولی  
ذہانت عطا کی ہے۔ کل اگر آپ اس کا امتحان لیں تو یہ نقشہ اسے اپنے ہاتھ کی کیروں کی  
طرح یاد ہوگا۔"

معظم علی نے کہا: "پہلے میرا خیال تھا کہ بچے کو بہلانے کے لیے چند لائی میٹھی کریں  
کیسٹنج دون کا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ اس لڑکے سے باتیں کرنے  
کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دن میرے جیسے ہزاروں انسان اس کی رفاقت میں  
جینا اور مرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ اسد خاں، تم درست کہتے تھے۔ مجھے  
بہت جلد دوبارہ یہاں آنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ میں حیدر آباد سے لکھنؤ جانے کا خیال  
توڑ کر دوں۔"

اگلی صبح اسد خاں، معظم علی اور اکبر خاں کو شہر میں اسلحہ سازی کا کارخانہ دکھانے  
کے لیے لے گیا جہاں تواریں، بندوقیں اور توپیں بنائی جا رہی تھیں۔ بندوقوں کے  
کارخانے کی نگرانی ایک فرانسیسی ماہر کے سپرد تھی۔ کارخانے کے منتظم نے معظم علی کو  
چند بندوقیں دکھانے کے بعد کہا: "یہ بندوقیں دلائی کی بہترین بندوقوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں  
اور ہمیں امید ہے کہ ہم اگلے سال تک توپیں بنانے کا کام بھی شروع کر دیں گے۔"  
اسلحہ سازی کا کارخانہ دیکھنے کے بعد اسد خاں اپنے مہماؤں کو فوجی مستقر میں لے گیا  
جہاں ہزاروں سپاہی پریڈ کرنے اور دفاعی مورچے تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ وسیع  
میدان میں کہیں نیو بازی اور کہیں چاند ماری ہو رہی تھی۔ حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو گھوڑوں

پر سوار ہو کر مختلف فوجی کھیلوں میں حصہ لینے والے سپاہیوں کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔  
اسد خاں نے معظم علی سے کہا: "اگر آپ میسور کا دورہ کریں تو آپ کو یہاں کے ہر  
شہر میں اسی طرح کا جوش اور ولولہ دکھائی دے گا۔ حیدر علی ملک کے ہر باشندے کو  
سپاہی بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے سوال کیا: "۲۵ ہفتوں نے شہزادہ ٹیپو کی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے؟"  
اسد خاں نے جواب دیا: "حیدر علی کے سامنے اہم ترین مسئلہ ٹیپو کی تعلیم ہے۔ ٹیپو  
کے استاد اپنے وقت کے بہترین عالم ہیں۔ نواب حیدر علی یہ کہہ رہے ہیں کہ قدرت نے  
میرے ہاتھ میں صرف توار دی ہے لیکن میرے بیٹے کے ہاتھ میں قلم بھی ہوگا۔ ٹیپو کی ذہانت  
کا یہ عالم ہے کہ انھیں ایک سبق دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟"



فرحت کی ماں اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہوئی تھی اور فرحت اپنے کمرے میں  
بیٹھی عطیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ تنہا صدیق علی ایک جھولے میں سو رہا تھا۔ بقیس بھاگتی  
ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "بھابی جان! بھابی جان! بھائی جان  
آگئے!"

فرحت کا چہرہ غشی سے متما اٹھا۔ عطیہ نے ایک شرارت آمیز قسم کے ساتھ  
بقیس کی طرف دیکھا اور کہا: "بقیس تم اتنی بدحواس کیوں ہو۔ بھابی جان کے ساتھ تھاکر  
دولہا میاں بھی آئے ہیں یا نہیں؟"

بقیس پریشانی کی حالت میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ فرحت نے  
مسکرا کر کہا: "عطیہ دیکھو میری بہن کو مت چھیڑو۔ آؤ بقیس بیٹھ جاؤ!"

بقیس آگے بڑھ کر فرحت کے قریب بیٹھ گئی۔ عطیہ نے اسے دبا  
کہا: "بھابی جان سچ کہتی ہوں بقیس کئی دن سے پریشان تھی اور آج صبح



ہونے دیا کہ اس کی بیٹیاں تہیم ہیں۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو بیش قیمت زیورات کے علاوہ دودو ماہی اور تیس تیس گھوڑے جہیز میں دیئے۔

عطیہ کا شوہر ایک خوش وضع نوجوان تھا اور معظم علی اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے معظم علی کو بڑے اصرار کے ساتھ ادھونی آنے کی دعوت دی۔ عطیہ کی سواری کو رخصت کرنے کے بعد معظم علی ہمان خانہ کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اکبر خاں شادی کے لباس میں بیٹھا ہوا تھا۔

”کیوں بھی کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے کہا۔

”کچھ نہیں بھائی جان“ اکبر خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میری زوجہ سے شیخ فخر الدین کی سبکی ہوئی ہوگی۔ حیدر آباد کے امیر میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوں گے۔ میں رسومات کا قائل نہیں لیکن شیخ فخر الدین کی خاطر میں رد سیکھنڈ سے برات کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔“

معظم علی نے کہا: ”ارے میں سمجھا تھا کہ تم پانی پت کی جنگ کے متعلق سوچ رہے ہو۔ شیخ فخر الدین تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ اگر وہ دکھاوے کی ضرورت محسوس کرتے تو اسی شہر سے دس ہزار آدمی تمہاری برات میں جمع ہو سکتے تھے۔ تم بہت خوش قسمت ہو اکبر! میں نے تمہارے لیے اس لڑکی کو اس دن منتخب کیا تھا۔ جب حیدر آباد کے راستے میں ان لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ فخر الدین تمہیں کم از کم ایک ہفتہ اور یہاں ٹھہرانے پر مقرر ہیں اور ملتے دن چھ بھی یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد تمہاری منزل رد سیکھنڈ ہوگی اور میرا رخ سرنگا پٹم کی طرف ہوگا۔ میں لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں۔ وہاں میری جائداد میں شیر علی اور تم برابر کے حقدار ہو۔ میں نے انھیں یہ لکھ دیا ہے کہ آئندہ وہ تجارت میں میرے حصے کا منافع تمہیں بھیجتے رہیں۔ آج تمہاری سیر و سیاحت کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد تمہیں اپنے گھر پہنچ کر نئی نئی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔“

ہی بوجھ اس تھی۔“

بلقیس اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سر ہلایا احتجاج بن کر بولی۔ ”بھابی جان! آپا مجھے تنگ کرتی ہیں!“

”نہ بھی عطیہ میری سہیلی بہن کو تنگ نہ مرد۔“

عطیہ نے کہا: ”بھابی جان یہ بالکل مصنوعی غصہ ہے۔ ہم پر خواہ مخواہ رعب ڈالا جا رہا ہے۔ درنہ یہ دل میں ہنس رہی ہے۔“

فرحت نے کہا: ”ہاں بھی تم سچ کہتی ہو یہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔“

بلقیس تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے باہر نکل گئی لیکن دروازے کے باہر پہنچ کر وہ اچانک رکی اور مڑ کر کمرے کی طرف جھانکتے ہوئے بولی۔ ”بھابی جان! بھابی جان وہ ادھر آ رہے ہیں۔“

عطیہ بوجھ اس ہو کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

جب وہ بائندے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو بلقیس نے پیچھے سے اچانک تہمت لگاتے ہوئے کہا: ”ٹھہریے آپا جان آپ کیوں بھاگ رہی ہیں وہ تو ماہوں جان کے دفتر میں گئے ہیں۔“

”بڑی چڑیل ہو تم! عطیہ نے مڑ کر کہا۔“

چند دن بعد اسی مکان کے پچھلے حصے کے ایک کمرے میں عطیہ اور بلقیس دھنوں کے لباس اور قیمتی زیورات پہنے بیٹھیں عطیہ کی برات دودن شیخ فخر الدین کے یہاں تیم کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فرحت دھنوں کے گرد جمع ہونے والی عورتوں کو ادھر ادھر بٹائی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے عطیہ اور بلقیس کے گلوں میں کیے بعد گہرے موتیوں کا ایک ایک مار ڈالتے ہوئے کہا: ”یہ تمہارے بھائی جان کا تحفہ ہے۔“

عطیہ کی برات بڑی دھوم دھام سے آئی تھی۔ فخر الدین نے اپنی بہن کو یہ احساس نہ



اکبر خاں نے ابدیدہ ہو کر کہا۔ ”بھائی جان یہ بات میرے دہم دنگان میں بھی نہ تھی کہ ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ مجھے آپ کی جان بڑا کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن آپ کی رفاقت سے محروم ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اگر آپ نظر نہ رکھنا چاہتے ہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ ورنہ روہیکھنڈ میں میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلتے ہیں آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ آپ وہاں ایک اجنبی ہیں۔“

معظم علی نے شفقت سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اکبر میں اپنی منزل دیکھ چکا ہوں۔ میں کسی جلتے پتھار کی تلاش میں نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے صرف اپنے فرائض کا احساس سرنگاپٹم لے جا رہا ہے۔“

”تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

”نہیں اکبر! تمہارے فرائض تمہیں روہیکھنڈ مل رہے ہیں۔ تم میری طرح تنہا نہیں ہو۔ تم ایک قبیلے کے سردار ہو اودان لوگوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں۔ میرے ساتھ رہ کر تم نے جو تجربات حاصل کیے ہیں وہ تمہاری رہنمائی کریں گے۔ میں تمہیں روہیکھنڈ کا بہترین سردار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی وہاں جاؤں تو تمہارے قبیلے کے ہر فرد کے چہرے پر مسرت کی مسکراہٹیں دیکھوں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ تم روہیکھنڈ کے مسلمانوں کی آزادی کے پاسبان بنو اور تمہارے بعد تمہارے بیٹے پاوتے اپنے وطن کی آزادی کا پرچم بلند کریں۔“

اگلے ہفتے یہاں سے ایک قافلہ لکھنؤ جا رہا ہے۔ شیخ فخر الدین کی خواہش ہے کہ تم اس قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ پہلے وہ تمہیں یہاں رکھنے پر مسموع تھے لیکن میرے ساتھ بحث کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تمہیں اپنے گھر جانا چاہیے۔“

شادی سے دس دن بعد اکبر خاں، حیدر آباد سے لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا۔ بلقیس اپنی

دو خدا ماؤں کے ساتھ ایک پہلی میں سواری تھی۔ جہیز کے ہاتھیوں، گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کی حفاظت کے لیے فخر الدین نے قافلے کو ناکافی سمجھ کر ان کے ساتھ اپنے بچاں مسلح نوکر دروازہ کر دیئے تھے۔ اکبر خاں شہر سے باہر نکلتے ہی معظم علی سے رخصت ہونا چاہتے تھے لیکن معظم علی کچھ دور اس کا ساتھ دینے پر مصر تھا۔ شہر سے ایک کوس دور آنے کے بعد اکبر خاں نے کہا۔ ”بھائی جان! آپ بہت دور آگئے ہیں۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”نہیں اکبر خاں میں کچھ دور اور تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

کچھ فاصلہ ادرطے کرنے کے بعد اکبر خاں نے پھر ایک بار خدا حافظ کہنے کی کوشش کی لیکن معظم علی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ قافلے نے ایک سستی سے باہر پڑاؤ ڈالا۔ لوگوں نے بلقیس کا خیمہ نصب کر دیا۔ عشاء کی نماز کے بعد بلقیس اپنے خیمے میں سو رہی تھی اور معظم علی اور اکبر خاں تھوڑی دور کھلی ہوا میں ایک چٹائی پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے بعد جب قافلہ دوبارہ دروازہ ہونے لگا تو اکبر خاں نے کہا۔ ”بھائی جان آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے اب آپ اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ ورنہ آپ کو روہیکھنڈ تک ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”نہیں، اب میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ اب تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور دیکھو میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔ خدا حافظ۔“ معظم علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اکبر خاں مصافحہ کرنے کی بجائے بے اختیار اس کے ساتھ لیٹ گیا اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان آج تو میں آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھ رہا ہوں۔“

”جاؤ، تالاف۔“ معظم علی کی آواز اس کے حلق میں بیٹھ گئی۔

اکبر خاں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور

## سولھواں باب

گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ قافلہ چند قہر آگے جا چکا تھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے کو اڑ لگانے سے پہلے ایک ثانیہ کے لیے مرکز معظم علی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں کہا: "خدا حافظ! میرے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی، میرے باپ، خدا حافظ!"

معظم علی کچھ دیر اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا رہا۔ پھر اس نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیلے پر گھوڑا روک کر درختوں میں روپوش ہوتے ہوئے قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔

تیسرے دن معظم علی ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ میسور کا رخ کر رہا تھا۔

سرنگا پٹم میں حیدر علی کی رفاقت کے ایام معظم علی کے لیے قدرت کا بہترین نعام تھے۔ میسور کی سرزمین اس کے خوابوں کی جنت تھی اور زندگی کی کوئی خوشی ایسی نہ تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ وہ ایک ایسے قافلے کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ چکا تھا جس کے مسافروں کے دل ذوق یقین سے لبریز تھے۔ وہ اپنی منزل مقصود دیکھ چکا تھا اور اسے اپنے راستے کے نشیب و فراز کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔ اسے زندہ رہنے کے لیے ایک مقصد کی ضرورت تھی اور سرنگا پٹم میں آباد ہونے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کا ہر سانس ایک مقصد کے لیے وقف ہے۔ اس نے حیدر علی کی فوج کے پانچ سو سواروں کے کمانڈر کی حیثیت سے سرنگا پٹم میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور پانچ سال کے عرصہ میں اپنی محنت، قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت سرنگا پٹم کی محفوظ فوج کے تین ہزار جوانوں کا سالار اعلیٰ بن گیا۔ نظم و ضبط اور مستعدی کے لحاظ سے اس سے تربیت حاصل کرنے والے سپاہیوں کو حیدر علی کی فوج میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سرنگا پٹم پہنچنے کے پہلے اور تیسرے سال اس کے ہاں دولہا کے اور پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام سعود علی اور دوسرے کا نام انور علی رکھا گیا۔ اکبر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ اس کی خط و کتابت جاری رہی لیکن آہستہ آہستہ نامرد پیام کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ان تھک مصروفیت کے باوجود اسے فرحت کی رفاقت میں زندگی کے ماہ و سال

ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ اس کا مکان سرگاپٹم کے چند بہترین مکانات میں سے ایک تھا۔ میسور کی فوج کے بڑے بڑے آدمیوں کا رجمنٹل اور انفراسے اپنا دوست اور رفیق سمجھے تھے۔ حیدر علی اہم ترین قومی اور سیاسی معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا اور وہ کن شہزادہ ٹیپو جس کی روشنی پیشانی پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی، اپنی فرصت کے لمحات اس کی صحبت میں بسر کیا کرتا تھا۔ معظم علی اپنی رفیقہ حیات سے اکثر یہ کہا کرتا تھا۔ فخرت! مجھے قدرت سے اب صرف ایک گلا ہے اور وہ یہ کہ جب مجھ میں دشوار گزار راستوں پر چلنے کی ہمت تھی تو میرے سامنے تاریکیاں تھیں اور جب میں صبح کی روشنی میں اپنی منزل دیکھ رہا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاؤں زیادہ دیر میرا بوجھ نہیں سہا سکیں گے۔ کاش میں اس ماہی کو واپس لاسکتا جس کی ہر آن زندگی کی دھڑکنوں سے لبریز تھی۔ صدیق، مسعود اور اورغش نصیب ہیں۔ جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کا قائد سالار فتح علی خاں ٹیپو ہوگا۔

جن ایام میں سلطنتِ خداوند میں حصوں اور دلوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے باقی حصوں میں آئے دن نئے نئے انقلاب آرہے تھے۔

بنگلہ کا نام نہاد حکمران میر قاسم، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر جعفر کی جگہ گدی پر بٹھایا تھا۔ ۱۷۸۳ء تک اپنے انگریز سرپرستوں کو اپنی رعایا کا خون ہینا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بنگال کے عوام روٹی نمک کے محتاج ہو چکے تھے لیکن انگریزوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور میر قاسم کو اپنا خزانہ خالی کرنے، اپنی بیگمات کا زیور بیچنے۔

حک کے تاجروں اور زمینداروں کو لوٹنے کے بعد اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے پاس ایسٹ انڈیا کمپنی کی بیوک کا کوئی علاج نہیں ہے۔

انگریزوں نے اس سے بنگال کی حکومت کی گدی چھین کر دوبارہ میر جعفر کے حوالہ کر دی۔ میر قاسم نے بنگال سے بھاگ کر اودھ میں پناہ لی۔ نواب وزیر اودھ اور منٹو شہنشاہ شاہ

جان دلوں الہ آباد میں اپنی بچاؤ کی زندگی گزار رہا تھا۔ میر قاسم کو مدد دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۷۸۵ء ستمبر تک ان میں کبکری جگ میں انھیں شکست ہوئی۔ میر قاسم نے ڈار جوکر جان بکائی اور شہنشاہ جسے ابھی تک دلی کے تخت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جلا۔ انگریزوں کی فوج نے مکھنہ کارخ کیا اور شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو مجبوراً انگریزوں سے صلح کرنی پڑی۔ انگریزوں نے نواب وزیر اودھ سے پچاس لاکھ روپیہ تادان جنگ وصول کیا اور الہ آباد اور کورہ کے اضلاع چھین کر شاہ عالم کے حوالے کر دیئے۔ الہ آباد کا قلعہ بھی انھوں نے شہنشاہ کے لیے خالی کر دیا۔ اور اس کی حفاظت پر انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ متعین کر دیا۔ بالفاظ دیگر دلی کا برائے نام شہنشاہ الہ آباد میں انگریزوں کا دست نگر اور وظیفہ خوار بن گیا اور اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سلاسل کے دروازے کھل گئے۔

۱۷۹۵ء میں میر جعفر نے وفات پائی اور انگریزوں نے اس کے پندرہ سالہ بیٹے نجم الدولہ کو بیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ اور اس کے علاوہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ بطور خراج پیش کرنے کی شرط پر بنگال کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوٹ کھسوٹ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

شمال میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے گورنروں کی سرگرمیاں اب زیادہ تر سکھوں کی بغاوتوں کو فرو کرنے تک محدود تھیں اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے علاوہ چارنل لاہور، جالندھر، دواپ، سرسہ اور ملتان کے علاقے سکھوں کے ہاتھوں بارہا تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ احمد شاہ ابدالی، نصیر خان بلوچ اور نجیب الدولہ کی افواج انھیں کئی میدانوں میں عبرت ناک شکستیں دے چکی تھیں لیکن جنتی سے ان شاندار فتوحات کے باوجود سکھوں پر دائمی غلبہ رکھنے کے لیے پنجاب میں مستقل طور پر کوئی بڑی فوج موجود نہ تھی۔ جب احمد شاہ ابدالی کا شکر پیش قدمی کرتا تو سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے لیکن ان کی دایہ

کے ساتھ ہی وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ قتل و غارت شروع کر دیتے۔

جنوب میں مرہٹے دوبارہ سراٹھا رہے تھے۔ انھوں نے پانی پت کی جنگ میں جو زخم کھاتے تھے۔ وہ مندمل ہو رہے تھے لیکن ان کی توجہ شمال کی بجائے جنوب کی طرف تھی، یہاں نظام اندا گریز ان کے حریف تھے لیکن یہ تینوں طاقتیں اب ایک دوسرے سے نظریں ہٹا کر حیدر علی کی توجہ متوجہ ہو چکی تھیں میسور کی خوشحالی اور ترقی اور میسور کے حکمران کی شخصیت ان سب کی آنکھ کا نا سورا بن چکی تھی۔ حیدر علی کی طاقت پھیل کر میسور کی بندر بانٹ کرنے کے لیے ۱۷۹۷ء میں ان گڑھوں، بیٹروں اور گیدڑوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ میر نظام علی نے اپنے انگریز اور مرہٹہ حلیوں کے ساتھ حملے کی تفصیلات طے کرنے کے بعد بنگلور کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں سے کوئی تیس میل دور جینا پٹنا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میر نظام علی کے وسیع خیمے میں مغل رقص و سرور کا راستہ تھی۔ دُزار اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے دایں بائیں دونوں فرؤ تھے۔ ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے گورنر جیالانے کے بعد کہا۔

”حضور! انگریز فوج کا ایک کپتان اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔“

نظام نے جواب دینے کی بجائے قہر کو دنگا ہوں سے اپنے پر سالار تہوہ جنگ کی طرف دیکھا اور وہ قدرے وقت کے بعد اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

نظام علی نے شیر الملک کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ”یہ لوگ ایسی بارش میں بھی آرام نہیں کرتے۔ میں انھیں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ موسم جنگ کے لیے موزوں نہیں۔“

شیر الملک نے جواب دیا۔ ”لیکن حضور! مدراس کے گورنر کا یہ خیال تھا کہ برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہیں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لینا چاہیے۔ اگر مرہٹوں کی طرف سے تاخیر نہ ہوتی تو اس وقت تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔“

نظام نے جواب دیا۔ ”مرہٹے ہماری نسبت زیادہ ہوشیار ہیں۔ وہ اس وقت تک میدان میں نہیں آئیں گے جب تک کہ کوئی دھجی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔“

نظام کے محافظ دستوں کے سالار اعلیٰ شمس الامراء نے کہا۔ ”حضور! یہی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مزید ہوشیاری کا ثبوت دیں اور جنگ میں شریک ہی نہ ہوں۔“

شیر الملک نے بہم ہو کر کہا۔ ”آپ کو حضور نظام کے اتحادیوں کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

شمس الامراء نے جواب دیا۔ ”معاف کیجیے، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حضور نظام کی وفاداری میں کوئی مجھ سے آگے ہے لیکن جب تک مرہٹے میدان میں نہیں آجاتے میں ان کی نیک نیتی کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

شیر الملک کی توقع کے خلاف نظام نے شمس الامراء کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تم درست کہتے ہو۔ ہم نے مرہٹوں کے متعلق اطمینان کے بغیر پیش قدمی کرنے میں غلطی کی ہے۔“

شمس الامراء نے شیر الملک کی طرف ایک فاختانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”حضور! میں شروع سے ہی اس پیش قدمی کے خلاف تھا۔ خدا معلوم اگر مرہٹوں کی فوری اعانت کے بھروسے پر بنگلور پر حملہ کر دیتے تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوتی؟“

تہوہ جنگ دوبارہ خیمے میں داخل ہوا اور اس نے نظام کے قریب پہنچ کر کہتے ہوئے کہا۔ ”ایچی، مدراس کے گورنر کی طرف سے کوئی اہم پیغام لایا ہے اور وہ اسی وقت ترمبوسی کی اجازت چاہتا ہے۔“

بہت اچھا۔ یہ عمل برخواست ہوتی ہے۔ بلاؤ اسے۔

نظام کے اشارے سے وقاصیں اور سازدے خیمے کے دوسرے دوازے سے نکل کر ساتھ والے خیمے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک انگریز انفرخیمے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی طریقے سے سلام کرنے کے بعد ایک تھیلا جو اس کی کمرے تک رہا تھا، کھولا اور ایک مراسلہ نکال کر نظام کو پیش کر دیا۔ نظام نے مراسلہ پڑھ کر شیر المک کو دے دیا۔

انگریز افسر نے کہا: یورڈائیں مجھے کرنل اسمتھ کا حکم ہے کہ میں کسی تاخیر کے بغیر اس خط کا جواب لے کر پیچ جاؤں۔

نظام نے جواب دیا: ہم کرنل اسمتھ کو کچھ چکے ہیں کہ مرہٹوں کی طرف سے اطمینان کے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

انگریز افسر نے کہا: ہنریکسینی گورنر اس اس مکتوب میں آپ کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ مرہٹے، سرنگا پم کی طرف آپ کی پیشقدمی کی اطلاع پاتے ہی میدان میں آجائیں گے۔ ان کی فوج کا ایک حصہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا اور دوسرا ملیار میں ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔

نظام نے کہا: لیکن اگر بادش کا یہی حال رہا تو آپ کی کوئی تجویز ہمارے لیے قابل عمل نہیں ہوگی۔ ایسا موسم صرف حیدر علی کی پٹارہ فوج کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اب تک ہم نے اسلو، بارود اور رسد کا جو سامان یہاں جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں اس میں سے نصف دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے، اس وقت ہماری جتنی فوج اس پڑاؤ میں ہے قریباً اتنی ہی رسد و ملک کے راستوں میں پہرہ دے رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رسد و ملک کا کوئی دوسرے صحیح سلامت یہاں نہیں پہنچا۔ اگر مرہٹے معاہدے کے مطابق ہمارا ساتھ دیتے تو ہمیں اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس پانی اور کچر میں

اگر پیشقدمی شروع کر دیں تو ہمیں دنوں کے سفر کے لیے ہفتے درکار ہوں۔ ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دشمن کے چھاپے مار دیتے ہوں گے۔

انگریز افسر نے کہا: معاف کیجیے آپ کو دشمن کی طاقت کے غلط اندازے نے پریشان کر دیا ہے۔ ہماری فوج ملیار کی طرف پیشقدمی شروع کر چکی ہے اور بادش دہاں بھی ہو رہی ہے لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موسم کی خرابی کے باعث ہماری اور ہمارے دشمن کی مشکلات ایک جیسی ہیں۔

نظام نے جواب دیا: ملیار کے ساحل علاقے پر آپ کا سلاط آپ کا بحری بیڑہ ہے لیکن مجھے یہاں سبیل گاڑیوں سے کام لینا پڑے گا۔

تو میں آپ کی طرف سے کیا جواب لے جاؤں؟

مدراس کے گورنر کے لیے ہمارا سلاط جواب کافی ہے۔

لیکن اس خط میں گورنر نے یہ لکھا ہے کہ آپ کرنل اسمتھ کو اپنے ارادے سے

باخبر کر دیں۔

کرنل اسمتھ کو ہمارا جواب ایک ہفتہ تک پہنچ جائے گا۔

انگریز افسر نے جواب دیا: مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل آپ کی خدمت میں ہماری

طرف سے ایسے لوگوں کا دندائے گا جو آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر

سکیں گے۔

اگر کوئی دندمرہٹوں کی نیک نیتی کے متعلق مجھے یقین دلا سکا تو مجھے اپنی رائے

بدلتے ہوئے خوشی محسوس ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ دندمیرے پاس آنے کی تکلیف کرنے

سے پہلے مرہٹوں کے ساتھ بات چیت کر آئے۔

انگریز افسر نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملیار میں ہماری کامیابیوں کی اطلاعات

سننے کے بعد آپ مرہٹوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کریں۔



• عالیجاہ ! وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں اسی وقت حضور کے ساتھ بات نہ کر سکا تو مکمل شام تک اس پڑاؤ کا صفایا ہو جائے گا۔“

سپہ سالار تہود خاں نے اٹھ کر اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”وہ کوئی پاگل ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں۔“

نظام نے کہا: ”نہیں شہر والے اندر ملاؤ!“

افسر باہر نکل گیا اور چند آنے لے کر معظّم علی کیچڑ اور پانی سے لت پت نظام کے نیچے میں داخل ہوا۔ اس نے ”اسلام علیکم“ کہہ کر مجلس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”اس بے وقت مداخلت کے لیے میری معذرت قبول فرمائیے لیکن میرے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری تھا۔“

مشیر الملک نے کہا: ”حیدر علی نے اپنے ایلچیوں کو معذرت پیش کرنے کے جو طریقے سکھائے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

معظّم علی نے جواب دیا: ”حیدر علی کے چچی کو آپ کے آداب سکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے یہ پیغام دیتے آیا ہوں کہ اگر آپ مرہٹوں کی اعانت کے بھروسے پر یہاں آئے ہیں تو وہ اس جگہ میں حصہ نہیں لیں گے۔ انھوں نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے۔“

مشیر الملک نے کہا: ”حیدر علی کی گیدڑ بھیجیاں ہمیں متاثر نہیں کر سکتیں۔ اگر مرہٹوں کی علیحدگی کی خبر درست ہو تو بھی ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

معظّم علی نے جواب دیا: ”لیکن یہ بات آپ کو یقیناً متاثر کرے گی کہ اس وقت آپ ہمارے مکمل محاصرے میں ہیں۔ کل تک آپ کا یہ پڑاؤ چاروں طرف سے ہماری توپوں کی زد میں ہوگا۔ مجھے حیدر علی نے آپ کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے، بلکہ میں ان کی طرف سے دہشت کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ حیدر علی کے اس اقدام کو آپ کمزوری یا بزدلی سے تعبیر نہ کریں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ میں اس تک

نظام نے ایک سکرابہٹ کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا: ”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

انگریز افسر سلام کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد رقص و سرود کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ جب بیٹھنے والے شراب پرتی اور ایک لٹری میر نظام علی کے جام میں شراب ڈال رہی تھی، نیچے سے باہر سپاہیوں کا شور مچا دیا۔ حاضرین مجلس جواب طلب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نظام نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور طلبے اور سارنگی کی صدائیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ رقاصائیں تذبذب کی حالت میں کھڑی تھیں۔ ایک فوجی افسر نیچے میں داخل ہوا اور اس نے کورٹن بجالانے کے بعد کہا: ”عالیجاہ ایک آدمی اسی وقت قدم بلوسی کی اجازت چاہتا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ نظام نے جھنجھلا کر کہا۔

• عالیجاہ وہ کہتا ہے کہ میں حیدر کا ایلچی ہوں۔“

مشیر الملک نے کہا: ”تم نے اسے پڑاؤ سے باہر کیوں نہیں روکا؟ وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟“

• جناب وہ سرپٹ آ رہا تھا اور اس نے پہرہ داروں کی کوشش کے باوجود اپنا گھوڑا نہیں روکا۔“

مشیر الملک نے کہا: ”جاؤ اسے قید میں رکھو!“

افسر نے کہا: ”لیکن حضور اس نے دھمکی دی ہے۔“

”کیا دھمکی دی ہے اس نے؟“

• حضور اگر آپ کا حکم ہو تو اس کی زبان کھینچ لی جائے۔“

نظام نے تھک کر کہا: ”بیوقوف! پہلے یہ بتاؤ وہ کتنا کیا ہے؟“

انہیں مستقبل عزیز ہے، ہم یہ نہیں چاہتے کہ انہیں والی نسلیں ہماری غلطیوں کی سزا بھگتیں  
 ہمیں آپ کی فوجی طاقت کا اعتراف ہے لیکن کاش آپ یہ وقت ہندوستان کی عزت اور  
 آزادی کے دشمنوں کی سزائی کے لئے کام میں لاسکتے۔ اگر آپ قوم کے یہ سنا سنیں تو  
 حیدر علی آپ کی قیادت میں اس ملک کے دشمنوں کے ساتھ بڑا اپنے لیے باعثِ افتخار  
 سمجھیں گے۔ میں آپ کو انگریزوں کے خلاف اتحاد کی دعوت دینے آیا ہوں لیکن اگر آپ  
 انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کتراتے ہیں تو میری طرح ان کے ہوجائیں اور ان  
 دن سے اپنے دشمنوں کے ساتھ اپنے لیے کام کریں۔ اب اس کا نام نہیں  
 دیکھنا کہ نظام نے کیا کیا۔ اگر ہم انگریزوں کا ساتھ چھوڑنا پسند کریں تو کیا ہوتا ہے  
 معظملی نے جواب دیا تو پھر ہمیں انہوں ہوگا۔ ہمیں اس بات کا انہوں ہو  
 گا کہ ہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکیں۔ ہمیں آپ  
 کے اس لشکر کی تباہی کا انہوں ہوگا جو اس وقت بھی صرے کی حالت میں ہے۔ ہم نے میدان  
 سے نکل چکے ہیں اور انگریزوں کا پیچھا چھوڑ کر آپ کی مدد کے لئے نہیں آسکتے۔ یہ  
 ہو چکا ہے کہ آپ کے آپ کتنی دیر ہمارے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور پستی کی حالت  
 میں آپ کو کس تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حیدر علی کو اس تباہی کا انہوں ہوگا لیکن مستقبل  
 کے مورخ اسے تصور دلائیں گے۔ انہوں گے کہ یہ ایک بڑا نقصان ہے۔  
 نظام نے کیا کیا، ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم حیدر علی کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہو  
 جائیں گے۔ ان کے لئے یہ بات اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اب اس کا نام نہیں  
 دیکھنا کہ یہ دھمکی انہیں آپ کے سوال کا یہ تھا سادہ جواب ہے لیکن آپ اگر اسے چھٹی  
 سمجھتے ہیں تو اپنے کسی بھلا زادے کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔ میں اسے ہر  
 بجائی کی سیر کرانے کے لئے تیار ہوں۔ پھر وہ آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی فوج کے لئے کچھ  
 نکلنے کے امکانات کیا ہیں۔ حیدر علی اپنی نیکی کا اس سے رٹا بٹا اور کیا دے سکتے

میں کہ انہوں نے اپنے ولیعہد شہزادہ فتح علی شیو کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔  
 میرے نظام علی خاں نے حیران ہو کر سوال کیا: شہزادہ فتح علی شیو کہاں ہیں؟  
 انہوں نے یہاں سے آٹھ گھنٹوں کے فاصلے پر میری دایہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ  
 مصالحت پر آمادہ ہیں تو وہ کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے لیکن اگر میری معرکہ  
 آپ کو مضر نہ کر سکیں تو بھی وہ کل یہاں حاضر ہو سچ جائیں۔ میں آپ کو اس وقت  
 بھی یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ وہ اسے آپ کی رسید اور ملک کے راستے بند ہو چکے  
 انہیں آج آپ کے سامان رسید کی ہرج بھجائی کا ریاں آج ہی تھیں وہ اس وقت یہاں ہے جتنے  
 میں ہیں اور سب انہوں کا جو دستہ ان کے ساتھ بھاری قیدیوں کے ساتھ اس راستے کے  
 افسر کا نام صلیب خان ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ آپ کی خدمت میں آج ہی آئے۔ انہوں نے  
 محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سنا چھایا۔ نظام نے اس کے بعد میرے اپنے وزیروں  
 اور افسروں کی طرف دیکھا اور معظملی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ہم شہزادہ شیو کے ساتھ  
 مصالحت کر گئے ہیں۔ اس کے لئے بتایا میں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم  
 جہان سے کوئی حرکت کریں تو یہ شیو کی فوج ہمارا قلعہ نہیں کرے گی؟  
 انہوں نے شہزادہ شیو کے الفاظ سے بڑی ضمانت اور کیا دے سکتا ہے اور اگر آپ  
 کو نقصان پہنچا، یہی مطلب ہوا تو ہمارے لئے یہ ستر میں موقع تھا کہ ہم اس کے لئے  
 اس کے میرے نظام علی نے کیا کیا۔ ہم شہزادہ شیو کو ہماری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو  
 کہ ہم مصالحت کی گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اب اس کا نام نہیں دیکھنا کہ  
 اسے ہمیں الامار نے کیا کیا۔ عالی جاہ اگر اجازت دے گا تو میں ان کے ساتھ جانا  
 چاہتا ہوں۔ اب اس کا نام نہیں دیکھنا کہ یہ ستر میں موقع تھا کہ ہم اس کے لئے  
 ہاں آپ کو اجازت ہے۔  
 حیدر علی نے وزیر معظملی اور شمس الامار بھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادہ شیو کی قیام گاہ



پر حملہ کر دیا۔ عہد نامہ مدراس کی رو سے انگریزوں پر حیدر علی کی مدد فرض تھی لیکن انھوں نے مرہٹوں کے خلاف حیدر علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز مرہٹوں کی فتح کی امید پر میسور کی بندر بانٹ میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔ حیدر علی تقریباً اڑھائی سال مختلف محاذوں پر مرہٹوں کی مڑی دل افواج سے برسرِ پیکار رہا۔ اس عرصہ میں اس کے سرحدی علاقے تباہ ہو چکے تھے۔ مرہٹے شدید نقصانات اٹھانے کے باوجود تازہ دم افواج میدان میں لا رہے تھے۔ جولائی ۱۷۸۲ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کی پیش قدمی کو شراٹپور صلع کر لی لیکن انگریز افروں کی بدعہدی اور مرہٹوں کی جارحیت نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ میسور کی آزادی کے دشمن اسے زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

جنگ سے فارغ ہوتے ہی معظم علی نے اکبر خاں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حیدر علی کی فوج میں روہیلکھنڈ کے چند نوجوان ملازم تھے اور جنگ کے بعد ان میں سے بعض چھٹی پر جا رہے تھے۔ معظم علی نے ایک طویل خط لکھا اور ان میں سے ایک نوجوان کے حوالے کر دیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:-

”عزیز بھائی! تمہارے آخری خط کا جواب شاید ابھی تک میرے ذمے ہے۔ میں پچھلے چند برس بے حد مصروف رہا ہوں۔ تاہم مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے متعلق اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے لیکن تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں۔ گزشتہ دس سال میں زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں تمہاری یاد سے غافل تھا۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ انگریزوں اور اس کے بعد مرہٹوں کے خلاف ہماری جنگ کا ایک دور ختم ہو چکا ہے۔ وہ تاریک بادل جو میسور

کا رخ کر رہے تھے۔

اگلے دن نظام کے کیمپ میں شہزادہ فتح علی ٹیپو کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تیسرے دن سرنگاپٹم میں اس خبر پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ حیدر علی کے ہونہار بیٹے نے اپنی پہلی سیاسی مہم میں ایک شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور نظام کی افواج جیتا پٹنا سے واپس حیدرآباد کا رخ کر رہی ہیں۔

مرہٹوں اور نظام کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدر علی کی افواج آدھی اور طوفانی کی طرح انگریزوں پر ٹوٹ پڑیں۔ شہر سمک حیدر علی علیہار کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور انگریز ہر محاذ سے پسپا ہو کر مدراس میں پناہ لے رہے تھے۔ حیدر علی فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا مدراس کی طرف بڑھا۔ الیٹ انڈیا کمپنی کے ایوان پر لڑ لڑھاری ہو چکا تھا۔ انگریز صلع کے طالب ہوئے۔

شیر میسور نے جواب دیا: ”صلح کی بات چیت اب مدراس میں ہوگی۔ مدراس سے پانچ میل دور حیدر علی نے صلح کی شرائط پیش کیں اور انگریزوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

انگریز حیدر علی کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر وہ چاہتا تو مدراس کے قلعے پر قبضہ کرنا اس کے لیے چند گھنٹوں کی بات تھی۔ مورخ اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتے کہ صلح نامہ مدراس کے اصلی محرکات کیا تھے۔ یہ اس فاتح کی بلند وصلگی اور عالی ظرفی تھی جس کے نزدیک گرے ہوئے دشمن پر ہاتھ اٹھانا باعثِ عار تھا یا حیدر علی کو پیچھے سے نظام اور مرہٹوں کے حملے کا خطرہ تھا! بہر حال جب اس صلح کے عملی نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک بڑے آدمی کی غلطی تھی۔ الیٹ انڈیا کمپنی اس معاہدے کی شرائط کے نبھانے کے متعلق اس وقت بھی نیک نیت نہ تھی جب مدراس کا گورنر اس معاہدے پر دستخط کر رہا تھا۔

اٹھ ماہ بعد مرہٹوں نے ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ دریائے تنگبھدرا عبور کر کے میسور

[illegible]

کہ سبھی خط لکھ کر آہوں۔ تمھارے لئے بڑے بھیجتے، صدیق علی خان کو مہر لکھے  
 ۱۰ من سنا ہے بڑے جنگی بہادر کا کپتان بننے کا مشوق کہنے اور میں نے اس  
 کی تربیت لکھے۔ یہ ابھی ہے ایک فرانسیسی، اتالیق مقرر کر دیا ہے۔  
 ۱۱ من سنا ہے اور اور اکثر یہ لکھا کرتے ہیں کہ ہم بڑے ہو کر اپنے چچا ابراہیم  
 کے پاس نہیں جائیں گے اور وہاں نہیں رہا کریں گے۔ تمھارے منہ سے بڑے چھوٹے  
 ۱۲ من سنا ہے کہ ہم راولپنڈی کے اور وہاں کے ہمیں دو سال کا بھائی ہے گا حضرت  
 ۱۳ من کی والدہ پچھلے سال وفات پا گئی تھیں۔ تمہارا بڑا اور دلاور تھا ابھی تک  
 ۱۴ من میرے لئے تھا، بہن اور بھین بہت یاد کرتے ہیں اب اگر کبھی فرصت پڑے  
 ۱۵ من بڑا چھوٹا ہے، اب اسے شریک پٹم اور اجاڑے تھیں اب کیسے کہ بہت اچھی جانتا ہے  
 ۱۶ من اور تمھاری بھائی بھین کو بہت یاد کرتی ہیں۔ بیٹوں کی یہ حالت ہے کہ  
 ۱۷ من چاہتے ہیں کہ کوئی ہسپتال کی فوج کے کسی جوان کی بہادری کا ذکر کرتا ہے  
 ۱۸ من وہ بڑے فرحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ تم نے ہمنا چچا ابراہیم نہیں دیکھا تھا  
 ۱۹ من معلوم صاحب بڑے تھیں تمھارے متعلق کبھی فرضی داستانیں سنا چکا ہے کہ وہ  
 ۲۰ من تمہیں اس دور کا شرف ہے زیادہ شہرور اور بہادر آدمی سمجھتے ہیں اب اگر ممکن  
 ۲۱ من ہو تو ضرور اپنے کی کوشش کر دو ۱۹۰۱ء چھپو ۱۹۰۲ء ۱۹۰۳ء  
 ۲۲ من ۱۹۰۴ء ۱۹۰۵ء ۱۹۰۶ء ۱۹۰۷ء ۱۹۰۸ء ۱۹۰۹ء ۱۹۱۰ء ۱۹۱۱ء ۱۹۱۲ء ۱۹۱۳ء ۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء ۱۹۱۶ء ۱۹۱۷ء ۱۹۱۸ء ۱۹۱۹ء ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء ۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء ۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء ۱۹۲۷ء ۱۹۲۸ء ۱۹۲۹ء ۱۹۳۰ء ۱۹۳۱ء ۱۹۳۲ء ۱۹۳۳ء ۱۹۳۴ء ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء ۱۹۳۷ء ۱۹۳۸ء ۱۹۳۹ء ۱۹۴۰ء ۱۹۴۱ء ۱۹۴۲ء ۱۹۴۳ء ۱۹۴۴ء ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء ۱۹۴۷ء ۱۹۴۸ء ۱۹۴۹ء ۱۹۵۰ء ۱۹۵۱ء ۱۹۵۲ء ۱۹۵۳ء ۱۹۵۴ء ۱۹۵۵ء ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء ۱۹۵۸ء ۱۹۵۹ء ۱۹۶۰ء ۱۹۶۱ء ۱۹۶۲ء ۱۹۶۳ء ۱۹۶۴ء ۱۹۶۵ء ۱۹۶۶ء ۱۹۶۷ء ۱۹۶۸ء ۱۹۶۹ء ۱۹۷۰ء ۱۹۷۱ء ۱۹۷۲ء ۱۹۷۳ء ۱۹۷۴ء ۱۹۷۵ء ۱۹۷۶ء ۱۹۷۷ء ۱۹۷۸ء ۱۹۷۹ء ۱۹۸۰ء ۱۹۸۱ء ۱۹۸۲ء ۱۹۸۳ء ۱۹۸۴ء ۱۹۸۵ء ۱۹۸۶ء ۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء ۱۹۸۹ء ۱۹۹۰ء ۱۹۹۱ء ۱۹۹۲ء ۱۹۹۳ء ۱۹۹۴ء ۱۹۹۵ء ۱۹۹۶ء ۱۹۹۷ء ۱۹۹۸ء ۱۹۹۹ء ۲۰۰۰ء ۲۰۰۱ء ۲۰۰۲ء ۲۰۰۳ء ۲۰۰۴ء ۲۰۰۵ء ۲۰۰۶ء ۲۰۰۷ء ۲۰۰۸ء ۲۰۰۹ء ۲۰۱۰ء ۲۰۱۱ء ۲۰۱۲ء ۲۰۱۳ء ۲۰۱۴ء ۲۰۱۵ء ۲۰۱۶ء ۲۰۱۷ء ۲۰۱۸ء ۲۰۱۹ء ۲۰۲۰ء ۲۰۲۱ء ۲۰۲۲ء ۲۰۲۳ء ۲۰۲۴ء ۲۰۲۵ء ۲۰۲۶ء ۲۰۲۷ء ۲۰۲۸ء ۲۰۲۹ء ۲۰۳۰ء ۲۰۳۱ء ۲۰۳۲ء ۲۰۳۳ء ۲۰۳۴ء ۲۰۳۵ء ۲۰۳۶ء ۲۰۳۷ء ۲۰۳۸ء ۲۰۳۹ء ۲۰۴۰ء ۲۰۴۱ء ۲۰۴۲ء ۲۰۴۳ء ۲۰۴۴ء ۲۰۴۵ء ۲۰۴۶ء ۲۰۴۷ء ۲۰۴۸ء ۲۰۴۹ء ۲۰۵۰ء ۲۰۵۱ء ۲۰۵۲ء ۲۰۵۳ء ۲۰۵۴ء ۲۰۵۵ء ۲۰۵۶ء ۲۰۵۷ء ۲۰۵۸ء ۲۰۵۹ء ۲۰۶۰ء ۲۰۶۱ء ۲۰۶۲ء ۲۰۶۳ء ۲۰۶۴ء ۲۰۶۵ء ۲۰۶۶ء ۲۰۶۷ء ۲۰۶۸ء ۲۰۶۹ء ۲۰۷۰ء ۲۰۷۱ء ۲۰۷۲ء ۲۰۷۳ء ۲۰۷۴ء ۲۰۷۵ء ۲۰۷۶ء ۲۰۷۷ء ۲۰۷۸ء ۲۰۷۹ء ۲۰۸۰ء ۲۰۸۱ء ۲۰۸۲ء ۲۰۸۳ء ۲۰۸۴ء ۲۰۸۵ء ۲۰۸۶ء ۲۰۸۷ء ۲۰۸۸ء ۲۰۸۹ء ۲۰۹۰ء ۲۰۹۱ء ۲۰۹۲ء ۲۰۹۳ء ۲۰۹۴ء ۲۰۹۵ء ۲۰۹۶ء ۲۰۹۷ء ۲۰۹۸ء ۲۰۹۹ء ۲۱۰۰ء ۲۱۰۱ء ۲۱۰۲ء ۲۱۰۳ء ۲۱۰۴ء ۲۱۰۵ء ۲۱۰۶ء ۲۱۰۷ء ۲۱۰۸ء ۲۱۰۹ء ۲۱۱۰ء ۲۱۱۱ء ۲۱۱۲ء ۲۱۱۳ء ۲۱۱۴ء ۲۱۱۵ء ۲۱۱۶ء ۲۱۱۷ء ۲۱۱۸ء ۲۱۱۹ء ۲۱۲۰ء ۲۱۲۱ء ۲۱۲۲ء ۲۱۲۳ء ۲۱۲۴ء ۲۱۲۵ء ۲۱۲۶ء ۲۱۲۷ء ۲۱۲۸ء ۲۱۲۹ء ۲۱۳۰ء ۲۱۳۱ء ۲۱۳۲ء ۲۱۳۳ء ۲۱۳۴ء ۲۱۳۵ء ۲۱۳۶ء ۲۱۳۷ء ۲۱۳۸ء ۲۱۳۹ء ۲۱۴۰ء ۲۱۴۱ء ۲۱۴۲ء ۲۱۴۳ء ۲۱۴۴ء ۲۱۴۵ء ۲۱۴۶ء ۲۱۴۷ء ۲۱۴۸ء ۲۱۴۹ء ۲۱۵۰ء ۲۱۵۱ء ۲۱۵۲ء ۲۱۵۳ء ۲۱۵۴ء ۲۱۵۵ء ۲۱۵۶ء ۲۱۵۷ء ۲۱۵۸ء ۲۱۵۹ء ۲۱۶۰ء ۲۱۶۱ء ۲۱۶۲ء ۲۱۶۳ء ۲۱۶۴ء ۲۱۶۵ء ۲۱۶۶ء ۲۱۶۷ء ۲۱۶۸ء ۲۱۶۹ء ۲۱۷۰ء ۲۱۷۱ء ۲۱۷۲ء ۲۱۷۳ء ۲۱۷۴ء ۲۱۷۵ء ۲۱۷۶ء ۲۱۷۷ء ۲۱۷۸ء ۲۱۷۹ء ۲۱۸۰ء ۲۱۸۱ء ۲۱۸۲ء ۲۱۸۳ء ۲۱۸۴ء ۲۱۸۵ء ۲۱۸۶ء ۲۱۸۷ء ۲۱۸۸ء ۲۱۸۹ء ۲۱۹۰ء ۲۱۹۱ء ۲۱۹۲ء ۲۱۹۳ء ۲۱۹۴ء ۲۱۹۵ء ۲۱۹۶ء ۲۱۹۷ء ۲۱۹۸ء ۲۱۹۹ء ۲۲۰۰ء ۲۲۰۱ء ۲۲۰۲ء ۲۲۰۳ء ۲۲۰۴ء ۲۲۰۵ء ۲۲۰۶ء ۲۲۰۷ء ۲۲۰۸ء ۲۲۰۹ء ۲۲۱۰ء ۲۲۱۱ء ۲۲۱۲ء ۲۲۱۳ء ۲۲۱۴ء ۲۲۱۵ء ۲۲۱۶ء ۲۲۱۷ء ۲۲۱۸ء ۲۲۱۹ء ۲۲۲۰ء ۲۲۲۱ء ۲۲۲۲ء ۲۲۲۳ء ۲۲۲۴ء ۲۲۲۵ء ۲۲۲۶ء ۲۲۲۷ء ۲۲۲۸ء ۲۲۲۹ء ۲۲۳۰ء ۲۲۳۱ء ۲۲۳۲ء ۲۲۳۳ء ۲۲۳۴ء ۲۲۳۵ء ۲۲۳۶ء ۲۲۳۷ء ۲۲۳۸ء ۲۲۳۹ء ۲۲۴۰ء ۲۲۴۱ء ۲۲۴۲ء ۲۲۴۳ء ۲۲۴۴ء ۲۲۴۵ء ۲۲۴۶ء ۲۲۴۷ء ۲۲۴۸ء ۲۲۴۹ء ۲۲۵۰ء ۲۲۵۱ء ۲۲۵۲ء

سے ہو کر آپ کے پاس آئیں گے :

بھائی جان ! میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں اور نماز کے بعد میری پہلی دعا آپ کے لیے ہوتی ہے۔ میرا بڑا لڑکا داؤد خاں نوسلا کی عمر میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی شہباز خاں چوتھے سال میں ہے۔ پچھلے سال ہمیں خدا نے ایک لڑکی عطا کی ہے، بقیوں نے اس کا نام تمزیز رکھا ہے۔ بقیوں آپ کو اور بھائی جان کو سلام کہتی ہے چہ

آپ کا بھائی اکبر



معظم علی کو سرنگا ٹیم کی فوجی تربیت گاہ کے ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چند مہینے گزرے تھے کہ پوتا میں سرہٹوں کے پیشوا مادھوراؤ کے انتقال اور اس کی جانشینی کے دعویداروں کے درمیان خلفشار کی اطلاع ملی۔ حیدر علی کے دل پر سرہٹوں کے دھم ابھی تازہ تھے۔ اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور میسور کے چھپنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے چڑھائی کر دی۔ شہزادہ ٹیپو آؤدہ کار انسروں اور سپاہیوں کی ایک فوج لے کر سرہٹ کی طرف بڑھا اور اس نے تین ماہ کے اندر اندر سرہٹ کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سرہٹ ابھی سنبھلنے نہ پاتے تھے کہ اس نے مددگاروں اور گرم کٹہ پر لیٹا کر دی۔ اس عرصہ میں حیدر علی ہو سکوت کا محاصرہ کر چکا تھا۔

ایک دن معظم علی سرہٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ہو سکوت کے باہر میسور کی فوج کے کیپ میں داخل ہوا۔ وہ گھوڑے سے اترتے ہی حیدر علی کے خیمے کی طرف بڑھا جاتا دسے کے سالار نے اسے دیکھ کر سلام کرنے کے بعد کہا۔ آپ کا صبح سے انتظار ہو رہا ہے۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔" انسر خیمے کے اندر داخل ہوا اور چند مہینے بعد اس

سال انھوں نے ہمارے دو گادیں جلا کر رکھ کر دیئے تھے۔ اس کے بعد میں نے پڑوس کے سرداروں کی مدد سے ان کا تعاقب کیا اور سرحد کے قریب تین سو لٹروں کے ایک گروہ کا صفایا کر ڈالا۔ اس کے بعد ہمارے علاقے پر کوئی حملہ نہیں ہوا لیکن روسیکھنڈ کو ہمیشہ سرہٹوں کی لیٹاؤ کا خطرہ رہتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں ہم کافی منظم ہو چکے ہیں لیکن ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہم تنہا کسی بیرونی طاقت کے ساتھ ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم دلی کے حالات سے مایوس ہو چکے ہیں پچھلے دنوں حافظ رحمت خاں نے نواب درباراؤدہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے سرہٹوں کے حملہ کی صورت میں اودھ کی افواج ہماری مدد کریں گی لیکن کاش ہم نواب درباراؤدہ پر اعتماد کر سکتے۔ میسور کے متعلق سوچتے ہوئے بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو جیسے رہنما شمالی ہندوستان میں پیدا ہوتے۔

شیر علی جج کے بعد مدینہ شریف میں آباد ہو گئے ہیں۔ اپنے ایک ساتھی کی معرفت انھوں نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ جج پر جانے سے پہلے وہ اپنا تجارتی کاروبار ختم کر چکے تھے۔ مکان فروخت کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ وہ باقی زندگی بڑے آرام سے گزار سکیں۔

پچھلے سال بقیوں کی والدہ حیدر آباد سے عطیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔ چند ماہ بعد ہمیں شیخ فخر الدین کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ دیں یروانات پاگئی ہیں۔ بقیوں چند دنوں کے لیے اپنی بہن کے پاس جانے مرے۔ اگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت دی تو ہم دونوں

میں نے اپنے تمامہ فوج و خزانہ و تمام اوروں پر مشتمل تھی جس کو فوج کا نام اور عثمان کی رسد اور  
 زمین کے روائے کے ذکر کرنا اور احکامات کے ذکر کرنے سے اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا تھا۔  
 اگلے کے وقت یہ فوج البرون کا نام دینے لگی اور عثمان کے غلبہ کی صورت میں اس نے  
 عمرو یا چھاپہ کا نام لیتا جاتا تھا۔ یہ جیسے کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ اس نے

تم بڑا ہیکلہند میں حافظ رحمت خاں کے پاس جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ساتھ دے کے بعد دلی کے بے بس امرا بھی جاگ اٹھیں گے اور نظام بھی یہ محسوس کرے گا کہ غیر خاندان اس کے بانیے سود مند نہیں ہوگی۔ مرہٹوں سے بچنے کے بعد ہم چند مفتوں میں انگریزوں کو سمندر کی طرف دھکیں سکیں گے۔ تم نواب اودھ کو یہ سمجھاؤ کہ اس وقت اودھ اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگ میسور میں لڑی جا رہی ہے۔ مرزا گاہم میں بھی تمہاری خطرات کی ضرورت تھی لیکن کام زیادہ اہم ہے۔ دلی کے راجہ کے ساتھ ساتھ دلی کے حکم علی نے کہا۔ مجھے اس کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ آپ اپنے اپنے کام میں مشغول رہیں۔ تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں آج شام تک نواب شجاع الملک اور حافظ رحمت خاں کے نام خطوط لکھوا کر تمہارے حوالہ کر دوں گا لیکن تمہیں بہت حیلہ دے کر کام لینا ہوگا۔ جب تک ہمارے مابین تعاون کا کوئی معاہدہ طے نہیں پا جاتا اس وقت تک ہمارے ارادوں کی کسی کو خبر نہیں ہوتی چاہیے شراذہ شیو تمہیں کھنڈہ مکمل پہنچانے کا دستور کر دیں گے۔

اگلے دن معظم علی علی انصباح پانچ سو ارادوں کے ہمراہ کھنڈہ کا رخ کر رہا تھا۔

نواب وزیر اودھ اپنے محل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بیٹا آصف اللہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ اباجان یہ وہی معظم علی ہے جو سو بارہ سال قبل یہاں تجارت کرتا تھا اور جس نے پانی پت کی جنگ میں بھی کافی شہرت حاصل کی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس وقت آپ ملاقات نہیں کر سکتے لیکن وہ مقرر ہے اور کماتا ہے کہ میں میسور سے جلد علی اکبر کا اہم پیغام لے کر آیا ہوں اور میری ملاقات کا اودھ کے مستقبل سے گرا فتن ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اسے بلا دوں، ممکن ہے کوئی انہم

کر چکے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔ اگر دسیع علاقے سے آپ کی مراد روہیکھنڈ ہے تو وہ دن دو نہیں جب اودھ کا ہر بچہ بوڑھا آپ کے اس فیصلے کی خدمت کرے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ روہیکھنڈ آپ کی مملکت کا حصہ بننے کی بجائے ان بیٹریوں کی شکار گاہ بن جائے گا جس کے ہاتھ پلاسی اور کسری جگ کے شہیدوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے روہیکھنڈ کو تباہی سے بچائیے ورنہ شرافت اور انسانیت کے یہ دشمن کسی دن دلی اور اودھ پر چڑھ دوں گے۔

شجاع الدولہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ حافظہ رحمت خاں نے ہمارے ساتھ بدعہدی کی ہے؟ اس نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ اگر ہم مرہٹوں کے خلاف اسے مدد دیں گے تو وہ اس کے عوض ہمیں چالیس لاکھ روپے ادا کرے گا۔ گذشتہ سال جب مرہٹوں نے روہیکھنڈ پر حملہ کیا تھا تو ہم نے معاہدے کے مطابق رحمت خاں کی اعانت کے لیے فوج بھیجی تھی لیکن مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ ہمیں چالیس لاکھ روپے ادا کرنے کے وعدے سے منحرف ہو گیا ہے۔

معظم علی نے کہا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ حافظہ رحمت خاں نے جگ کی صورت میں یہ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مرہٹے جگ کیے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ میری اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیکھنڈ کو یہ رقم ضرور ادا کرنی چاہیے تو اس کے لیے روہیکھنڈ پر چڑھائی کرنا کسی صورت میں سب نہیں۔ خدا کے لیے اپنی افواج کو روکیے اور روہیلوں کو انگریزوں کے ساتھ پٹنہ دیجیے۔ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو چالیس لاکھ روپے ادا کر دیا جائے گا۔ میں حافظہ رحمت خاں کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ چالیس روپے کے بدلے آپ سے لڑائی مول لینا گوارا نہیں کریں گے۔ اگر مجھے وہاں سے واپس جانا پڑے تو میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے

بات ہو۔ سپاہی اسے عاقبت کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے پہلے یہ تسلی کر چکے ہیں کہ وہ صلح نہیں ہے۔  
نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ اگر یہ دہی معظم علی ہے تو ہم اس سے ضرور ملیں گے اسے بلاؤ۔

آصف الدولہ کمرے سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی کے سلام کے جواب میں شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مصدقہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن معظم علی نے اس کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آصف الدولہ نے اپنے باپ کے قریب بیٹھے ہوئے منہ کے سامنے خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "تشریف رکھیے۔ لیکن اس نے کہا۔ میں بیٹھ کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے انوس ہے کہ میں نے بے وقت آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے صرف چند منٹ درکار ہیں۔ میں نے کھنڈ پتختے ہی ایک دھشت ناک خبر سنی ہے کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر روہیکھنڈ پر چڑھائی کر دی ہے؟

شجاع الدولہ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔  
معظم علی نے کہا۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے میں دارن سینگن کے دیوار میں نہیں جا سکتا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اودھ کے مستقبل کے امین ہیں اور ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے اودھ کی رعایا اور اودھ کی حکومت کے ساتھ دلچسپی ہے۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ تو تمہیں اودھ کے مستقبل کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند دن تک تم یہ سوچو گے کہ ہم اودھ کی مملکت میں ایک وسیع علاقہ شامل





سے نکل گئے ہیں اور ان کا رخ روہیکھنڈ کی طرف تھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ان کے پیچھے  
سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا جائے گا!

شجاع الدولہ نے جواب دیا: "نہیں اب روہیکھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی  
پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ جنگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ میں صرف  
لکھنؤ میں ان کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ مگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً  
اسے گرفتار کر لیتا۔ اب اس کا راستہ رد کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔"